سیرت النبی ﷺ پر فکر انگیز خطابات کا مجموعہ

# سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مکتبہ خدّام القرآن لاہور

# سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

## سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر


## ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بانی تنظیمِ اسلامی


## کے پانچ خطبات کا مجموعہ


مرتب

محبوب الحق عاجز



شائع کردہ:

**مکتبہ خُدّامُ القرآن لاهور**

قرآن اکیڈمی، 36کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-35869501(042)

فیکس: 35834000(042) ای میل: maktaba@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرحوم و مغفور مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی تاحیات خواہش اور عمل کے عین مطابق' مرحوم کے قانونی جانشین تمام حضرات کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طبع شدہ تصنیفات / تالیفات' آڈیوز' ویڈیوز کو طبع / تیار کر کے' چاہے قیمتاً ہو یا مفت' تقسیم کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہیں ہے' البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ہم ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی مذموم کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ' غلط اقتباس' سیاق و سباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت و شہرت پر حرف آئے' تو ہم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق رکھتے ہیں۔


نام کتاب ———— سیرت خیر الانام ﷺ

طبع اول (اکتوبر 2013ء) ———— 1100

طبع دوم (فروری 2014ء) ———— 1100

طبع سوم (دسمبر 2014ء) ———— 1100

ناشر ———— ناظم نشر و اشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ———— 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 3-042-35869501

مطبع ———— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت ———— 180 روپے

ISBN : 978-969-606-027-7



email:publications@tanzeem.org
website:**www.tanzeem.org**

# فہرس


**خطبۂ اوّل** فلسفۂ دین میں نبوت و رسالت کا مقام 11

فلسفہ اور دین 12

فزیکل سائنسز اور قرآن کی ہم آہنگی 13

قرآنی میٹا فزکس 15

حیاتِ انسانی کے پانچ ادوار 18

دو موتوں کے درمیان زندگی 20

تخلیق کے دو مراحل 21

عالم امر اور عالم خلق میں بنیادی فرق 23

عالم خلق کی تخلیق کا نقطۂ کمال 23

زندگی ایک امتحانی وقفہ 24

اِنسان کی معنوی شخصیت کی تین سطحیں 25

معرکۂ خیر و شر 27

شیطان کو انسان پر اختیار نہیں 30

اَنبیاء کرام علیہم السلام کی بنیادی ذمہ داری 31

شہادت کے معنی 33

محاسبۂ اُخروی کی پانچ بنیادیں 34

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت: اتمامِ حجت 35

شہادت علی الناس: اُمت کا فرضِ منصبی 37

فرضِ منصبی سے غفلت کا انجام 39

صلیبی جنگ میں دشمنوں سے تعاون 40

| | | |
|---|---|---|
| | اسلامی نظام سے روگردانی | 41 |
| | تصویر کا روشن رُخ | 42 |
| **خطبۂ دوم** | **آنحضور ﷺ پر نبوت اور رسالت کی تکمیل** | 45 |
| | عقیدۂ ختم نبوت کے دو پہلو | 46 |
| | عقیدۂ ختم نبوت پر قرآنی دلائل | 47 |
| | عقیدۂ ختم نبوت احادیث کی رو سے | 50 |
| | ایک اہم نکتہ | 51 |
| | اتمام واکمال نبوت محمدیؐ | 53 |
| | نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت | 54 |
| | سیرت النبی ﷺ کا عمود | 56 |
| | تکمیل نبوت ورسالت کے مظاہر | 59 |
| | ☆تکمیل ہدایت | 60 |
| | ☆تکمیل دین | 63 |
| | ☆اظہارِ دین حق | 66 |
| | ☆کل نوعِ انسانی کی طرف بعثت | 69 |
| | خاتم النبیین ﷺ کا مشن اور اُمت کی ذمہ داری | 71 |
| | غلبۂ اسلام کی بشارت | 72 |
| | اُمتِ مسلمہ چوتھے اور پانچویں اَدوار کے درمیان | 74 |
| | سخت دن آنے والے ہیں | 77 |
| | پاکستان: خلافت کا نقطۂ آغاز | 78 |
| | غور طلب سوال | 79 |
| **خطبۂ سوم** | **انقلابِ نبوی کا مرحلۂ اوّل: جماعت سازی اور اس کا نبویؐ طریق** | 81 |
| | نبی اکرم ﷺ کو تحریکی رول دیا گیا | 83 |
| | انقلاب کا مفہوم | 85 |

تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب 86

انقلاب برپا کرنا کھیل نہیں 90

انقلابی عمل کے تین مراحل 92

انقلاب کا پہلا مرحلہ: جماعت سازی اور اس کا طریق 94

جماعت سازی کے لوازم 95

فرد کی تبدیلی کے لیے قرآن کا پروگرام 102

جماعت سازی کی مسنون بنیاد: بیعت 122

**خطبۂ چهارم** اسلامی انقلاب کے ضمن میں تصادم کے ابتدائی مراحل 127

ایمان کے ضمن میں ایک بہت بڑا مغالطہ 128

مبدأ و معاد کا علم 130

حیاتِ انسانی کی حقیقت 132

نبی اور رسول کے مابین نسبت 134

انقلابِ نبویؐ میں معجزوں کا عمل دخل نہیں! 140

انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج: چند وضاحتیں 145

تصادم کا آغاز انقلابی کرتے ہیں 150

باطل سے تصادم کا مرحلہ اوّل: صبرِ محض 156

صبرِ محض کی حکمت 165

**خطبۂ پنجم** سیرت النبیؐ میں باطل سے تصادم کے تکمیلی مراحل 169

تصادم کا مرحلۂ اوّل 170

حضور اکرم ﷺ کی اہلِ طائف کو دعوتِ اسلام 171

رسول اللہ ﷺ کی مکہ واپسی 175

اسلام کی کرنیں مدینہ منورہ میں 177

مدینۃ النبیؐ کا تاریخی پس منظر 177

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ ہجرت 181

| | |
|---|---|
| تصادم کا مرحلۂ ثانی: اقدام | 182 |
| چھاپہ مار مہمات اور ان کے مقاصد | 183 |
| تصادم کے آخری مرحلہ کے ضمن میں | |
| کفر و اسلام کا پہلا معرکہ: غزوۂ بدر | 186 |
| غزوۂ احد | 193 |
| غزوۂ احزاب | 200 |
| رسول اللہ ﷺ کی عمرہ کے لیے مکہ روانگی | 205 |
| معاہدۂ صلح حدیبیہ | 209 |
| یہود خیبر کی طاقت کا قلع قمع | 216 |
| عمرۂ قضا کی ادائی | 217 |
| فتح مکہ اور اس کا پس منظر | 218 |
| شرک کے قلع قمع کا آخری اقدام | 225 |
| بیرونِ عرب دعوتِ اسلام اور سلاطین کا ردّ عمل | 230 |
| غزوۂ تبوک | 234 |
| قیامِ خلافت کے ضمن میں غور طلب سوال | 237 |

❁❁❁

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرضِ مُرتّب

نحمدہٗ و نصلی علٰی رسولہ الکریم اما بعد!

سیرتِ نبویہ مطہرہؐ وہ ایمان افروز موضوع ہے، جس کے بیان کرنے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں اور مضامین لکھنے کا مبارک سلسلہ ابتدائے اسلام سے جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ یہ آپؐ کی شانِ ''رَفَعْنَالَكَ ذِكْرَكَ'' ہی کا ایک مظہر ہے۔ سیرت کیا ہے؟ آپؐ کے فرمودات عالیہ، روشن کردار اعلیٰ اخلاق، عظیم الشان مشن اور اُس کی تکمیل کے لئے کی گئی بے مثال جدوجہد کا دلنشین تذکرہ۔ سیرت اللہ کے پیغام کا عملی پرتو ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانی جمعیت کے سامنے پیش کیا اور جس کے ذریعے آپؐ قعرِ مذلت میں پڑے انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں اور بندوں کی غلامی سے رہائی دلا کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی غلامی میں لائے۔ بلاشبہ آپؐ محسن انسانیت ﷺ ہیں۔ آپؐ کی سب سے بڑی عطا اور دنیا پر باقی رہنے والا احسان شعور بندگی اور وحدت انسانی کے تصورات ہیں جو اس سے پہلے خواب وخیال بن چکے تھے۔ آپؐ نے صدیوں کی چھائی ہوئی تیرگی میں وحدت ربوبیت اور وحدت بشریت کا انقلابی اعلان فرمایا: ''اے لوگو، تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا مورث اعلیٰ بھی ایک ہے۔ خبردار کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو سُرخ (گورے) پر اور کسی سُرخ کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کی بنیاد پر''۔ آپؐ کی آمد سے پہلے انسانیت فسادِ عقیدہ اور فسادِ معاشرت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہیں دورِ وحشت چل رہا تھا تو کہیں شرک و بت پرستی کی لعنتوں نے مدنیت کا ستیاناس کر رکھا تھا۔ جنگ وجدل اور قتل وغارت کے قہرآلود ماحول میں انسان درندوں اور چوپایوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ آپؐ کے پیغام جانفزا کے عام اور غالب ہونے سے زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ صنم خانوں میں پڑے بت اوندھے منہ گر گئے، کلیاں چٹکنے لگیں، غم ٹھکانے لگے، آنسو تھم گئے، بے حسی نے اپنی راہ لی، احساس نے انگڑائی لی اور انسان کی انسانیت بیدار ہوگئی۔ یوں شعور بندگی اور شعور آدمیت سے آراستہ ایک بالکل نئے انسان اور نئے سماج نے جنم لیا، جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے۔

حضورؐ آئے تو سرِّ آفرینش پا گئی دنیا
اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آ گئی دنیا
بُجھے چہروں کا رنگ اُترا، ستے چہروں پہ نور آیا
حضورؐ آئے تو انسانوں کو جینے کا شعور آیا

آپؐ نے جو عظیم الشان انقلاب برپا کیا اُس کے لئے آپؐ نے تئیس سال تک جاں گسل جدوجہد فرمائی۔ اس دوران آپؐ کو کفارِ مکہ کی سختیوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ طائف کے اوباشوں کے ہاتھوں لہولہان ہوئے۔ مکہ سے مدینہ ہجرت پر مجبور ہوئے۔ کفار کے اکیلے یا متحدہ جتھوں سے معرکہ آرائی کی نوبت آئی۔ منافقین اور یہود کی خطرناک سازشوں کا مقابلہ اور قلع قمع کرنا پڑا، تاآنکہ مکہ فتح ہوا اور اسلامی انقلاب جزیرہ نمائے عرب کی حد تک تکمیل کو پہنچ گیا۔ ''جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا'' سیرت طیبہ ان تمام مراحلِ انقلاب اور اُن میں پیش آنے والی مشکلات و مصائب اور اُن میں آپؐ کے صبر و ثبات اور ثابت قدمی کا تذکرہ ہے۔ سیرت کا یہ واقعاتی پروگرام درحقیقت وہ لائحہ عمل ہے جس پر ہر دور کے مسلمانوں کو اپنے اخلاق و کردار کی تعمیر اور صالح معاشرہ کی تشکیل کرنی ہے۔ یہی وہ راہ انقلاب ہے جسے اختیار کر کے حیات اجتماعی کے بگاڑ کا خاتمہ کیا جا سکتا اور اسلامی انقلاب برپا کر کے ایک حقیقی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

''سیرت خیر الانام ﷺ'' کے نام سے زیرِ نظر کتاب بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم و مغفور کے سیرت طیبہ پر پانچ مفصل خطابات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ربیع الاوّل اور ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ (۲۰۱۰ء) کے دوران میں قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ارشاد فرمائے۔ ان خطابات کو کیسٹ سے اتار کر اور ترتیب و تسوید کے مراحل سے گزار کر قبل ازیں ہفت روزہ ندائے خلافت میں قسط وار شائع کیا گیا، اور اب افادۂ عام کے لیے کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر مدرس و مفسر قرآن تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیرت طیبہ بھی اُن کا خاص موضوع تھا۔ سیرت اور اُس کے متنوع گوشوں پر انہوں نے ملک اور بیرونِ ملک سینکڑوں فکر انگیز لیکچر دیئے۔ جن میں سے بعض کتابی صورت میں بھی شائع ہو کر منظر عام پر آئے، جیسے منہج انقلاب نبویؐ، عظمت مصطفیٰؐ، رسول کامل ﷺ، نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت، رسول انقلاب ﷺ کا طریق انقلاب، نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں، حبِ رسولؐ

اور اُس کے تقاضے اور اسوۂ رسولؐ ۔لیکن اس مجموعہ میں شامل خطابات تین اعتبارات سے انفرادیت کے حامل ہیں۔ایک یہ کہ ان میں ڈاکٹر صاحب نے فلسفۂ انقلاب کے زاویۂ نگاہ سے سیرت کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ نبوت و رسالت،عقیدۂ ختم نبوت اور بعض دیگر مباحث کو بھی بڑی عمدگی کے ساتھ اور نہایت مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔دوسرے یہ کہ اس سے پہلے محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے جہاں بھی منہج انقلاب نبویؐ پر گفتگو کی' نبی اکرم ﷺ کی مبارک جدوجہد کو سات مراحل انقلاب کی صورت میں بیان کیا ہے۔یعنی دعوت، تنظیم، تربیت، صبر محض، اقدام (اور چیلنج)، مسلح تصادم اور انقلاب کی توسیع ۔لیکن اِن خطابات میں انہوں نے اختصار کی غرض سے مراحل انقلاب کو سات کی بجائے تین مرحلوں کی صورت میں بیان کیا ہے۔ پہلا مرحلہ جماعت سازی ہے، جو دعوت، تنظیم اور تربیت کے پہلے تین مراحل کا جامع عنوان ہے۔دوسرا مرحلہ تصادم ہے، جو صبر محض، اقدام اور مسلح تصادم پر محیط ہے اور تیسرا مرحلہ انقلاب کی توسیع ہے۔تیسرے اس پہلو سے بھی ان خطابات کو خصوصی اہمیت اور انفرادیت حاصل ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری عوامی خطابات تھے۔اس کے بعد زندگی نے انہیں زیادہ مہلت نہیں دی اور اس سلسلہ کے آخری خطبہ (جو ۱۴ مارچ ۲۰۱۰ء کو ہوا) کے ٹھیک ایک ماہ بعد آپؒ ۱۴ اپریل ۲۰۱۰ء کو بقضائے الٰہی وفات پا گئے۔ بنابریں کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطابات سیرت مطہرہ کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کے فکر کا نچوڑ ہیں۔اس مجموعہ میں جو خطابات شامل ہیں وہ درج ذیل ہیں:

☆ فلسفۂ دین میں نبوت و رسالت کا مقام
☆ آنحضور ﷺ پر نبوت و رسالت کی تکمیل
☆ حزب اللہ کی تیاری کا نبوی طریق
☆ باطل سے تصادم کے ابتدائی مراحل
☆ باطل سے تصادم کے تکمیلی مراحل

خطابات کی ترتیب وتسوید کے دوران میں مرتب نے حزم واحتیاط کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بزم سیرت میں جو کہا وہ صفحۂ قرطاس پر پورے طور پر منتقل ہو کر قارئین تک پہنچے۔مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی انسانی کاوش خامیوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔لہٰذا اظہار بیان میں اگر کہیں کوئی کمی کوتاہی دکھائی دے تو اسے مرتب کی طرف محمول کیا جائے۔ پھر یہ حقیقت بھی ہر خاص و عام پر آشکارا ہے کہ سیرت مطہرہ جس عظیم الشان، رفیع الدرجات ہستی کا تذکرہ ہے، وہ مجسمۂ پاکیزگی اور جامع کمالات تھی۔

سمندروں کے قطروں کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ ریت کے ذروں کو گنتی کی زنجیر پہنائی جا سکتی ہے۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کے اوصاف وکمالات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ دائرہ گمان میں بھی نہیں لایا جا سکتا ہے۔ بولنا چاہیں تو فکر ونطق دم بخود اور اظہار بیان کی تمام تر رعنائیاں عاجز محسوس ہوتی ہیں۔اس جامع، اکمل، وسیع، مقدس موضوع کے بیان کا حق کما حقہ ادا ہو ہی نہیں ہو سکتا ۔

زندگی ختم ہوئی اور قلم ٹوٹ گئے
پر تیرے اوصاف کا احاطہ نہ ہوا

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اس کتاب کے مؤلف، مرتب، ناشر اور ہر اُس شخص کے لئے جس نے کسی بھی طرح اس کام میں حصہ ڈالا، توشۂ آخرت اور حضور نبی کریم ﷺ کی شفاعت کا وسیلہ بنائے اور اس کے ذریعے ہم سب مسلمانوں کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کی سچی محبت، اتباع اور آپ کے مقصد بعثت کی عالمی سطح پر تکمیل کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دینے کی سچی تڑپ اور آرزو پیدا فرمائے، کہ یہی آپ سے وفاداری کا تقاضا ہے، اور یہی زندگی کا ثبوت۔

دامنش از دست دادن مردن است
چوں گل از بادِخزاں افسردن است
زندگی قوم از دم او یافت است
ایں سحر از آفتابش تافت است
فرد از حق ،ملت از وے زندہ است
از شعاعِ مہر او تابندہ است

(ترجمہ: آپ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا اصل موت ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے پھول بادخزاں میں مرجھا جاتا ہے۔ ملت نے زندگی آپ کے دم سے پائی۔ ملت کی صبح آپ کی ذات کے آفتاب سے روشن ہے، فرد کی زندگی کا دارومدار تعلق باللہ پر ہے اور ملت آپ سے تعلق کی بنا پر وجود اور زندگی پاتی ہے۔ آپ آفتاب ہیں اور آپ کی شعاعوں اور کرنوں سے ملت روشن وتابندہ ہوتی ہے۔)

خاکپائے رسول اللہ ﷺ

محبوب الحق عاجز

نائب مدیر شعبہ مطبوعات

خطبۂ اوّل

# فلسفۂ دین میں
# نبوت ورسالت کا مقام

خطبۂ مسنونہ‘ تلاوتِ آیاتِ قرآنی☆‘ احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد!

معزز حاضرین اور محترم خواتین! آج ہم اللہ کا نام لے کر پانچ خطباتِ سیرت کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حالات کو سازگار بنائے رکھے‘ اور ہمیں ان کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ اِس ضمن میں ہمارے پہلے خطبہ کا عنوان ہے:

''فلسفۂ دین میں نبوت و رسالت کا مقام''

## فلسفہ اور دین

لفظ ''فلسفہ'' قابلِ غور ہے۔ کیا فلسفہ کا دین کے ساتھ کوئی تعلق ہے؟ عام طور پر یہ لفظ دینی حوالے سے استعمال نہیں ہوتا‘ بلکہ اس کے لیے ہم حکمتِ قرآن اور حکمتِ دین کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ''حکمت'' قرآن حکیم کی اصطلاح ہے جبکہ فلسفہ غیر قرآنی اصطلاح ہے۔ اسی طرح یہ اصطلاح حدیث میں بھی نہیں آئی۔ فلسفہ اور حکمت میں فرق یہ ہے کہ فلسفہ خالص منطق کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے اور جہاں کوئی چیز منطقی طور پر ثابت نہ ہو وہاں یہ رک جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا۔ جبکہ حکمت منطق سے بھی سروکار رکھتی ہے اور مبادیاتِ فطرت سے بھی۔ مبادیاتِ فطرت وہ چیزیں ہیں جو انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں۔ اِن چیزوں کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ دلیل کے ذریعے انہیں ثابت کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جب عقل منطق اور فطرت میں ودیعت کردہ چیزوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے فطرتِ سلیمہ کی رہنمائی میں اپنا سفر طے کرتی ہے تو اس کا نتیجہ حکمت کی صورت میں نکلتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک حکیم انسان کے طور پر حضرت لقمان کی مثال دی گئی ہے۔

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ﴾ (لقمان:۱۲)

''اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی کہ اللہ کا شکر کرو۔''

ایک بات اور بھی جان لیجیے۔ فلسفے کی بہت سی شاخیں ہیں۔ منطق بھی فلسفے کی شاخ شمار ہوتی ہے‘ اگرچہ یہ ایک فن ہے۔ ایک زمانے میں نفسیات بھی فلسفے کی شاخ شمار ہوتی تھی۔ لیکن اب فلسفے کے ہر شاخ کے لیے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ ایک شاخ کا نام مابعد الطبیعیات (Metaphysics) ہے۔ اس کا براہِ راست تعلق دین کے ساتھ ہے۔ ایک تو مادی کائنات

☆ سورۃ البقرۃ‘ آیات: ۱ تا ۵‘ ۱۷۷‘ ۲۸۵۔ سورۃ التغابن‘ آیات: ۸ تا ۱۰۔

(physical world) ہے۔ یہ فزکس کا موضوع ہے۔اس کا تعلق حواسِ خمسہ سے ہے۔اس کے برعکس میٹافزکس اُن چیزوں سے بحث کرتی ہے جو حواسِ خمسہ کے دائرے سے باہر ہوں۔ فزکس اور میٹافزکس میں یہی فرق ہے۔

زندگی کے اصل حقائق پردۂ غیب میں ہیں۔ یہ حقائق حواسِ خمسہ کے ذریعے منکشف ہو ہی نہیں سکتے۔قرآن مجید ہدایت کاملہ ہے جو انسان کی رہنمائی کے لیے نازل کی گئی ہے۔ یہ کتاب مابعد الطبیعیات سے بحث کرتی ہے۔قرآن مجید نے ابتدا ہی میں یہ بات واضح کر دی کہ اس سے استفادے کی پہلی شرط غیب پر ایمان ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں فرمایا گیا ہے:﴿الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ② الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ غیب جیسا کہ کہا گیا وہ حقائق ہیں جو حواس کے دائرے میں نہیں آتے۔ چنانچہ ذاتِ باری تعالیٰ ہمارے حواس، فہم، عقل اور وہم و خیال سے ماوراء، ثم وراء الوراء ہے۔ پھر یہ کہ ہم فرشتوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح ہم وحی کا مشاہدہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ سب میٹا فزکس کا میدان ہے۔اور فزکس کا میدان وہ ہے جس میں ہم چیزوں کو دیکھ سکیں۔

## فزیکل سائنسز اور قرآن کی ہم آہنگی

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ فزیکل سائنسز بہت آگے بڑھ چکی ہیں، جبکہ میٹا فزکس کی جانب سے آنکھیں بند ہیں حالانکہ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ضرورت اس امر کی تھی، اور ہے کہ جدید فزکس سے حاصل شدہ معلومات کو قرآن مجید کی میٹافزکس کے ساتھ جوڑ کر دیکھا اور پڑھا جائے۔ان دونوں میں تضاد ہو ہی نہیں سکتا، یہ ناممکن ہے۔ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے بہت عمدہ بات کہی ہے:

> *"The Quran is the words of God and this universe is the work of God."*

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ یہ کائنات اللہ کی تخلیق ہے۔ یہاں کے طبعی قوانین اُسی نے بنائے ہیں۔ وہی اس کو چلا رہا ہے۔لہٰذا ان دونوں میں تضاد ممکن نہیں۔ ذرا سوچئے، جب ایک معقول انسان کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہو سکتا، اگر ایسا ہو تو یہ بہت گھٹیا بات خیال کی جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر کے قول و فعل میں تضاد کیسے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سائنس کے تمام ثابت شدہ حقائق قرآن حکیم کی تائید کرتے ہیں۔اللہ کی یہ کتاب آج سے چودہ سو برس پہلے نازل

ہوئی ہے۔اس وقت انسان کی مادی معلومات بہت کم تھیں۔لہٰذا قرآن مجید میں جن physical phenomenon کا تذکرہ ہوا' ان کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا تھا۔لیکن جیسے جیسے سائنس آگے بڑھتی گئی ان مظاہر کا سمجھنا آسان ہوتا چلا گیا۔یہ بات قرآن حکیم نے پہلے ہی کہہ دی تھی:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾

(حٰم السجدہ:۵۳)

''ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ (قرآن) حق ہے۔''

سائنس کے میدان میں اب تک جو بھی حقائق سامنے آئے ہیں انہوں نے قرآن کی حقانیت کو ثابت و مبرہن کیا ہے۔مثال کے طور پر قرآن حکیم میں علم جنین (Embryology) کے جو حوالے آئے ہیں' انہوں نے ماہرین علم جنین کو حیرت زدہ کر کے رکھ دیا ہے۔اس سلسلے میں کینیڈا کے دو ماہرین علم جنین کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔یونیورسٹی آف ٹورنٹو سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر کتھ ایل مورجن کی علم جنین پر دو تصانیف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں اور ڈاکٹر رابرٹ ایڈورڈز جو ٹسٹ ٹیوب بے بی کے ضمن میں شہرت کے حامل ہیں' دونوں نے نہایت متحیرانہ انداز میں گواہی دی ہے کہ قرآن حکیم نے رحم مادر میں انسانی جنین کی درجہ بدرجہ پرورش کی جو نقشہ کشی کی ہے' وہ اُن معلومات کے ساتھ حیرتناک حد تک مطابقت رکھتی ہے جو خوردبین کی ایجاد کے بعد اب انسان کے علم میں آئی ہیں۔آپ نے فرانسیسی سرجن ڈاکٹر مورس بوکائے کا نام تو سنا ہوگا۔انہوں نے بھی رحم مادر میں بچے کی تخلیق کے مراحل کا مشاہدہ کیا۔یہ جان کر اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ قرآن حکیم نے چودہ سو برس پہلے ہی تخلیق کے وہ تمام مراحل بیان کر دیے ہیں جن تک سائنس برسوں کی تحقیق کے بعد پہنچی ہے۔انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے: بائبل' قرآن اور سائنس۔اس کتاب میں انہوں نے یہ ثابت کیا' اور اس بات کا برملا اقرار کیا کہ قرآن میں کوئی بھی ایسی شے نہیں جسے سائنس نے غلط ثابت کیا ہو۔یہ تو ہو سکتا ہے کہ قرآن میں بیان کردہ بہت سی چیزوں کی حقیقت تک ابھی سائنس کی رسائی نہ ہوئی ہو' لیکن سائنس کی ثابت شدہ کوئی شے ایسی نہیں جس نے قرآن کے بیان کا رد کیا ہو۔پس آج ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ جو دو علوم علیحدہ علیحدہ چل رہے ہیں' ان کو باہم ملا کر پڑھا جائے۔یہ دراصل انسان کی دو آنکھیں ہیں۔ایک آنکھ فزکس کی ہے اور

دوسری آنکھ وحی کی ہے۔ ان دونوں آنکھوں سے دیکھا جانا چاہیے۔ حقیقت کا علم قرآن سے لیا جائے اور کائنات کا علم حواس خمسہ اور عقل کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ پھر یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جائے گی کہ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ یہی بات درحقیقت میری آج کی گفتگو کی بنیاد ہے۔ یعنی دین کی میٹا فزکس اور فلسفہ وحکمت میں نبوت ورسالت کا مقام ومرتبہ کیا ہے۔

## قرآنی میٹا فزکس

سب سے پہلے تو ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ قرآنی میٹا فزکس ہے کیا؟ ہم اس کو ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایمانیات کیا کیا ہیں؟ اللہ پر ایمان' یوم آخرت پر ایمان' وحی پر ایمان' فرشتوں پر ایمان' کتابوں پر ایمان' رسولوں پر ایمان' حضور ﷺ کی رسالت اور ختم نبوت پر ایمان' قرآن حکیم کے اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے اور محفوظ ہونے پر ایمان' مرنے کے بعد زندہ ہونے پر' جنت دوزخ پر' حساب کتاب پر' وزن اعمال پر ایمان۔ یہ سب ایمانیات قرآن حکیم کی میٹا فزکس ہیں اور یہ ہمارے حواس کے دائرے میں آنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ ان ایمانیات کو تین بڑے بڑے عنوانات کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایمان باللہ یا توحید

(۲) ایمان بالآخرت' یا معاد (معاد اسم ظرف ہے یعنی لوٹنے کی جگہ) اور (۳) ایمان بالرسالت

ایمان باللہ کیا ہے؟ ایمان باللہ سے مراد یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات اور موجودات کا خالق و مالک ہے۔ وہی رب اور الٰہ ہے۔ اللہ کی ہستی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ کائنات ایک وقت آئے گا' ختم ہو جائے گی۔ کائنات کے حوالے سے آج تو یہ بات پوری دنیا مان رہی ہے' مگر آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک یہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا' بلکہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اُس وقت انسان نیوٹونین فزکس کے دور میں جی رہا تھا۔ لیکن آج سائنس کے ذریعے انسان پر یہ امر واضح ہو چکا ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے کہ یہ کائنات ہمیشہ سے نہیں ہے اور نہ ہی ہمیشہ رہے گی۔ یہ ایک خاص وقت پر پیدا کی گئی ہے اور ایک خاص وقت پر ختم ہو جائے گی۔ محققین کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ کائنات کا آغاز اب سے لگ بھگ پندرہ سے بیس ارب سال قبل Big Bang سے ہوا تھا۔ یہ کائنات پھلجھڑی کی طرح اب بھی پھیل رہی ہے۔ کائنات میں مزید کہکشائیں وجود میں آ رہی ہے۔ چنانچہ آپ اکثر اخبارات میں یہ پڑھتے رہتے ہیں

کہ آج ایک اور کہکشاں دریافت ہوگئی ہے‘ اور وہ ہم سے اتنے ملین‘ ٹریلین میل دور ہے۔
سائنس تو یہاں تک اب پہنچی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے یہ فرما دیا تھا: ﴿یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ﴾ (الفاطر: ۲) ”وہ (اللہ تعالیٰ) اپنی تخلیق میں اضافہ کرتا رہتا ہے (یا کرتا رہے گا)“
اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ابھی تو یہ کائنات پھیل رہی ہے‘ لیکن ایک وقت آئے گا جبکہ یہ سمٹنا شروع ہو جائے گی‘ اور سمٹتے سمٹتے ایک نقطے پر جا کر ختم ہو جائے گی۔ قرآن حکیم میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔

﴿یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ ؕ وَعۡدًا عَلَیۡنَا ؕ اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (الانبیاء)

”جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں جیسے خطوں کا طومار لپیٹ لیتے ہیں‘ جس طرح ہم نے پہلے پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ پیدا کر دیں گے (یہ) وعدہ (جس کا پورا کرنا لازم) ہے‘ ہم ایسا ضرور کرنے والے ہیں۔“

اللہ کی ہستی جو کائنات کی خالق ہے‘ کی معرفت اُس کے اسماء وصفات کے ذریعے ہو سکتی ہے اور جہاں تک ذاتِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے‘ تو یہ ہماری عقل و فہم اور ہمارے تخیل اور تصور سے ماوراء‘ وراء الوراثم وراء الورا ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ کا چہرہ‘ اللہ کے ہاتھ کا ذکر ہوا ہے‘ مگر ان کی حقیقت کیا ہے‘ ہم نہیں جانتے۔ ہماری مثال تو اُس اندھے کی سی ہے‘ جو ایک بہت بڑی دیوار کے پاس جائے اور ٹٹولے تو اُسے یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ میرے سامنے دیوار ہے‘ مگر یہ دیوار کتنی اونچی ہے؟ یہ کتنی چوڑی ہے؟ یہ بات وہ معلوم نہ کر سکے گا۔ اللہ کی ذات کے بارے میں اصل علم یہی بات ہے کہ ہم اس کی ذات کو نہیں جان سکتے۔ اُس کی معرفت کا ذریعہ صرف اُس کی صفات ہیں۔ یہی بات ایمانِ مجمل میں کہی گئی ہے:

اٰمَنۡتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسۡمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلۡتُ جَمِیۡعَ اَحۡکَامِہٖ اِقۡرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصۡدِیۡقٌ بِالۡقَلۡبِ

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے حوالے سے بھی ہماری limitations ہیں۔ مثلاً اللہ بصیر ہے۔ وہ دیکھتا ہے‘ مگر کیسے دیکھتا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ کیا اس کی کوئی آنکھ ہے؟ کیا وہ بھی

(معاذ اللہ) دیکھنے کے لیے روشنی کا محتاج ہے؟ اسی طرح اللہ سمیع ہے مگر کیسے سنتا ہے؟ کیا اُس کے بھی کان ہیں؟ کیا اُسے بھی صوتی لہروں (sound waves) کی ضرورت ہے جو کانوں سے ٹکرائیں۔ اسی طرح اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ مگر کتنا قادر ہے' ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ بہر کیف ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کی صفات کے حوالے سے پہچانیں۔ قرآن کہتا ہے کہ تمام اچھے نام اللہ کے ہیں۔ تم جس نام سے بھی چاہو اُسے پکارو' اُسے اللہ کے ساتھ پکار لو یا رحمٰن کے ساتھ' جس نام سے پکارو گے یہ جان لو کہ تمام اچھی صفات اسی کی ہیں' اور یہ صفات بتمام وکمال ہیں۔ اللہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ وہ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے۔ وہ ہر چیز کا دیکھنے والا ہے۔ اپنی ذات میں تنہا ہے۔ اُس کی ذات وصفات اور اختیارات میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اُس کی کوئی مثل' مثال اور مثیل نہیں اور نہ اُس کا کوئی ند اور کفو ہے۔ یہ ہے اللہ کی ذات کے بارے میں ہمارے تصورات کا خلاصہ۔

اب آیئے' ایمان بالآخرت کی طرف۔ اللہ نے اس کائنات کو تخلیق فرمایا' اور اس کائنات میں اُس کی تخلیق کا نقطۂ کمال انسان ہے۔ (اس کی تفصیل میں بعد میں بیان کروں گا) انسان کی زندگی یہی چندروزہ نہیں' جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہم تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ حیاتِ انسانی یہی ۶۰ یا ۷۰ برس ہے۔ اگر کسی کی عمر اور زیادہ بھی ہوگئی تو وہ ۹۰ یا ۱۰۰ برس کا ہو جائے گا۔ یہ تصور درست نہیں۔ دیکھئے' انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اُسے مسجودِ ملائک بنایا گیا۔ اللہ نے فرمایا کہ میں نے آدم کو اپنے ہاتھوں سے بنایا جیسا کہ سورۂ صٓ میں فرمایا: ﴿قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾ (آیت:۷۵) ''فرمایا کہ اے ابلیس جس (آدم) کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا۔'' دونوں ہاتھ کون سے ہیں؟ ایک عالم امر ہے اور دوسرا عالم خلق ہے۔ یہ دونوں عالم اللہ کی ذات میں جمع ہیں یا پھر اشرف المخلوقات انسان کی ذات میں۔ انسان کے علاوہ پوری کائنات میں کوئی ایسی مخلوق نہیں جس میں عالم خلق اور عالم امر دونوں جمع ہوں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((خَلَقَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ))[1] ''اللہ عزوجل نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔'' اندازہ کیجیے' انسان کا اس سے اونچا مقام اور کیا ہوگا۔ کیا

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاستئذان' باب بدء الاسلام۔ وصحیح مسلم' کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها' باب یدخل الجنة اقوام افئدتهم مثل افئدة الطیر۔

ایسی عظیم ہستی کی زندگی بس یہی ۶۰ یا ۷۰ برس ہوگی' جبکہ اس مختصر عرصۂ زندگی میں سے بھی کچھ عرصہ بچپن میں گزر جاتا ہے' جب کہ انسان کو ہوش ہی نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کے بڑھاپے میں حواس صحیح سلامت نہیں رہتے' اور یادداشت ختم ہو جاتی ہے۔ باقی شعور کی عمر کتنی رہ جاتی ہے۔ کیا یہ مختصر دورانیہ انسان کی زندگی ہوسکتی ہے؟ ظاہر ہے' ایسا ہرگز نہیں۔ انسان کی زندگی یہی ماہ و سال نہیں بلکہ یہ بہت طویل ہے۔ دنیا کی زندگی تو اس طویل زندگی کا ایک وقفہ ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم رواں' ہر دم جواں ہے زندگی

## حیاتِ انسانی کے پانچ ادوار

انسان کی پانچ زندگیاں ہیں یا یوں کہیے کہ طویل زندگی کے پانچ ادوار ہیں' جن میں سے دو ادوار سوتے ہوئے گزرتے ہیں اور تین بیداری میں۔

پہلا دور: سب سے پہلا دور وہ ہے جب عالم ارواح میں انسان کی روح کو پیدا کیا گیا۔ اُس وقت صرف روح تھی' جسم نہیں تھا۔ اور وہی عالم امر ہے۔ وہاں صرف روحانی زندگی تھی۔ قرآن میں فرمایا: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۵) ''یہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ فرما دیجیے کہ روح میرے رب کا امر ہے۔'' اسی عالم امر کے دوران تمام ارواح انسانی سے بندگی کا عہد لیا گیا۔ اللہ نے پوچھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' ﴿قَالُوْا بَلٰى﴾ ''(تمام ارواحِ انسانیہ نے) کہا' کیوں نہیں''۔ اللہ تو ہی ہمارا رب ہے' حاکم ہے' پروردگار ہے' خالق ہے۔

دوسرا دور: اِس پہلی زندگی کے بعد ہمیں سلا دیا گیا۔ یہ گویا دوسری زندگی ہے۔ یہ موت اور نیند کی کیفیت ہے۔ یاد رہے کہ نیند اور موت میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ موت بھی ایک طرح کی نیند ہے' اور نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔ چنانچہ سو کر اُٹھنے کے موقع پر جو مسنون دعا پڑھی جاتی ہے اُس کے الفاظ ہیں:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانِيْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِيْ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ)) [1]

''تمام شکر اور تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے زندہ کیا ہے' اس کے بعد کہ مجھے مردہ کر دیا تھا۔ اور اُسی کی طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے۔''

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الذکر و الدعا' باب الدعا' عندالنوم ح: ۲۷۱۱

آدمی نیند میں بھی ایک طرح سے مردہ ہو جاتا ہے۔ اسے شعور نہیں رہتا۔ موت بھی معدوم ہو جانے کا نام نہیں' بلکہ ایک عالم سے دوسرے عالم کو منتقل ہونے کا نام ہے۔ اسی لیے جب آپ لاہور سے کراچی جا کر وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ میں کراچی منتقل ہو گیا۔

تیسرا دور: اس کے بعد ہمیں تیسری زندگی اس دنیا میں ملی۔ اس زندگی کا آغاز رحم مادر سے ہوتا ہے' جب انسان کو مادی جسم عطا کیا جاتا ہے۔ رحم مادر میں انسانی جنین جب ۱۲۰ دن کا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتا ہے جو اُس میں روح پھونکتا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں ہر ایک ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی حالت میں رہتا ہے۔ پھر چالیس دن کے بعد گاڑھا خون بن جاتا ہے۔ پھر چالیس دن میں گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے چار چیزیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پس اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں تم میں سے کوئی اہل جنت کے عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان بالشت بھر فاصلہ رہ جاتا ہے' پھر تقدیر الٰہی اس کی طرف سبقت کرتی ہے تو اس کا خاتمہ دوزخیوں کے اعمال پر ہوتا ہے اور وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے اور ایک آدمی جہنمیوں کے اعمال کرتا ہے یہاں تک کہ تقدیر الٰہی اس کی طرف دوڑتی ہے اور اس کا خاتمہ جنتوں کے اعمال پر ہوتا ہے پس وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔''

بدقسمتی سے ہم پر مادیت کا اتنا غلبہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے مادیت زدہ ذہن سے ٹکراتی ہیں اور مادی قوانین اور ضابطوں کے تحت نہیں آتیں' ہم انہیں رد کر دیتے ہیں۔ روح کا یہی معاملہ ہے۔ حالانکہ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ روح عالم خلق کی شے ہے ہی نہیں۔ یہ عالم امر کی شے ہے جبکہ مادی قوانین عالم خلق سے متعلق ہیں۔ یہ عالم اور ہے اور وہ عالم اور۔ دنیا میں ہمیں جو زندگی ملی ہے' یہ روح اور جسم کی زندگی ہے' جبکہ اس سے پہلے دو زندگیاں صرف روح کی زندگیاں تھیں۔

چوتھا دور: حیات دنیا کا ستر اسی سالہ عرصہ مکمل ہوتے ہی انسان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ یہاں سے اُس کی چوتھی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ عالم برزخ اور قبر کی زندگی ہے۔ قبر میں گناہوں کی پاداش میں انسان پر عذاب بھی ہوتا ہے۔ عذاب قبر برحق ہے۔ یہ احادیث ہی سے نہیں' قرآن سے بھی ثابت ہے۔ رہی برزخی زندگی کی کیفیت تو اِسے ہم نہیں جان سکتے۔ اِس خاص کیفیت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند مرتبت ہستی کی

برزخی زندگی کیسی ہوگی؟ کیا یہ ایسی ہی زندگی ہوگی جیسے دنیا میں تھی یا یہ اِس سے مختلف ہوگی۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے شہداء کے متعلق فرمایا کہ انہیں مردہ مت کہو' وہ زندہ ہیں' اللہ انہیں کھلاتا پلاتا ہے' مگر تمہیں اُن کی زندگی کا شعور نہیں۔ جب شہداء کی یہ شان ہے تو شہداء سے اوپر کا درجہ صدیقین کا ہے۔ اُن سے اوپر انبیاء کا درجہ ہے۔ اُن سے اوپر رسولوں کا درجہ ہے اور اُن سے بھی اوپر سید المرسلین ﷺ کا مقام ہے۔ آپ ﷺ کی عظیم المرتبت ہستی کی زندگی کس شان کی ہوگی' ہم اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

پانچواں دور: پانچویں زندگی آخرت کی ہے۔ یہ اُس وقت شروع ہوگی جب صور پھونکا جائے گا۔ صور کے اثر سے سب مرے ہوئے لوگ جی اُٹھیں گے' اور اپنی قبروں سے نکل کر دی گئی خبروں کی سچائی کا نظارہ کریں گے اور اپنے رب کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ ہر مردہ اُسی ہیئت اور حالت پر اُٹھے گا جس میں اُس کی موت واقع ہوئی تھی۔ انسان کو ایسا محسوس ہوگا کہ گویا اُس پر مدہوشی کی حالت ایک گھنٹہ یا چند گھنٹوں سے زیادہ طاری نہیں رہی۔ سب یہی محسوس کریں گے کہ جیسے ابھی دنیا ہی میں ہیں' مگر وقت کی نزاکت اور ہیبت کی وجہ سے اُن کے آپس کے پہلے تمام رشتے ٹوٹ چکے ہوں گے۔ لوگ اپنے پیاروں کو دیکھیں گے' مگر نہ مزاج پرسی کریں گے نہ اہمیت دیں گے۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔ ایک طویل عرصہ اسی حالت میں گزر جائے گا۔ سب لوگ ایک ہی مقام پر کھڑے رہیں گے۔ بالآخر سب کو گھیر گھار کر یکبارگی میدان حشر کی طرف ہانک دیا جائے گا' اور حساب کتاب اور وزن اعمال ہوگا۔ حساب کتاب اور وزن اعمال کے نتیجے میں انسان کے دو ہی ممکنہ انجام ہوں گے: ابدی جنت یا ابدی آگ۔

## دو موتوں کے درمیان زندگی

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہماری یہ حیات دنیوی دو موتوں کے درمیان ہے۔ ایک موت وہ جب ہماری ارواح کو پیدا کرنے اور اُن سے عہد الست لینے کے بعد انہیں کولڈ سٹوریج میں رکھ دیا گیا اور دوسری موت وہ جو اِس دنیا کی زندگی کے اختتام پر آتی ہے۔ یہ زندگی ایک طویل سفر حیات کا ایک مختصر سا حصہ ہے' اور یہ اس لیے عطا کی گئی ہے' تاکہ ہمیں آزمایا جائے' جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک:۲)

''اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل

کرتا ہے۔"

یہ زندگی امتحان کے لیے ہے۔ ہم کمرۂ امتحان میں بیٹھے ہیں۔ ہم بالعموم جس امتحان سے واقف ہیں' وہ تین گھنٹے کا ہوتا ہے مگر یہ امتحان زندگانی ساٹھ ستر سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اس امتحان کا نتیجہ آخرت میں جنت یا جہنم کی صورت میں سامنے آئے گا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

قلزم ہستی سے تو اُبھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

## تخلیق کے دو مراحل

اب آیئے "تخلیق" کے بارے میں چند باتیں ہو جائیں۔ تخلیق کے بڑے دو مراحل ہیں:

(۱) تخلیق کا مرحلہ اول عالم امر ہے۔ یہ اللہ کے ایک کلمہ "کُن" سے پیدا ہوا۔ اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ:

﴿وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ﴿۱۱۷﴾﴾ (البقرۃ)

"جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔"

کلمہ "کُنْ" سے ایک نور پیدا ہوا۔ یہ نہایت لطیف و بسیط اور خنک و پرسکون نور تھا' جس میں نہ حرارت و تپش تھی نہ حرکت و تموج۔ اس نور سے ایک تو عام ملائکہ کی تخلیق کی گئی اور دوسرے روحِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام' روحِ آدمؑ سمیت تمام انسانوں کی ارواح پیدا کی گئیں۔ یہ ارواح "جُنُوْدٌ مُجَنَّدَۃٌ" کی شکل میں تھیں۔ ملائکہ کے بارے میں یہ صراحت حدیث نبویؐ میں بھی موجود ہے کہ اُن کی تخلیق نور سے ہوئی۔ (مسلم عن عائشہؓ) یہ تخلیق کا مرحلہ اول تھا۔ اور یہ مابعد الطبیعیاتی عالم کی تخلیق ہے۔ مختصر طور پر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عالم امر میں جو چیزیں تخلیق ہوئیں' وہ چار ہیں: نورِ بسیط' ملائکہ' روحِ محمدیؐ اور روحِ آدم سمیت تمام ارواحِ انسانیہ' اور روح القدس یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام۔

(۲) تخلیق کا دوسرا مرحلہ طبیعیاتی اور مادی عالم کی تخلیق ہے۔ اللہ کے ایک اور امر "کُنْ" سے نورِ بسیط کے ایک حصے میں ایک دھماکہ ہوا' جس سے یہ پوری کائنات وجود میں آئی۔ تخلیق کا پہلا مرحلہ یعنی عالم امر کی تخلیق چونکہ میٹافزکس سے متعلق ہے' لہٰذا یہ سائنس کے دائرے میں نہیں آتا۔ البتہ یہ مرحلہ ثانی (یعنی عالم مادی کی تخلیق) سائنس کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ عالم مادی کی تخلیق کے بارے میں سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ اِس کا آغاز اب سے لگ بھگ پندرہ بیس

ارب سال قبل "Big Bang" یعنی ایک بہت بڑے دھماکے سے ہوا' یہ دھماکہ جیسا کہ کہا گیا ذات باری تعالیٰ کے ایک دوسرے امر ''کُنْ'' کے نتیجے میں نور بسیط کے ایک حصے میں ہوا۔ جس کے نتیجے میں اس نور نے ایک ایسی ''نار'' کی شکل اختیار کر لی جو ایسے نہایت چھوٹے ذرات الیکٹران' پروٹان اور نیوٹران پر مشتمل تھی۔ جن کا درجہ حرارت نا قابل تصور حد تک بلند (One Hundred Thousand Million Degree Centigrade) تھا اور جو نا قابل تصور سرعتِ رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ جس کے نتیجے میں یہ آتشیں گولہ حجم میں تیزی سے بڑھتا چلا گیا اور مرورِ زمانہ کے ساتھ اِن ذرات کی حرارت اور اُن کی باہمی کشش ثقل کی قوت و شدت دونوں میں کمی آتی چلی گئی۔ اِن اساسی ذرات کے ایک دوسرے سے دور بھاگنے سے یہ ناری ہیولیٰ یا بگولہ مختلف حصوں میں بٹتا بھی چلا گیا' جس سے کہکشائیں وجود میں آئیں اور ہر کہکشاں میں ناری کُرّے پیدا ہوئے' جن میں متذکرہ بالا اساسی ذرات کی تالیف سے ایٹم اور پھر اس کے مرکبات وجود میں آتے چلے گئے۔ اس ناری مرحلے میں جو صاحب تشخص اور صاحب شعور و ارادہ مخلوق پیدا کی گئی وہ ''جنات'' تھے۔ جن کا مادۂ تخلیق قرآن کی جابجا صراحت کی بنا پر آگ ہے' جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ﴾ (الحجر)

''اور ہم نے جنوں کو اس سے بھی پہلے بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔''

گویا جنات کی تخلیق حضرت آدم کی تخلیق سے بہت پہلے ہوئی۔ اور یہ مادۂ تخلیق کے اعتبار سے انسان سے لطیف تر ہیں۔ انسان مٹی سے بنا اور مٹی کثیف شے ہے جب کہ آگ لطیف شے ہے۔ اس میں حرکت اور حرارت ہے۔ ابلیس نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اس کا عذر بھی یہی بیان کیا تھا کہ ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴾ (الاعراف) ''میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اِسے مٹی سے۔'' ابلیس کی نگاہ میں روح محمدیؐ اور روح آدم نہیں تھی' صرف جسد آدم تھا۔ ایک وقت آیا کہ بہت سے ناری کُرّے ٹھنڈے پڑنے شروع ہوگئے۔ ہماری زمین بھی انہی میں سے ایک ہے۔ ٹھنڈے ہونے کے اس عمل کے دو نتائج ظاہر ہوئے: ایک یہ کہ جیسے کوئی انگارہ ٹھنڈا ہونے لگے تو اس کی سطح پر راکھ کی تہہ جم جاتی ہے اسی طرح کرۂ ارضی پر بھی ''خاک'' کی ایک تہہ پیدا ہوگئی' جسے زمین کا چھلکا (crust of the earth) کہا جاتا ہے اور جو کل حیاتِ ارضی' نباتاتی و حیواناتی کا مادۂ تخلیق ہے —— اور دوسرے یہ کہ زمین سے کچھ بخارات نکل کر اس کے

گرد جمع ہو گئے جن سے زمین کا غلاف یعنی ''فضا'' وجود میں آئی۔ اور پھر اسی فضا میں موجود ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امتزاج سے پانی وجود میں آیا جو کل حیاتِ ارضی کے لیے ''منبعِ حیات'' ہے۔ بمصداق: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (الانبیاء: ۳۰) ''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی''۔ اور اس نے موسلا دھار بارش کی صورت میں واپس زمین ہی پر برسنا شروع کر دیا۔ گویا اس سلسلۂ تخلیق کا ایک مرحلہ وہ بھی تھا جس میں زمین پر سوائے پانی کے کچھ اور نہ تھا۔ اور غالباً اسی کی جانب اشارہ ہے قرآن حکیم کے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ﴾ (ھود: ۷) ''اور اس کا عرش پانی پر تھا''۔ اور ادھر چونکہ زمین کی چھڑی (crust) ٹھنڈی ہونے کے باعث سکڑ بھی گئی تھی' لہٰذا سطح زمین پر نشیب و فراز پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ایک جانب پہاڑ اور ان سے ملحق سطح مرتفع کے مختلف مدارج و مراحل کی صورت میں خشکی پیدا ہوئی تو دوسری جانب نشیبی علاقوں میں بارش کے پانی کے جمع ہونے کے باعث سمندر وجود میں آ گئے۔ پھر ساحلی علاقوں میں حیاتِ ارضی کے مادہ تخلیق یعنی مٹی اور اُس کے منبع حیات یعنی پانی کے مابین تعامل سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

## عالم امر اور عالم خلق میں بنیادی فرق

عالم امر اور عالم خلق میں بنیادی فرق جان لیجیے۔ عالم امر میں اللہ کے کسی حکم کی تعمیل میں کوئی لمحہ صرف نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہاں زمان جاری کا کوئی تصور ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس عالم میں خلعت وجود سے مشرف ہونے والی ہستیاں یعنی ملائکہ اور ارواح انسانیہ بھی زمان و مکان کی محدودیتوں سے ماوراء ہیں اور اُن کے فرش سے عرش اور بالعکس فرش سے عرش تک ــــ اور مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک منتقل ہونے میں کوئی وقت صرف نہیں ہوتا بلکہ آن واحد میں مشرق سے مغرب اور فرش سے عرش تک کا سفر طے کر سکتی ہیں۔ اس کے برعکس عالم خلق میں وقت لگتا ہے۔ مثال کے طور پر آم کی گٹھلی سے آم کا پودا ایک دم نہیں نکلتا بلکہ کافی وقت کے بعد نکلتا ہے۔ یہی حال رحم مادر میں انسانی جنین کا ہے۔ اسے بھی پورا ہونے میں ۹ مہینے لگتے ہیں۔ اللہ نے زمین اور آسمان پیدا کیے۔ اس میں بھی وقت صرف ہوا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔

## عالم خلق کی تخلیق کا نقطۂ کمال ــــ انسان

عالم خلق کی تخلیق کا نقطۂ کمال انسان ہے۔ انسان کا مادہ تخلیق مٹی ہے' مگر اُس میں جو

روح ڈالی گئی ہے یعنی روح ربانی اِس نے اُس کا مقام کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ اپنے جسد حیوانی کے اعتبار سے تو ہم جنات سے بھی نیچے ہیں' مگر روح کی بنا پر اشرف المخلوقات ٹھہرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝۴﴾ (التین)

''ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔''

انسان کو مقام بلند روح کی بنا پر ملا۔ روح ربانی کے بغیر اُس کا کوئی مقام نہ ہوتا۔ محض مادی اور جسمانی اعتبار سے تو وہ باقی جانوروں سے بھی کمزور ہے۔ انسان کے بچے ہی کو دیکھ لیجیے۔ پیدائش کے وقت حیوان کا بچہ اُس سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ مثلاً بکری کا بچہ پیدا ہونے کے کچھ ہی دیر بعد چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا جسمانی نظام مکمل اور اعصابی نظام کامل ہوتا ہے۔ یہی حال دیگر جانوروں کا ہے۔ انسان کا بچہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد ہی چلنے کے قابل ہوتا ہے۔

بہرکیف انسان کی بنائے فضیلت روح ہے۔ اس میں دو عالم —— خلق اور امر —— جمع ہیں۔ اُس کا جسم عالم خلق کی شے ہے' اور روح عالم امر کی۔ انسان کے علاوہ کسی بھی مخلوق میں یہ دونوں عالم جمع نہیں۔ مثلاً جنات صرف علم خلق کی مخلوق ہے۔ ان کے برعکس فرشتے صرف عالم امر کی مخلوق ہے۔

## زندگی ایک امتحانی وقفہ

انسان کی یہ دنیا کی زندگی ایک امتحانی وقفہ ہے' جس کا نتیجہ آخرت میں نکلے گا جبکہ حساب کتاب ہوگا۔ یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ امتحان کچھ پڑھا سکھا کر لیا جاتا ہے۔ آپ ایک بچے کو سال بھر پڑھاتے ہیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر اُس کا امتحان لیتے ہیں۔ اگر بچہ امتحان میں کامیاب ہو جائے تو اُسے اگلے درجے میں ترقی دے دیتے ہیں' ورنہ جس درجے میں تھا' وہیں رہتا ہے۔ اِسی طرح آپ کبھی بچے کو کوئی چیز دے کر آزماتے ہیں۔ آپ بچے کو سو روپے کا نوٹ دیتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اِس آزمائش سے مقصود اُس کا رجحان معلوم کرنا ہوتا ہے۔ پیسے ملنے کے بعد بچے کے حوالے سے کئی امکانات ہیں۔ ایک امکان یہ ہے کہ بچہ دوڑ کر کتابوں کی دوکان پر چلا جائے اور رسالے اور کتابیں خرید لائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کھلونوں کی دوکان کا رُخ کرے اور کھلونے لے آئے۔ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ بچہ دوکان سے کھانے پینے کا سامان لے آئے۔ بچہ جو بھی چیز خریدے گا اُس سے اُس کے

رجحان کا اندازہ ہو جائے گا۔

چونکہ یہ زندگی ایک امتحان ہے۔ لہٰذا یہاں امتحان کے فلسفے کے تحت معرکۂ خیر وشر برپا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی

اس امتحان کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر وشر میں تمیز بھی سکھائی ہے اور خیر وشر کی قوتیں بھی عطا کی ہیں۔ ان قوتوں کے درمیان معرکہ جاری رہتا ہے۔ خیر وشر کا اولین معرکہ انسان کے اندر برپا ہوتا ہے۔ انسان کے اندر روح خیر کی قوت ہے اور شر کی قوت اُس کا حیوانی وجود ہے۔ عربی کا مقولہ ہے: ''كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ'' یعنی ہر شے اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ ہمارے حیوانی وجود کا تعلق زمین سے ہے۔ اس کی غذا بھی زمین ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے داعیات اور تقاضے انسان کو زمین کی طرف کھینچتے اور پستی کی طرف دھکیلتے ہیں۔ زمینی خواہشات' آرزوئیں' جنسی جذبہ' بھوک پیاس' دنیا کے بارے میں امنگیں' دولت کی حرص و ہوس اور غلبہ واقتدار کی خواہش یہ سب حیوانی تقاضے ہیں۔ یہ تقاضے اندھے بہرے ہیں۔ ان کو صرف اپنی تسکین سے غرض ہے' انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ یہ تسکین حلال راستے سے ہو یا حرام سے جائز ذریعے سے ہو یا ناجائز سے۔ اسی لیے تو قرآن نفس کے بارے میں کہتا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢبِالسُّوْٓءِ﴾ ''بے شک نفس تو برائی ہی کی طرف بلاتا ہے۔'' حیوانی وجود کے برعکس معاملہ روح کا ہے۔ روح کا تعلق عالم بالا سے ہے۔ اس کی غذا بھی عالم بالا سے آتی ہے' اور یہ غذا اللہ کا کلام ہے۔ روح کی توجہ اوپر کی طرف ہے۔ وہ اپنے مرکز کی طرف مائل بہ پرواز رہتی ہے۔ وہ انسان کو بلندی کی طرف لے جانا چاہتی ہے اور ہر دم اللہ کے قرب کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ معنوی طور پر تو روح کو قرب حاصل ہے ہی' مگر وہ عملاً بھی اللہ کے قریب ہونا چاہتی ہے۔ اس طرح خیر وشر کی کشمکش انسان کے اندر جاری رہتی ہے۔

## انسان کی معنوی شخصیت کی تین سطحیں

فرائیڈ اگرچہ سائیکالوجی میں انسان کو انتہائی غلط رخ پر لے گیا' لیکن اس نے انسان کی معنوی شخصیت کے جو تین لیول مقرر کیے ہیں' وہ اُس کے مشاہدے کی گہرائی کے عکاس ہیں۔

فرائیڈ کے نزدیک معنوی شخصیت کی ابتدائی اور سب سے نچلی سطح Libido (لاشعور) ہے۔ یہ دراصل حیوانی خواہشات ہیں جو انسان کو نیچے کی طرف کھینچتی ہیں۔ دوسری سطح Ego (شعور) ہے۔ تیسری اور بلند ترین سطح Super Ego (فوق الشعور) ہے۔ سپر ایگو کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ یہ دراصل ہر معاشرے کے اندر پائے جانے والے وہ معیارات ہوتے ہیں جو انسان کو متنبہ کرتے ہیں کہ فلاں کام نہ کرنا' اس لیے کہ اسے سماج میں اچھا خیال نہیں کیا جاتا۔ گویا سپر ایگو ایگو پر اثر ڈالتی ہے۔ پھر اگر ایگو چاہے تو پورے وجود حیوانی کو کنٹرول کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر ''سپر ایگو'' ''ایگو'' کو کنٹرول کرتی ہے اور ''ایگو'' ''لبیڈو'' کو کھینچ کر رکھتی ہے۔ قرآن حکیم کے نزدیک انسان کی معنوی شخصیت کے یہی تین لیول ہیں۔ پہلا لطیفۂ نفس ہے۔ یہ تقریباً وہی بات ہے جو فرائیڈ کہہ رہا ہے۔ اس میں کوئی شک اور اختلاف نہیں۔ اس سے اوپری سطح پر لطیفہ قلب ہے۔ تیسری اور بلند ترین سطح پر لطیفہ روح ہے۔ روح انسان کو اوپر کھینچنا چاہتی ہے اور اُس کا مادی وجود اُسے نیچے کھینچنا چاہتا ہے ۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

خیر و شر کی اسی کشمکش میں ہماری زندگی گزر رہی ہے۔ جس طرح ہمارے جسمانی قلب کو چین نہیں ہے' بلکہ ہر وقت متحرک رہتا ہے' سکڑتا اور پھیلتا رہتا ہے' اِسی طرح کا معاملہ معنوی قلب کا ہے۔ اس کا بھی رُخ کبھی روح کی طرف ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا وجود روحانی ہو جاتا ہے۔ مبدائے ارادہ قلب ہے۔ قلب دراصل روح کا آئینہ ہے۔ یہ روح کی طرف ہو جائے تو روح کے اثرات اور انوار و برکات پورے وجود پر چھا جاتے ہیں۔ اور اگر قلب کا رُخ نفس امارہ کی طرف ہو جائے تو پوری انسانی شخصیت حیوانیت کا نقشہ پیش کرتی ہے' بلکہ ہوسکتا ہے کہ انسان ایسا گھٹیا کردار پیش کرے اور اُس سے اس قدر برے اعمال صادر ہوں کہ حیوانیت اور درندگی بھی شرما جائے۔ قلب کے اوپر جو شے حکمران ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے مابین ہیں۔ وہ جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔''(۱) جو شخص خوش قسمت ہو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو روح کی طرف موڑ دیتا ہے۔ وہ بھلائی' نیکی' ایمان' تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ اور بدقسمت

(۱) مسند احمد' مرویات عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما ۔

شخص کے قلب کا رُخ نفس امارہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اور وہ حیوانیت کے راستے پر چل پڑتا ہے۔ قرآن کے نزدیک اس طرح کے لوگ حیوانوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾

''ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل) چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

یہ وہ لوگ ہیں کہ اِن کے دل ہیں' مگر سوچتے نہیں' آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ یعنی ان کا دیکھنا حیوانوں کی طرح کا دیکھنا ہے۔ اگر آدمی دیکھے کہ سامنے سے گاڑی آرہی ہے تو وہ اپنی جان بچالیتا ہے۔ اسی طرح ایک کتا بھی گاڑی کو آتے دیکھ کر اپنے آپ کو بچالیتا ہے۔ بچنے کی صلاحیت اس میں ہے۔ اگر دیکھنا اِسی کا نام ہے تو پھر انسان اور جانور دونوں برابر ہو گئے۔ اصل دیکھنا یہ نہیں' کچھ اور ہے ؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

شے کا ظاہر تو کتے کو بھی نظر آتا ہے۔ انسان تو وہ ہے جو اشیاء کی حقیقت کو سمجھے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی دعاؤں میں سے ایک دعا کے الفاظ ہیں: ((اَللّٰهُمَّ اَرِنِي الْاَشْيَاءَ كَمَا هِيَ))(۱) ''اے اللہ مجھے اشیاء (کی اصل حقیقت) دکھادے جیسی کہ وہ ہیں۔'' یعنی میں صرف ظاہر پر مطمئن نہیں ہونا چاہتا۔ اُن کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے اشیاء کی حقیقت دکھادے۔ حقیقت کو دیکھنے والی آنکھ ظاہر کی آنکھ نہیں' یہ دراصل دل کی آنکھ ہے۔ اسی طرح حقیقت کی طرف متوجہ ہو جانے والے کان بھی دل کے کان ہیں۔

## معرکۂ خیر و شر

خارج میں بھی خیر و شر کی کچھ طاقتیں ہیں' جن کے مابین خیر و شر کا معرکہ جاری رہتا ہے۔ شر کی سب سے بڑی طاقت شیطان (ابلیس لعین) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں راندۂ درگاہ کیا تو وہ اپنی ابلیسیت اور شیطنت پر ڈٹ گیا۔ اُس نے

(۱) صید الخاطر' لعبدالرحمن ابن الجوزی

اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن تک مہلت مانگی اور کہا کہ اے اللہ میں ابن آدم کو اغوا کروں گا اور یہ ثابت کردوں گا کہ حضرت آدم اُس منصب خلافت کا اہل نہیں تھا' جو تو نے اُسے دیا اور میں اُس کی ذریت کو تباہ کر کے چھوڑوں گا۔قرآن میں اُس کا یہ چیلنج بایں الفاظ نقل کیا گیا ہے:

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾﴾ (الاعراف)

''(پھر) شیطان نے کہا کہ مجھے تو تو نے ملعون کیا ہی ہے۔ میں بھی تیرے سیدھے راستے پر ان کو (گمراہ کرنے) کے لیے بیٹھوں گا۔ پھر ان کے آگے سے اور پیچھے سے اور دائیں اور بائیں سے (غرض ہر طرف سے) آؤں گا (اور ان کی راہ ماروں گا)۔تو ان میں اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا۔''

شیطان کا مادۂ تخلیق آگ ہے جو نہایت لطیف مادہ ہے۔ چنانچہ حدیث کے مطابق شیطان انسان کے خون میں دوڑتا ہے(۱)۔ دنیا میں شیطان کے ایجنٹ بھی ہیں۔ یہ جنوں میں سے بھی ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ یہ شیطان کی باقاعدہ پارٹی کا حصہ ہیں' جسے قرآن حکیم میں ''حزبُ الشیطان'' کہا گیا ہے۔ان کا کام حق کا راستہ روکنا اور شر اور باطل کو فروغ دینا ہے۔ دنیا بھر کے انسانوں میں شر کی سب سے بڑی قوت یہودی ہیں۔ یہودیوں کی ذہانت وفطانت اور سازشی ذہنیت تمام لوگوں سے بڑھ کر ہے۔ یہود کی طرف اللہ نے بہت سے نبی اور رسول بھیجے۔ انہوں نے اُن کی تکذیب کی اور بہت سے نبیوں کو قتل کر دیا۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی قتل کے درپے ہوگئے تھے بلکہ قتل کی سازش تیار کی اور اپنے تئیں انہیں سولی پر چڑھا بھی دیا' مگر اللہ نے اُنہیں بچالیا اور زندہ آسمان پر اُٹھالیا۔ اللہ نے یہودی اسکریوتی کی شکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بنادی جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دھوکے سے گرفتار کروایا تھا' اور عیسیٰ علیہ السلام کی بجائے اُسے ہی سولی دے دی گئی۔ یہودی اپنے جرائم کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ہاں مغضوب اور مردود قرار پائے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑا مقام عطا کیا تھا۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ کے چھٹے رکوع کی پہلی آیت سے ظاہر ہے: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اے یعقوب کی اولاد! میرے وہ احسان یاد

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتکاف' باب ھل یخرج المعتکف لحوائجه الی باب المسجد

کرو جو میں نے تم پر کیے تھے اور یہ کہ میں نے تم کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔'' اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جس قوم کی طرف رسول بھیجے وہ بحیثیت مجموعی رسول کا انکار کر دے اور اُس کی جان کے درپے ہو جائے تو اُس پر عذاب بھیجتا ہے۔ رسولوں کی تکذیب پر یہ عذاب پہلے بھی کئی اقوام پر آیا۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ حق کو رد کر کے اور اُن کے قتل کے درپے ہو کر اللہ کے عذاب کے مستحق ہو گئے تھے' مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں عذابِ استیصال سے دوچار نہیں کیا۔ (اُن کی بابت اللہ کی حکمت کچھ اور ہے' جو ایک علیحدہ ایشو ہے۔) تاہم انہیں دنیا میں مردود' ملعون اور مغضوب علیہم بنا دیا۔ خارجی سطح پر جو خیر و شر کا معرکہ جاری ہے' اس میں یہودی شیطان کے سب سے بڑے ایجنٹ ہیں۔ اُن کی ذہانت اور سازشی صلاحیت مسلمہ ہے۔ آج کے اس دجالی دور میں اکثر بڑے سائنسدان یہودی ہوئے ہیں۔ اسی طرح بڑے بڑے لوگ جو دجالی فکر لے کر سامنے آئے ہیں اور اُسے آگے بڑھایا' جس نے انسان کو اللہ سے' اور اس کے دین اور روحانیت سے ہٹا دیا ہے' سب یہودی ہیں۔ مثلاً کارل مارکس یہودی تھا۔ لینن یہودی تھا۔ سٹالن یہودی تھا۔ یہودیوں میں بہت صلاحیت ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ صلاحیت انسان کی تباہی اور گمراہی کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ یہودی جیسا کہ کہا گیا شیطان کے سب سے بڑے آلۂ کار اور ایجنٹ ہیں اور خود اِن کے آلۂ کار White Anglo (WASP) Saxon Protestants عیسائی برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ چنانچہ برطانیہ نے یہودیوں کو طویل دورِ انتشار کے بعد بالفور ڈیکلریشن کے ذریعے دوبارہ فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی' اور امریکہ نے انہیں ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ کی چھتری تلے فلسطین میں ریاست قائم کرنے میں مدد دی۔ یہ تو شر کی قوتیں ہیں۔ اِن کے مقابلے میں خیر کی طاقتیں ہیں۔ خیر کی قوتوں میں انبیاء و رسل اور اُن کے پیروکار شامل ہیں۔ انبیاء کرام کے سچے پیروکار اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے لوگوں کو خیر کی طرف بلاتے' اُنہیں نیکی کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ خیر کی مرئی طاقتیں ہیں جیسے یہودی شر کی مرئی طاقت ہیں۔ پھر جیسے شر کی غیر مرئی قوتوں میں ابلیس اور شیاطین جن ہیں' اسی طرح خیر کی غیر مرئی طاقتوں میں ملائکہ ہیں۔ یہ بھی اللہ کے حکم سے اہلِ ایمان کی نصرت و تائید کرتے اور اُن کے قدم جماتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں فرشتے آئے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق غزوۂ احد میں بھی فرشتے نازل ہوئے' مگر جب امر کے معاملے میں تنازعہ ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکم کی خلاف ورزی ہوئی تو جنگ کا پانسا پلٹ گیا۔

اس کا ذکر سورۃ آل عمران میں بایں الفاظ میں آیا ہے:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ﴾ (آیت ۱۵۲)

''اور اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا (یعنی) اس وقت جب کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جو تم چاہتے تھے اللہ نے تم کو دکھا دیا۔ اس کے بعد تم نے ہمت ہار دی اور حکم (پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے۔''

## شیطان کو انسان پر اختیار حاصل نہیں!

ایک بات اور بھی واضح ہو جائے کہ داعیانِ شر ہوں یا داعیانِ خیر' ان میں سے کسی کو بھی انسان پر اختیار حاصل نہیں۔ وہ صرف دعوت دے سکتے ہیں۔ اگر داعیان حق ہیں تو وہ بھی تبلیغ' تلقین' نصیحت اور تعلیم کے ذریعے سے لوگوں کو حق کی طرف راغب کر سکتے ہیں اور اگر داعیان شر ہیں تو وہ بھی بہلا پھسلا کر انہیں گناہ کی ترغیب دے سکتے ہیں۔ وہ گناہ اور منکرات کو مزین اور خوبصورت بنا کر پیش کریں گے۔ ابلیس کو بھی یہ اختیار نہیں کہ وہ آپ کو غلط راستے پر لے جائے۔ اُس کا طریقۂ واردات یہ ہے کہ آپ کے سامنے دنیا کو خوشنما بنائے گا' بدی کو خوشنما بنا کر پیش کرے گا۔ اس کے لیے بڑے اچھے اچھے الفاظ استعمال گھڑ کر دے گا۔ قرآن مجید میں ہے کہ ابلیس نے اللہ سے قیامت تک مہلت مانگی اور کہا:

﴿رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ؀﴾(الحجر)

''پروردگار' جیسا تو نے مجھے راستے سے الگ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کے لئے (گناہوں کو) آراستہ کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا۔''

یعنی میں گناہوں کو خوبصورت پیرائے میں اُن کے سامنے لاؤں گا اور انہیں اِس طور سے بہکاؤں گا کہ وہ دنیا ہی کے عاشق بن جائیں گے۔

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

اس کے جواب میں اللہ نے فرما دیا کہ

﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ؀﴾

''جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تجھے کچھ قدرت نہیں (کہ ان کو گناہ میں ڈال

سکے) ہاں بد راہوں میں سے جو تیرے پیچھے چل پڑے۔''

ٹھیک ہے' تو انہیں بہلا' پھسلا' دھوکہ دے' سبز باغ دکھا' جتنا چاہے زور لگا دے۔ مگر یاد رکھ' تجھے اُن پر اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ جو بھی تیری طرف آئے گا اپنے اختیار سے آئے گا۔ اس کا اپنا قلب ہوگا جو نفس امارہ کی طرف مائل ہوگا اور اُس کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ اس دور میں گناہوں کو آراستہ کرنے کی سب سے نمایاں مثال یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ طے کیا ہے کہ prostitute (طوائف) کو prostitute نہ کہا جائے بلکہ sex worker کا نام دیا جائے۔ اسی طرح عصمت فروشی کے بارے میں یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ کوئی بُری بات ہے' یہ بھی ایک ذریعۂ معاش ہے۔ ایک عالمی ادارے کی جانب سے ایسا فیصلہ اس لیے ہوا ہے کہ یہ ادارہ یہود کے شکنجے میں ہے' جو ساری دنیا میں پوری طرح شیطنت اور بے حیائی کو عام کر دینا چاہتے ہیں۔

## انبیاء کرام کی بنیادی ذمہ داری: انذار و تبشیر

جس طرح شیطان اور اُس کی ذریت انسان کو جبراً غلط راستے پر نہیں ڈال سکتی' اسی طرح داعیان حق یہاں تک کہ انبیاء کرام کو بھی اختیار یہ نہیں کہ لوگوں کو راہ ہدایت پر لے آئیں۔ ان کا کام انذار و تبشیر اور تبلیغ و تلقین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں کار نبوت کی ادائیگی کے حوالے سے انبیاء و رسل کے لیے بنیادی اصطلاحات مبشر اور منذر آئی ہیں۔ سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴿١٦٥﴾﴾

''(سب) پیغمبروں کو (اللہ نے) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بنا کر بھیجا تھا) تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع نہ رہے۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔''

معلوم ہوا انبیاء خبردار کرنے والے اور بشارت دینے والے ہیں۔ وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ غلط راستے پر نہ چلو۔ یہ جہنم کا راستہ ہے۔ اگر اس راستہ پر چلو گے تو جہنم کی دہکتی آگ تمہارا مقدر ہوگی۔ دیکھو' ہم نے تمہیں برے انجام سے خبردار کر دیا۔ اب اس سے بچنا تمہارا کام ہے۔ اِسی طرح وہ لوگوں کو سیدھا راستہ بتاتے ہیں اور انہیں یہ خوشخبری دیتے ہیں کہ اگر تم اس راستے پر چلو گے تو تمہارا ٹھکانہ جنت ہوگا۔ نبیٔ آخر الزماں ﷺ خیر کے سب سے بڑے اور عظیم ترین داعی ہیں۔ آپؐ سے بھی یہی فرمایا گیا:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴿٥٦﴾﴾ (القصص)

''(اے محمد) تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔''

اس ضمن میں حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں ہمارے سامنے سب سے بڑی مثال آپؐ کے چچا ابوطالب کی ہے۔ ابوطالب حضور ﷺ کے محسن تھے اور اس اعتبار سے ہم سب کے محسن ہیں۔ انہوں نے حضور ﷺ کو سپورٹ کیا' آپؐ کو اپنی پناہ میں رکھا۔ وہ جب تک زندہ رہے اس وقت تک قریش کو آپؐ کے خلاف کوئی اقدام کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس لیے کہ اندیشہ تھا کہ اگر آپؐ کے خلاف اقدام کیا تو قریش میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ اُن میں آپس میں تصادم ہو جائے گا۔ حضور ﷺ کی بڑی آرزو تھی کہ آپؐ کے چچا ایمان لے آئیں' مگر معروف روایات کے مطابق ابوطالب کلمہ پڑھے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جب اُن کا آخری وقت آیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: چچا جان! میرے کان میں کلمہ پڑھ لیجیے' تاکہ میں اللہ کے ہاں گواہی دے سکوں۔ مگر عزتِ نفس اُن کے آڑے آ گئی اور انہوں نے عرب مزاج کی بنا پر اسلام قبول نہ کیا۔ کہنے لگے بھتیجے' میں جانتا ہوں کہ تیرے دین سے بہتر کوئی دین نہیں' لیکن میں اس وقت کلمۂ شہادت نہیں پڑھنا چاہتا' مبادا عرب کی عورتیں یہ کہہ دیں کہ ابوطالب نے موت کے ڈر سے اپنا مذہب تبدیل کر دیا۔

انبیاء و رسل بشیر' نذیر' داعی الی اللہ' مینارۂ نور معلم' مربی اور مزکی ہوتے ہیں اور جو لوگ نبیوں کے نقشِ قدم پر چل کر مخلوق کی خدمت کریں' لوگوں کو صحیح راستے پر بلائیں' ان کے لیے بھی یہی الفاظ ہوں گے۔ تمام انبیاء و رسل کے لیے مبشر و منذر اور نذیر کے الفاظ آئے ہیں۔ (البقرۃ:۲۱۳' الانعام:۴۸' الکہف:۵۶' فاطر:۲۴) لیکن انبیاء کرامؑ بھی اس پر قدرت نہیں رکھتے کہ لوگوں کو ہدایت دے دیں۔ انبیاء کرام کی متذکرہ حیثیتوں کے علاوہ ایک حیثیت شاہد کی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں جہاں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے آپؐ کی ان تمام حیثیتوں کو جمع کیا گیا ہے ''شاہد'' کی حیثیت کا ذکر سب سے پہلے ہوا ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا﴿٤٥﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا﴿٤٦﴾﴾

''اے پیغمبر ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر

بھیجا ہے۔ اور اللہ کی طرف بلانے والا اور چراغ روشن‘‘

ترتیب نزولی کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو آپ کی ’’شاہد‘‘ کی حیثیت کا تذکرہ سب سے پہلے آیا ہے‘ جبکہ دوسری اصطلاحات بعد میں آئی ہیں۔ چنانچہ سورۃ المزمل میں بھی جو ابتدائی مکی دور کی سورتوں میں سے ہے آپ کو ’’شاہد‘‘ کہا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۬ۙ شَاهِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَآ اَرۡسَلۡنَآ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰی فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ فَاَخَذۡنٰهُ اَخۡذًا وَّبِیۡلًا ﴿۱۶﴾ فَکَیۡفَ تَتَّقُوۡنَ اِنۡ کَفَرۡتُمۡ یَوۡمًا یَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِیۡبَا ﴿۱۷﴾ ۣالسَّمَآءُ مُنۡفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ کَانَ وَعۡدُهٗ مَفۡعُوۡلًا ﴿۱۸﴾﴾

’’(اے اہل مکہ) جس طرح ہم نے فرعون کے پاس (موسیٰ کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا تھا (اسی طرح) تمہارے پاس (محمد ﷺ) رسول بھیجے ہیں جو تمہارے مقابلے میں گواہ ہوں گے۔ سو فرعون نے (ہمارے) پیغمبر کا کہا نہ مانا تو ہم نے اس کو بڑے وبال میں پکڑ لیا۔ اگر تم بھی (ان پیغمبر کو) نہ مانو گے تو اس دن سے کیونکر بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ (اور) جس سے آسمان پھٹ جائے گا۔ یہ اس کا وعدہ (ہے جو پورا) ہو کر رہے گا۔‘‘

’’شاہد‘‘ کا لفظ غائب کا متضاد ہے۔ اس کے معنی حاضر و موجود کے ہیں۔ اس میں دو معانی اضافی طور پر پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک گواہ اور دوسرا مددگار۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی موقع پر موجود ہو گا وہی وقوعہ کا گواہ بھی ہو گا‘ اور وہی مدد بھی کر سکے گا۔ جو شخص موجود نہ ہو‘ اُس نے ایک واقعہ کو دیکھا ہی نہ ہو‘ وہ نہ تو گواہی دے سکتا ہے‘ اور نہ ہی مدد کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ سورۃ الفتح میں مددگار کے معنی میں اللہ کے لیے ’’شہید‘‘ کا لفظ آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا ﴿۲۸﴾﴾

’’اللہ کافی ہے (آپ کی) مدد کے لیے۔‘‘

## شہادت کے معنی

اب سوال یہ ہے کہ ’’شہادت‘‘ کے کیا معنی ہیں؟ شہادت کے معنی گواہی ہیں۔ گواہی کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک مدعی کی طرف اور دوسرا مدعا علیہ کی طرف۔ گواہی یا تو کسی کے حق میں ہو گی اور یا پھر کسی کے خلاف ہو گی۔ اگر حق میں ہو تو ایسی صورت میں ’’شَهِدَ‘‘ کے ساتھ ’’ل‘‘ کا صلہ آتا ہے۔ اور اگر خلاف ہو تو پھر تو شَهِدَ کے ساتھ ’’علیٰ‘‘ کا صلہ آتا ہے۔ اِس ’’ل‘‘ اور ’’علیٰ‘‘ کے فرق کو ایک حدیث کے حوالے سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ))[1] ’’قرآن حجت ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف‘‘ یعنی یہ تمہارے حق میں گواہی دے گا یا پھر تمہارے خلاف۔ اگر قرآن حکیم کے حقوق ادا کرو گے‘ اس کو پڑھو گے‘ اس کو سمجھو گے‘ اُس پر عمل کرو گے اور اسے اپنا امام بناؤ گے تو یہ تمہارے حق میں گواہی دے گا اور کہے گا‘ باری تعالیٰ! تیرا یہ بندہ مجھے پڑھتا تھا‘ مجھ پر غور کرتا تھا‘ مجھ پر عمل کرتا تھا‘ میری تبلیغ کرتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو میری (قرآن کی) تعلیم و تعلم کے لیے وقف کر دیا تھا۔ تو اس کے حق میں میری گواہی قبول فرما۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ((اَلصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ: أَیْ رَبِّ إِنِّيْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهْوَاتَ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِيْ فِيْهِ وَيَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِيْ فِيْهِ فَيُشَفَّعَانِ))[2] ’’روزہ اور قرآن دونوں بندہ کے لیے شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار میں نے اس کو کھانے اور دوسری خواہشات (مثلاً پانی‘ جماع اور غیبت وغیرہ) سے دن میں روکے رکھا‘ لہٰذا میری طرف سے اس کے حق میں شفاعت قبول فرما۔ قرآن کہے گا کہ میں نے اسے رات میں سونے سے روکے رکھا‘ لہٰذا میری طرف سے بھی اس کے حق میں شفاعت قبول فرما۔ چنانچہ ان دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔‘‘ قرآن مجید کے حقوق ادا کریں گے تو یہ ہمارے حق میں حجت بنے گا ورنہ یہ ہمارے خلاف حجت ہوگا اور ہمارے خلاف گواہی دے گا۔ ’’شہادت‘‘ قرآن مجید کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ جس کا تعلق کارِ رسالت کی ادائیگی سے ہے۔ رسولوں کو اسی لیے بھیجا جاتا ہے‘ تاکہ شہادت علی الناس کا فریضہ انجام دیں‘ اور لوگوں پر حجت تمام ہو سکے‘ اور روزِ محشر اُن کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔

## محاسبۂ اُخروی کی پانچ بنیادیں

یہاں یہ بات واضح کر دی جائے کہ اگر کوئی بھی نبی اور رسول نہ آتا‘ تب بھی ہر شخص کا محاسبہ ہونا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ روزِ محشر اُس شخص سے بھی محاسبہ ہوگا کہ جس تک کسی نبی اور رسول کی دعوت نہیں پہنچی‘ (یہ الگ بات ہے کہ اُس کا محاسبہ توحید اور نیکی اور بدی کے عام معیار کے اعتبار سے ہوگا‘ اُس سے یہ محاسبہ نہیں ہو سکتا کہ تو نے نماز کیوں نہیں پڑھی۔ اس لیے کہ اس کے

---

(۱) سنن ابن ماجه‘ كتاب الطهارة‘ باب الوضو شطر الايمان۔

(۲) الجامع الصغير للسيوطی‘ ج: ۵۲۰۳ الراوی: عبدالله بن عمروؓ۔

پاس یہ عذر ہے کہ الٰہی‘ مجھے تو تیرا پیغام پہنچا ہی نہیں)۔ یقیناً اُس سے بھی محاسبہ ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ اُس سے کوئی باز پرس ہی نہ ہو۔ یہ محاسبہ اُن پانچ چیزوں کی بنیاد پر ہوگا جو اللہ نے انسان میں ودیعت کی ہیں۔

محاسبہ کی اوّلین بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سماعت و بصارت عطا کی۔ دوسرے یہ کہ اسے عقل وخرد سے نوازا۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔــوْلًا ۝۳۶﴾ (بنی اسرائیل)

”اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) کے بارے میں ضرور باز پرس ہوگی۔“

محاسبہ کی تیسری بنیاد یہ ہے کہ نفس انسانی کے اندر نیکی و بدی کا شعور الہام کیا گیا۔ نیکی بدی کی پہچان فطرت انسانی میں رکھ دی گئی ہے۔ سورۃ الشمس میں فرمایا گیا:

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾

”پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی۔“

ہر شخص بنیادی طور پر یہ جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا برا ہے‘ اور سچ بولنا اچھا ہے۔ ہمدردی اچھی شے ہے اور ظلم بری شے ہے۔ یہ چیزیں بنیادی اخلاقیات میں سے ہیں جو انسان کی فطرت میں شامل ہیں۔ اس لیے قرآن نیکی کو معروف کہتا ہے یعنی یہ لوگوں کے نزدیک جانی پہچانی شے ہے۔ اور برائی اور گناہ کو منکر کا نام دیتا ہے۔ یعنی اس سے انسان کی طبیعت نفرت کرتی ہے۔

محاسبہ کی چوتھی بنیاد روح میں اللہ کی معرفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں تمام ارواح انسانی سے اپنی بندگی کا عہد لیا۔ اُن سے پوچھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ﴿قَالُوْا بَلٰى﴾ (تمام ارواح نے) کہا کیوں نہیں‘ تو ہی ہمارا رب ہے۔ (ہم تیری ہی بندگی کریں گے)

محاسبہ اخروی کی پانچویں بنیاد وہ جذبہ محبت ہے جو روح میں رکھا گیا ہے۔ یہ معرفت اور محبت خوابیدہ ہے۔ اس کو بیدار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام ربانی کی بارش ہوتی ہے۔ روح کو کلام ربانی کی غذا ملتی ہے تو اس کی صلاحیت ابھرتی ہے۔

## نبی اکرم ﷺ کی بعثت‘ اتمامِ حجت

ان پانچ چیزوں کی بنیاد پر ہر شخص روزِ محشر جوابدہ ہوگا‘ چاہے اُس کے پاس کسی نبی اور کسی

رسول کا پیغام نہ بھی پہنچا ہو۔لیکن اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے ساتھ ساتھ نبوت ورسالت اور کتابوں کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ نبی لوگوں کو خیر کی دعوت دیتے اور بدی سے روکتے ہیں اور نیکی اور بدی کی پہچان اور بڑھا دیتے ہیں۔جس سے انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ میرا اصل مقام کیا ہے۔اُسے یہ بات یاد آ جاتی ہے کہ میں کون ہوں' اور مجھے اللہ کو راضی کرنے کے لیے کیا کرنا ہے۔میں اس امتحان زندگی میں کیسے سرخرو ہو سکتا ہوں۔جب نبی آ گئے' تو اخلاق کا پیکر' سیرت وکردار کا مجسمہ انسان کے سامنے آ گیا۔حق کی دعوت بھی سامنے آ گئی اور نمونۂ عمل بھی۔ ہر نبی نے اپنے دور میں روح میں چھپی یا دبی ہوئی چیزوں کو اجاگر کیا۔اس سے گویا دو کام ہو گئے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے لیے حق کو پہچاننا اور اسلام پر چلنا آسان ہو گیا۔دوسرے یہ کہ ان پر حجت تمام ہو گئی۔چنانچہ اب آخرت میں یہی نبی اور رسول کھڑے ہو کر گواہی دیں گے کہ اے اللہ' ہم نے ان لوگوں تک تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔اب یہ اپنے اعمال کے لیے خود جواب دہ ہیں۔یہ آج یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم تک اللہ کا پیغام پہنچا ہی نہیں' ہم سے جواب طلبی کیوں ہو رہی ہے۔ہمارے نبی ﷺ نے تو اتمام حجت کے معاملے کو کمال تک پہنچا دیا۔آپؐ نے لوگوں سے اِس کی گواہی بھی لے لی۔خطبہ حجۃ الوداع آپؐ کا آخری خطبہ ہے۔اس موقع پر آپؐ نے اپنی دعوت کے اہم نکات خوب کھول کر بیان کیے۔سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا۔حضور ﷺ ایک ایک لفظ تین تین مرتبہ بول رہے تھے۔جب خطبہ ختم ہو گیا' تو آپؐ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا: **اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟** لوگو! بتاؤ' کیا میں نے تمہیں (پیغام حق) پہنچا دیا؟ تو صحابہؓ نے آپؐ کے پوچھنے پر کہا یارسول اللہ ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حق امانت ادا کر دیا، آپؐ نے حق رسالت ادا کر دیا (یعنی آپؐ کے ذمہ قرآن کی امانت پہنچانا تھا' آپؐ نے پہنچا دیا)، آپؐ نے ہماری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔پھر آپؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا: **اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ**[1] ''اے اللہ تو بھی گواہ رہے (کہ میں نے پیغام حق پہنچا دیا)۔''

آخرت میں جب امتوں کو کھڑا کیا جائے گا تو ہر امت کے رسول کھڑے ہو کر کہیں گے کہ اے اللہ' تیرا جو پیغام مجھ تک پہنچا تھا' میں نے اسے ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔اب یہ اپنے عمل کے لیے خود جوابدہ ہیں۔سورۃ النساء کی آیت ۴۱ میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب خطبہ ایام منیٰ۔

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾

''بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔''

روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے کچھ قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کی' حضور ﷺ آپ کو سناؤں؟ جبکہ آپ پر تو قرآن نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا' ہاں سناؤ' مجھے دوسروں سے سن کر اور لذت محسوس ہوتی ہے۔ تعمیل امر میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۃ النساء کی قراءت شروع کر دی۔ جب ۴۱ ویں آیت پر پہنچے تو حضور ﷺ نے فرمایا: بس کرو بس کرو۔ انہوں نے دیکھا کہ آپؐ کے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے(۱)۔ یہ آنسو آخر کس بات پر بہہ رہے تھے؟ کس بات کی فکر آپؐ کو لاحق تھی۔ آپؐ کی یہ کیفیت اس وجہ سے ہوئی کہ آپؐ کو آخرت میں اپنی قوم کے خلاف گواہی دینی ہوگی۔ یہ ہے فریضہ شہادت حق۔ انبیاء کرام جب پیغام حق لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں تو اُن پر حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کسی کے پاس کوئی عذر نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں اس معاملے کو اور بھی کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۶۵﴾

''(سب) پیغمبروں کو (اللہ نے) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بنا کر بھیجا تھا) تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع نہ رہے۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔''

## شہادت علی الناس: اُمت مسلمہ کا فرض منصبی

حضور ﷺ پر نبوت و رسالت کا اتمام ہو چکا ہے' لیکن کارِ رسالت تو ابھی باقی ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ جب لوگ رسول کی دعوت بھلا دیتے تو اللہ تعالیٰ اور رسول بھیج دیتا جو اُن کی اصلاح کرتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ تکمیل نبوت و رسالت کے بعد اب یہ کام کون کرے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حق کی گواہی اب ہماری ذمہ داری ہے۔ اب یہ ذمہ داری بحیثیت مجموعی پوری اُمت مسلمہ کے کندھوں پر آن پڑی ہے۔ یہ مضمون قرآن حکیم میں دو مرتبہ آیا ہے۔ ایک مقام

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب قول المقری للقاری۔

سورۃ الحج کی آیت ۷۸ ہے۔ فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۵ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾

''اور خدا (کی راہ) میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمہارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے تو جہاد کرو) تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں۔ اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔''

یہ گویا اُمت کا فریضۂ رسالت ہے۔ آپؐ کی جانب سے اور آپؐ کی ہدایت پر انجام دیا جا رہا ہے۔ حضور ﷺ کی زندگی میں بھی جہاں آپؐ خود تبلیغ کرتے تھے' صحابہؓ تبلیغ نہیں کرتے تھے۔ عشرۂ مبشرہ میں سے چوٹی کے چھ صحابہؓ 'حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر ایمان لائے' مگر یہ دعوت و تبلیغ حضور ﷺ کی اجازت سے ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ عید کے اجتماع میں جا کر میری طرف سے خواتین کو فلاں فلاں باتیں بتا دو۔ آپؓ تعمیل حکم میں وہاں گئے اور وہ باتیں بتانے سے پہلے فرمایا: أنی رسولُ رسولِ اللّٰہ ﷺ یعنی ''میں اللہ کے رسول کا رسول ہوں۔'' میں رسول اللہ کا پیغامبر ہوں اور حضور ﷺ کا پیغام پہنچانے آیا ہوں۔ یہی ''رسول'' کا لفظ نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے لیے استعمال فرمایا تھا جب آپؐ انہیں یمن کا گورنر بنا کر بھیج رہے تھے۔ آپؐ نے اُن سے بغرض امتحان پوچھا' بتاؤ اگر کوئی معاملہ پیش آیا تو کیسے طے کرو گے۔ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں پہلے قرآن میں دیکھوں گا۔ اگر قرآن میں وہ بات نہ ملی تو میں آپؐ سنت و حدیث میں دیکھوں گا۔ وہاں بھی نہ ملی تو پھر میں کوشش کروں گا کہ صحیح رائے تک پہنچ جاؤں یعنی اجتہاد کروں گا۔ آپؐ بہت خوش ہوئے اور ان کی تصدیق کی اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اللہ کے رسول کے ''رسول'' کو صحیح بات تک پہنچا دیا۔

سورۃ البقرہ میں بھی جہاں تحویل قبلہ کا حکم آیا' اُس کے بعد اُمت مسلمہ کو اُس کی ذمہ داری یہی بتائی گئی کہ وہ لوگوں پر حق کی گواہی دے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (آیت ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں ﷺ) تم پر گواہ بنیں۔''

قرآن مجید میں اہم مضامین دو جگہ ضرور آئے ہیں۔ یہی بات یہاں بھی ہوئی ہے۔ سورۃ الحج میں رسولؐ کا ذکر پہلے کیا گیا اور اُمت کا بعد میں' جبکہ یہاں سورۃ البقرہ میں اُمت کا ذکر پہلے اور رسولؐ کا بعد میں آیا ہے۔ بہرکیف شہادت حق کی یہ ذمہ داری اُمت مسلمہ کے کاندھے پر ہے۔

## فرض منصبی سے غفلت کا انجام

فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی ہی پر اُمت کی سربلندی کا انحصار ہے۔ افسوس کہ آج اُمت اس کام سے غافل ہے۔ اسی لیے دنیا میں ہر جگہ ذلیل وخوار ہورہی ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخئ فرشتہ ہماری جناب میں

ہر جگہ مسلمانوں پر ذلت ومسکنت کا عذاب مسلط ہے۔ وہ کمزوری اور کم ہمتی کا شکار ہیں۔ ہم اہل پاکستان کا حال یہ ہے کشمیر کو اپنی شہ رگ کہتے ہیں' مگر اتنی جرأت نہیں کہ کبھی انڈیا سے یہ کہہ سکیں کہ آؤ' ہم سے میدان میں آ کر مقابلہ کرو۔ ایک وہ دور تھا جب انڈیا کے دونوں اطراف پاکستان تھا۔ ایک طرف موجودہ پاکستان دوسری جانب مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) اور بھارت پاکستان سے ڈرتا تھا۔ اب حالات بہت بدل گئے ہیں۔ اب تو ہم انڈیا کے آگے بچھے جارہے ہیں۔ یہی معاملہ عرب مسلمانوں کا ہے۔ عربوں کی آبادی تیس چالیس کروڑ ہے' مگران کے سینے میں اسرائیل نے خنجر گھونپ دیا ہے۔ فلسطینی مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے جارہے ہیں' اُن سے کون آگاہ نہیں۔ صہیونیوں کا ظلم اور سفاکی ایسی ہے کہ درندگی بھی شرما جائے۔ مگر ہم مسلمان اس پر مہر بہ لب ہیں۔ فلسطین اور کشمیر میں تو ساٹھ سال سے خون مسلم کی ارزانی ہے ہی' اس کے علاوہ بھی دنیا میں کئی جگہ مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ مسلمانوں کا خون مانند آب ارزاں ہوگیا ہے۔ وہ چاہے صومالیہ ہو' چیچنیا ہو' کوسووہو یا فلپائن ہو' مگر مسلمانوں کی زبانیں گنگ ہیں۔ وہ بے بسی اور لاچارگی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کا ساتھ دینے کی

بجائے دشمنوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔

## صلیبی جنگ میں دشمنوں سے تعاون

نائن الیون کے بعد افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے' اور ہم مسلمان دشمنوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ دشمن یہ بات ہمارے ذہنوں میں بٹھانا چاہتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ہماری اپنی جنگ ہے۔ اور اُس کی یہ بڑی کامیابی ہے کہ اُس نے میڈیا کے زور سے عام لوگوں کو بہت حد تک یہ باور کرا دیا ہے کہ ہاں یہ ہماری جنگ ہے۔ حالانکہ یہ بات سراسر خلاف حقیقت ہے۔ یہ جنگ جو ہم لڑ رہے ہیں ہرگز ہماری جنگ نہیں۔ یہ اسلام دشمنوں کی جنگ ہے' جو ہم پر مسلط کر دی گئی ہے۔ یہ بات کوئی اندھا ہی کہہ سکتا ہے کہ یہ ہماری جنگ ہے۔ اگر یہ ہماری جنگ تھی تو پھر اس کا آغاز نائن الیون کے بعد ہی کیوں ہوا' پہلے کیوں نہیں ہو گیا؟ اگر یہ ہماری جنگ ہوتی تو ہم امریکہ سے مدد مانگتے نہ کہ امریکہ ہم سے مدد مانگتا۔ مگر یہاں تو صورت یہ ہے کہ امریکہ نے ہم سے مدد مانگی۔ اُس نے ہمیں یہ دھمکی کیوں دی کہ .Your are with us or against us یعنی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو تم ہمارے ساتھ ہو' اور اس صورت میں تمہیں بہر صورت ہمارا ساتھ دینا ہوگا' ہم جو بھی مطالبہ کریں گے اُسے ماننا ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں ہو اور ساتھ نہ ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم ہمارے خلاف ہو اور خلاف ہونے کا انجام تمہیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ پھر ہم تمہیں پتھر کے دور میں لے جائیں گے۔ اس بات میں اب کوئی شک نہیں رہا کہ نام نہاد دہشت گردی کی آڑ میں امریکی ایک "Crusade" شروع کر رہے تھے۔ یہی بات اُس وقت کے صدر امریکہ بش کے منہ سے نکل گئی۔ اُس نے اس جنگ کو "Crusade" قرار دیا تھا۔

نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں
فقیہہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

پھر اس کا ایک اور اس کا ثبوت بھی موجود ہے۔ امریکہ میں پروٹسٹنٹس عیسائیوں میں سے وہ جو زیادہ فعّال اور بائبل کی نشر و اشاعت اور تشریح و توضیح کرنے والے ہیں Evengelists کہلاتے ہیں۔ اُن کا ایک ماہنامہ رسالہ فلاڈلفیا سے نکلتا ہے جس کا نام The Philadelphia Trumpet ہے۔ نائن الیون سے ایک ماہ قبل اُس کے اگست ۲۰۰۱ء کے شمارے کے ٹائٹل پر لکھا ہے:

*"The Last Crusade : Most people think the crusades are a thing of the past-over forever. But they are wrong. Preparations are being made for a final crusade, and it will be the bloodiest of all."*

(آخری صلیبی جنگ۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ صلیبی جنگیں ماضی کی بات تھی، اب یہ ختم ہو چکی ہیں۔لیکن اُن کا یہ خیال غلط ہے۔آخری صلیبی جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور یہ جنگ تمام جنگوں سے زیادہ خوں ریز ہوگی۔)

اسی صلیبی جنگ کے بارے میں معروف کالم نگار اور محقق عابد اللہ جان کی کتاب: AFGHANISTAN: The Genesis of the Final Crusade کافی چشم کشا ہے۔

ماضی کی صلیبی جنگیں پونے دو سو برس تک جاری رہیں۔ان جنگوں میں کئی ادوار آئے۔ ۸۸ برس تک بیت المقدس عیسائیوں کے زیر قبضہ رہا۔ پھر اُن سے صلاح الدین ایوبی نے واپس لیا۔لیکن ان طویل جنگوں میں اتنے آدمی نہیں مرے جتنے لوگ افغانستان اور عراق میں مر چکے ہیں۔

## اسلامی نظام سے روگردانی

مسلمانوں کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ہم کیوں عذاب الٰہی کی گرفت میں ہیں؟ جواب بالکل واضح ہے۔ہم بحیثیت اُمت اپنا مشن بھلا بیٹھے ہیں۔شہادت علی الناس کا تقاضا یہ تھا کہ ہم دنیا میں اللہ کا دین قائم کرتے ۔۔۔۔ دنیا کو دعوت دیتے کہ آؤ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو، یہ ہے اللہ کا دین، یہ ہے اسلام کا نظام عدل اجتماعی۔ہم اسلام قائم کرنے اور اُس کا عملی نمونہ دکھانے کی بجائے بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ اسلام ہے کہاں جو ہم نافذ کریں۔وہ تو صرف کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔افسوس کہ ہم نے دنیا کے نقشے پر موجود ۵۸ مسلم ممالک میں سے کسی ایک میں بھی اسلام نافذ نہیں کیا۔آج اسلام بطور دین کہیں بھی نافذ نہیں ہے۔یہ جہاں بھی موجود ہے مذہب کے طور پر ہے۔مراسم عبودیت کی حد تک ہے۔نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سے کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔دشمنوں کو پریشانی اُس وقت ہوتی ہے جب اسلامی نظام کی بات کی جاتی ہے، جب خلافت کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔کیونکہ خلافت کا اُن کے استحصالی نظام سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔صہیونیوں کے آلۂ کار انگریز اور امریکیوں کو کیا تکلیف تھی کہ وہ افغانستان پر چڑھ دوڑے؟ کیا وہ افغانی مسلمانوں کے نماز روزہ کی وجہ سے پریشان تھے۔

ظاہر ہے' ایسا نہیں ہے۔ یہ لوگ تو خود اپنے ملکوں میں نماز روزہ کی آزادی دیتے ہیں۔ مسلمانوں نے امریکہ میں مسجدیں بنالیں' چرچ خرید کر انہیں مسجد بنالیا۔ انہوں نے نہیں روکا' اس لیے کہ مذہب سے اُن کی کوئی جنگ نہیں ہے۔ اُن کی جنگ اسلام کے اجتماعی نظام' خلافت کے خلاف ہے۔ اُن کے لیے خطرہ اسلام کا معاشی وسماجی نظام ہے جو انہیں کسی طرح بھی گوارا نہیں ہے۔ آج پوری دنیا میں اُن کے سیکولر نظام کا راج ہے۔ ہر جگہ سود کی بنیاد پر بنکاری نظام چل رہا ہے۔ مغربی تہذیب نے غیرت وحمیت اور حیا کا جنازہ نکال دیا ہے۔ اگرچہ عالم اسلام میں شرم وحیا کی اقدار کسی قدر بچی ہوئی ہیں' مگر مغربی فکر اور تہذیب جس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے' اندیشہ ہے کہ رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے گی۔

## تصویر کا روشن رُخ

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ یہ اُس کا تاریک پہلو ہے۔ دوسری جانب تصویر کا روشن اور تابناک پہلو بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے جو احادیث رسولؐ سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ احادیث کی پیشین گوئیوں کے مطابق دنیا کے خاتمے سے قبل کل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب آ کر رہے گا' جیسے کہ حضور ﷺ نے اپنے بابرکت دور میں اپنے دست مبارک سے غالب کیا تھا۔ اس سلسلہ میں احادیث ملاحظہ کیجیے جن میں غلبۂ اسلام کی بشارت دی گئی ہے۔ حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَذُلِّ ذَلِيْلٍ ــــ اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا)) ــ قُلْتُ: "فَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ"(۱)

''دنیا میں نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا' خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ (یعنی) یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی فرماں برداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' میں (راوی) نے کہا: تب تو سارے کا سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے گا۔

(۱) مسند احمد، باقی مسند الانصار، حدیث المقدادبن الاسود، ح ۲۲۶۹۷

دوسری روایت ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا، فَيَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ثُمَّ سَكَتَ (۱)

''دورِ نبوت تم میں اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا اس کو ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کی طرز پر خلافت کا دور ہوگا۔ پھر وہ دور رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کر دے گا جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت ہوگی۔ وہ دور بھی اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا۔ پھر جبر کی فرماں روائی ہوگی' وہ رہے گی جب تک اللہ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کر دے گا جب وہ اسے ختم کرنا چاہے گا۔ پھر نبوت کے طرز پر دوبارہ خلافت قائم ہوگی۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔

غلبۂ اسلام کے ضمن میں بعض اشارات بھی آئے ہیں کہ اس کا نقطۂ آغاز کون سا خطہ ہوگا۔ حدیث کے مطابق عرب کی کسی مشرقی سمت سے لوگ سیاہ علم لے کر آئیں گے' اور ان کو کوئی نہیں روک سکے گا' یہاں تک کہ وہ جھنڈے ایلیا میں جا کر نصب ہو جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد افغانستان اور پاکستان کے ممالک ہوں۔ بہرحال ہمارا کام یہ ہے کہ دین کے غلبہ واقامت کے لیے اپنا تن من دھن لگا دیں۔ یہ کام ہمیں ہر حال میں کرنا ہے۔ ہمیں اللہ کے دین کو غالب کر کے دنیا کے سامنے اس کی ایک عملی شکل پیش کرنی ہے' تاکہ شہادت علی الناس کا وہ فریضہ ادا ہو سکے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ہم پر بحیثیت امت عائد ہوا تھا۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(۱) رواہ احمد' مرویات حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ۔

خطبۂ دوم

# آنحضور ﷺ پر نبوت اور رسالت کی تکمیل

خطبۂ مسنونہ‘ تلاوتِ آیاتِ قرآنی ☆‘ احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد!

معزز حاضرین اور محترم خواتین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آج مجھے جس موضوع پر گفتگو کرنا ہے‘ اس کے مختلف اجزاء پر میں پہلے بھی کئی مرتبہ گفتگو کر چکا ہوں۔ آج کی نشست میں میری کوشش ہوگی کہ ان اجزاء کو سمو کر ایک وحدت کی صورت میں پیش کروں‘ تاکہ ایک مکمل مضمون اپنے صغریٰ کبریٰ اور نتائج وعواقب سمیت آپ کے سامنے آ جائے۔ میری کوشش یہ بھی ہوگی کہ اپنی گزارشات جوشِ خطابت کی بجائے دھیمے انداز میں اور دو اور دو چار کی طرح آپ کے سامنے رکھوں‘ تاکہ وہ بآسانی آپ کے ذہن نشین ہو جائیں اور آپ انہیں گنتی کے طور پر یاد کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس کی توفیق عطا فرمائے۔

## عقیدۂ ختم نبوت کے دو پہلو

نبی اکرم ﷺ پر نبوت ورسالت کا خاتمہ ہمارے ایمان کا جزو لاینفک ہے۔ اسے ایمان سے کسی طور بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عقیدہ اُمتِ مسلمہ کی تاسیس وبنیاد ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جس سے ایک بہت اہم قانونی وفقہی اور شرعی حکم ملتا ہے۔ علماء دین نے اس کو اجاگر کرنے میں خوب محنت کی۔ اس کام کے لیے اپنی زندگیاں صرف کیں۔ دوسرا پہلو وہ ہے جو زیادہ تر علمی نوعیت کا ہے۔ اس سے کوئی فقہی حکم تو نہیں ملتا‘ البتہ نبی اکرم ﷺ کا انبیاء ورسل میں جو مقام ومرتبہ ہے‘ اس کی اصل اساس واضح ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ اہم تر بات ہوگئی‘ لیکن چونکہ یہ علمی بات ہے‘ اس میں کوئی فقہی پہلو نہیں ہے‘ لہٰذا اس پر توجہ کم ہوئی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ختم نبوت کے یہ دونوں پہلو لفظ ''ختم'' کے اندر ہی موجود ہیں۔ ''ختم'' کا لفظ اردو اور عربی دونوں زبانوں میں دو معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کوئی شے پہلے موجود تھی‘ مگر اب نہیں رہی تو کہیں گے کہ ختم ہوگئی ہے۔ مثلاً آٹا ختم ہوگیا‘ چینی ختم ہوگئی‘ پیسے ختم ہوگئے وغیرہ۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ کوئی شے تدریجاً ترقی کرتے ہوئے مکمل ہوگئی۔ جیسے ایک طالب علم کہتا ہے کہ میں نے اپنا کام ختم کر لیا۔ یا جیسے آرمی میں کسی گروپ کو کوئی

☆ الاحزاب: ۴۰‘ التوبۃ: ۳۳‘ الفتح: ۲۸‘ الصف: ۹‘ سبا: ۲۸‘ الانبیاء: ۱۰۷‘ الاعراف: ۱۵۸

خاص اسائنمنٹ دی جائے' تو اُس کام کو کامیابی سے انجام دینے کے بعد گروپ لیڈر اپنے کمانڈر سے کہتا ہے: mission accomplished۔ جو فریضہ ہمارے ذمہ عاید کیا گیا تھا' وہ ہم نے پورا کر لیا' ہم نے اپنا کام ختم کر دیا۔ یہاں ختم سے مراد تکمیل ہے یعنی کسی شے کا تدریجاً ترقی کرتے ہوئے اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جانا اور کامل ہونا۔ ختم کے پہلے معنی کے اعتبار سے ختم نبوت کا مفہوم یہ ہے کہ نبوت پہلے تھی' اب نہیں ہے۔ یعنی نبوت کا دروازہ پہلے کھلا تھا' اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ چنانچہ جس کسی نے بھی حضور ﷺ کے زمانے میں یا آپؐ کے بعد دعویٰ نبوت کیا یا آئندہ کرے' وہ ملت اسلام سے خارج ہے۔ وہ کافر اور مرتد ہے' چاہے بظاہر وہ بڑا موحد ہو' نمازی اور روزے دار ہو' تقویٰ کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہو' عالم اور فلسفی ہو۔ اور جس نے اس کی تصدیق کی وہ بھی کافر ہے۔ اور چونکہ اسلامی ریاست میں مرتد واجب القتل ہے' لہٰذا اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ یاد رہے کہ مرتد کا حکم اسلام سے پھرنے والے پر لگے گا۔ اگر کوئی یہودی عیسائی ہو جائے یا ہندو عیسائیت اختیار کر لے تو اُن سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ یہ چونکہ بہت اہم معاملہ ہے' لہٰذا اس پہلو پر علماء نے بہت توجہ صرف کی ہے۔

## عقیدۂ ختم نبوت پر قرآنی دلائل

عام طور پر ختم نبوت کے حوالے سے علماء کرام قرآن مجید سے صرف ایک آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ یہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۴۰ ہے۔ ختم نبوت کے موضوع پر ہونے والی تقریریں اور خطبات میں یہ بالعموم پیش کی جاتی ہے۔

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ﴾

''محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں بلکہ اللہ کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اس کو ختم کر دینے والے) ہیں۔''

یہ آیت اور ماقبل آیات بنیادی طور پر حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے حوالے سے ہیں اور ایک قبیح رسم کی بیخ کنی سے متعلق ہیں۔ عرب میں منہ بولے بیٹے کی روایت چلی آتی تھی۔ اس روایت میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اگر منہ بولے بیٹے کا انتقال ہو جائے' یا وہ اپنی کسی بیوی کو طلاق دے دے تو اس کی بیوی اُس کے منہ بولے باپ پر حرام رہتی تھی۔ وہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا تھا۔ قرآن اس روایت کو توڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ تعلیم دی گئی کہ منہ بولا باپ باپ نہیں۔ چنانچہ ان آیات کے نزول کے بعد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جنہیں حضور ﷺ نے اپنا منہ بولا

بیٹا بنایا تھا' اور لوگ انہیں زید بن محمد کہنے لگے تھے' دوبارہ زید بن حارثہ کہلانے لگے۔ دوسرے یہ کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح جائز ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی شادی کرائی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا انہیں پسند نہیں کرتی تھیں' اس لیے کہ وہ غلام رہ چکے تھے' اور عرب میں وہ شخص جو کبھی غلام رہا ہو' چاہے بعد میں آزاد ہو گیا ہو' کم تر درجے میں رہتا تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنی ہاشم کی خاتون تھیں۔ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ میرے قابل نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے فرمانے پر انہوں نے شادی تو کر لی' مگر دل سے انہیں پوری طرح قبول نہ کیا۔ جو ادب واحترام اور عزت شوہر کی کرنی چاہیے تھی وہ نہ کر پائیں۔ چنانچہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے مجبور ہو کر کہا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ یہ بات حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو سمجھایا کہ پہلے تو میں نے ان پر زور دے کر تم سے شادی کرائی' اب تم طلاق دے کر انہیں زخم نہ لگاؤ۔ لیکن میاں بیوی کے معاملات ایسے تھے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے طلاق کے سوا کوئی چارہ نہ سمجھا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی۔ اب حضور ﷺ نے گمان یہ کیا کہ پہلے تو زینب کی شادی اُن کی مرضی کے خلاف ہوئی' اب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے انہیں طلاق دے دی' اور اس طرح اُن کے ساتھ زیادتی ہو گئی اور اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ میں خود ان سے نکاح کر لوں۔ لیکن اس معاملے میں عرب کا رواج آڑے آ رہا تھا۔ اس رواج پر ضرب کاری اسی طور سے لگ سکتی تھی کہ آپ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کرتے' ورنہ یہ رواج کبھی ختم نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ ہیں۔ آپ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا' جو آ کر اس رواج کو ختم کر دیتا۔ یہ ہے ختم نبوت سے اس آیت کا ربط۔ البتہ اس آیت کے بارے میں دو باتیں مزید عرض کر دوں۔ ایک یہ کہ اس میں جو ''خاتم'' کا لفظ آیا ہے اس کی دونوں قراءتیں ہمارے ہاں مصدقہ ہیں' خاتِم بھی اور خاتَم بھی۔ میں نے خاتَم النبیین پڑھا۔ لیکن دوسری متواتر قراءتوں میں یہ لفظ خاتِم کے طور پر بھی آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ خاتَم کے معنی مہر کے ہیں۔ مہر کے دو کام ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ آخری اتھارٹی کی طرف سے تصدیق ہوتی ہے۔ اسی کو مہر تصدیق ثبت کرنا کہتے ہیں۔ دوسرے' یہ کسی شے کو اس طور سے ختم کرتی ہے کہ اس میں ردوبدل نہ ہو سکے۔ یہ سربمہر کرنا ہے۔ مثلاً کوئی شاہی فرمان اگر رازدانہ طریقے سے کہیں بھیجنا ہو تو اِس اندیشہ کے پیش نظر کہ ایلچی خط کو لے جاتے ہوئے پڑھ نہ لے' اُسے سربمہر کر دیا جاتا ہے۔ اب خط کو پڑھنے کا اس کے سوا کوئی راستہ ممکن نہیں ہوتا کہ ایلچی مہر کو توڑ دے اور پھر کھول کر پڑھے۔ اسی

بنیاد پر قادیانیوں نے ختم نبوت کی یہ توجیہہ کی اور لوگوں کو الجھایا کہ ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اب جو بھی نبی آئے گا' آپؐ کی مہر سے آئے گا۔

عقیدۂ ختم نبوت کے حوالے سے اب میں آپ کے سامنے ایک دوسری آیت پیش کر رہا ہوں جو عام طور پر اس ضمن میں پیش نہیں کی جاتی۔ یہ سورۂ آل عمران کی آیت ۸۱ ہے۔فرمایا:

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾﴾

''اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں' پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی اور (عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ لیا (یعنی مجھے ضامن ٹھہرایا) انہوں نے کہا (ہاں) ہم نے اقرار کیا۔ (اللہ نے) فرمایا کہ تم (اس عہد و پیمان کے) گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔''

ایک میثاق تو وہ ہے جو عالم ارواح میں تمام ارواحِ انسانی سے لیا گیا۔ اس میں انبیاء و رسل کی ارواح بھی شامل تھیں۔ یہ میثاق بندگی ہے۔ اللہ نے پوچھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں'' ﴿قَالُوْا بَلٰى﴾ (الاعراف: ۱۷۲) ''(تمام ارواح انسانیہ نے) کہا' کیوں نہیں (اے اللہ تو ہی ہمارا رب ہے۔ ہم تیری ہی بندگی کریں گے۔)'' لیکن انبیاء و رسل سے ایک اور میثاق بھی لیا گیا' اور وہ یہ تھا کہ جب دنیا میں تمہارے پاس میری ہدایت آئے تو اُس کی پیروی کرنا اور اپنے بعد آنے والے اور نبی اور رسول کے بارے میں اپنی قوم کو آگاہ کرنا اور اس سے عہد لے کر جانا کہ وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے۔ یہ نہیں کہ بس لکیر کے فقیر ہو گئے کہ ہم نے تو ایک نبی اور رسول کو مانا ہوا ہے' اب کسی اور کو نہیں مانیں گے۔ اسی میثاق کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو بالکل واضح انداز میں حضور نبی کریم ﷺ کی آمد کی خبر دی۔ آپؑ نے اپنے آخری ایام میں اپنے حوارین سے فرمایا: ''مجھے تم سے ابھی اور بھی بہت سے باتیں کہنی تھیں لیکن ابھی تم ان کا تحمل نہیں کر سکو گے۔ جب میرے بعد وہ فارقلیط آئے گا تو وہ تمہیں سب باتیں بتائے گا''۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد کی

پیشین گوئی تھی۔ ''فارقلیط'' کے معنی اُس ہستی کے ہیں جس کی تعریف کی جائے۔ آپؐ کے اسم گرامی ''محمدؐ'' کے یہی معانی ہیں۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مصداق صرف اور صرف حضور ﷺ ہیں۔ عیسائی علماء کے حلق سے ''فارقلیط'' کا یہ لفظ نہیں اُترتا۔ انہوں نے اس کے کئی معانی مراد لیے ہیں اور ہیرا پھیری کی کوشش کی' تاکہ کسی طور سے اس کا مصداق پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کو قرار دینے سے بچا جا سکے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس پیشین گوئی کا مصداق آپؐ کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس بات پر غور کیجیے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے کیے گئے میثاق کے تحت اپنے بعد میں آنے والے نبی کی آمد کی خبر دے دی۔ اگر نبوت کا سلسلہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو کیا میثاق النبیین کے تحت آپؐ بھی اپنے بعد میں آنے والے نبی کی آمد کی خبر نہ دیتے۔ یقیناً آپؐ بھی ضرور یہ خبر دیتے اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ بتاتے بلکہ اُن سے یہ عہد لیتے کہ اُن پر ایمان لانا۔ آپؐ نے اپنے بعد کسی نبی اور رسول کی آمد کی پیشین گوئی نہیں فرمائی بلکہ اس کے برعکس آپؐ نے نبوت و رسالت کے خاتمے کی خبر دی۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت پر ضرب لگانے والوں کے خلاف حضور ﷺ کے دور ہی میں اعلان جنگ کیا گیا۔ عہد نبوی میں بعض مدعیان نبوت اُٹھ کھڑے ہوئے تو ان کو کافر مانا گیا اور ان کے خلاف جنگ کی گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی مدعیان نبوت کا بہت بڑا فتنہ اُٹھا۔ ان کے خلاف بھی جنگیں کی گئیں اور ان کو قتل کیا گیا۔ تو اس بات پر ابتداء اسلام سے اجماع چلا آرہا ہے کہ حضور ﷺ خاتم النبیین ہیں۔

## عقیدۂ ختم نبوت احادیث کی رو سے

آپؐ کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں آئے گا۔ اس موضوع پر بہت سی احادیث بھی آئی ہیں۔ ان میں سے صرف دو احادیث ملاحظہ کیجیے۔ ایک روایت ترمذی کی ہے اور یہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّهُ سَيَكُونُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُونَ كَذَّابُونَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي)) (۱)

''میری اُمت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے۔ ہر ایک کا یہی دعویٰ ہوگا کہ وہ نبی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔''

(۱) سنن الترمذی' ح:۲۲۱۹۔ راوی ثوبانؓ۔

دوسری حدیث صحیح بخاری کی ہے اور یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُبْعَثَ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ قَرِيْباً مِنْ ثَلَاثِيْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ أَنَّهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ))(۱)

''اس وقت تک قیامت نہ ہوگی جب تک تقریباً تیس جھوٹ بولنے والے دجال پیدا نہ ہوں گے اور اُن میں سے ہر ایک کا یہی دعویٰ ہوگا کہ میں اللہ کا رسول اور پیغمبر ہوں۔''

**ایک اہم نکتہ:** میں یہاں ایک نکتہ بیان کر رہا ہوں جو اس سے پہلے میں نے کبھی بیان نہیں کیا ہے۔ آج ہی میرا ذہن اس طرف متوجہ ہوا ہے۔ علمائے کرام کا سب سے زیادہ زور ختم نبوت سے متعلقہ احادیث کے بیان پر رہا ہے۔ لیکن اُن سے ایک کمی رہ گئی۔ وہ انبیاء کرام میں نبی اکرم ﷺ کے عظیم مرتبے اور خاتم النبیین کی حیثیت کے عقلی پہلو پر پوری توجہ نہ کر سکے۔

بدقسمتی سے سرسید احمد خان کے زمانے سے امت میں ایک بہت بڑا فتنہ شروع ہو چکا تھا کہ احادیث نبویہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، بس قرآن ہی حجت ہے۔ اور جب حدیث کی روک ٹوک ختم ہوگئی تو جو جی میں آیا قرآن کی تفسیر کی جانے لگی۔ ظاہر ہے، جب حدیث وسنت کو حجت نہیں مانا جائے تو پھر حدیث قرآن پر اضافہ ہی شمار ہوگی۔ حالانکہ اس کے بغیر قرآن اور اسلام کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ اس کے بغیر دین وشریعت کی واضح شکل سامنے آ ہی نہیں سکے گی۔ حدیث وسنت کو ایک طرف رکھ دیں گے تو پھر نماز بھی ایک نہیں رہے گی۔ اس لیے کہ قرآن میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ فرض نمازوں کی تعداد پانچ ہے۔ اسی طرح ان کے اوقات نہیں دیئے گئے۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ ظہر کی چار رکعات فرض ہیں۔ عصر کے چار فرض ہیں، فجر کے دو فرض ہیں، مغرب کے تین اور عشاء کے چار فرض ہیں۔ قرآن سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ نماز میں اتنی رکعات سنت ہیں، اور سنتوں میں فلاں مؤکدہ اور فلاں غیر مؤکدہ ہیں۔ یہ سارا نظام ہمیں سنتِ رسولؐ نے عطا کیا ہے۔ حدیث وسنت کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے یہ چھوٹی سی مثال ہی کافی ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ جب حدیث وسنت کے بغیر نماز ہی کا نظام قائم نہیں ہوسکتا تو دین کا پورا نظام کیسے تشکیل پائے گا۔ لہٰذا یہ فتنہ استخفاف وانکار حدیث دین کے خلاف بہت بڑی بغاوت ہے۔ اس نے بہت خطرناک نتائج پیدا کیے ہیں۔ اگرچہ سرسید احمد خان مسلمانوں کے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة۔

ساتھ بہت مخلص تھے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھ کر وہ بہت بے تاب رہتے تھے۔ انگریزی دور میں ہندو ترقی کر رہے تھے' جبکہ مسلمان ہر میدان میں پیچھے تھے۔ انگریز سوچی سمجھی سکیم کے تحت انہیں پیچھے ہٹا رہے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی ہے' انہیں ڈر تھا کہ اِن کے اندر بغاوت کے جراثیم موجود رہیں گے' ان کو دبانا ضروری ہے' ورنہ یہ کسی بھی وقت ہمارے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ سرسید یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمانوں کی یہی حالت رہی تو وہ پسماندگی کی دلدل میں غرق ہو جائیں گے۔ اور اُس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ حالت برقرار رہتی تو ہندوستان میں اگلے سو برس کے دوران' مسلمان قصائی یا پلے دار ہی رہ گئے ہوتے۔ سرسید نے مسلمانوں کو شاہراہ ترقی پر لے جانے کی کوشش کی۔ اس پہلو سے اُن کی خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ ہماری یہ عادت ہے کہ جس سے نفرت ہو جائے اس کی ہر بات کو غلط کہتے ہیں اور جس سے محبت ہو اس کی ہر بات درست قرار دیتے ہیں۔ یہ روش صحیح نہیں ہے۔ کوئی بھی آدمی مکمل صحیح نہیں ہوتا اور نہ کوئی مکمل غلط ہوتا ہے۔ مکمل صحیح صرف اللہ کے رسول ہیں اور مکمل غلط عزازیل نامی شیطان لعین ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہونا چاہیے کہ بڑوں کے غلط افکار کی وجہ سے اُن کی صحیح بات بھی قبول نہ کی جائے' اور کسی کی عقیدت کی وجہ سے اُس کی غلط بات بھی رد نہ کی جائے۔ مجھے علامہ اقبال سے جو عقیدت ہے وہ آپ بخوبی جانتے ہیں' مگر ایسا نہیں ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے ان کی ہر بات مان لوں۔ اللہ نے اس چیز سے بچایا ہے۔ اسی طرح مجھے مولانا مودودیؒ سے جو اختلاف ہوا تو میں نے اسے برملا بیان کیا' مگر خواہ مخواہ اُن پر الزام تراشی نہیں کی' جیسے کہ ہمارے ہاں عام طور پر مولویوں کا وتیرہ ہے کہ جس سے کوئی دوری ہوگئی' اُس پر اینٹ' روڑہ' پتھر جو ہاتھ میں آیا' دے مارا۔ بہرکیف سرسید کی خدمات سے ہمیں انکار نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے برصغیر میں اسلام کو سخت نقصان پہنچایا۔ ہندوستان میں انکارِ حدیث اور استخفافِ سنت کے فتنے کی اصل جڑ بنیاد سرسید احمد خان ہے۔ اور کوئی دوسرا اس قابل تھا ہی نہیں کہ اس فتنے کو شروع کر سکتا۔ سرسید کا بڑا مقام تھا۔ وہ بہت بڑا عالم تھا۔ علماء دیوبند کے چوٹی کے لوگوں کا ہم سبق تھا۔ اس فتنے کے بہت دور رس نتائج نکلے۔ سرسید کے قائم کردہ علی گڑھ کالج سے' جسے بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا درجہ دے دیا گیا' جو لوگ تعلیم حاصل کر کے نکلے زیادہ تر وہی مسلم لیگ کے لیڈر ہوئے۔ وہی سول سروس میں گئے اور قیامِ پاکستان کے بعد وہی یہاں حاکم ہو گئے۔ اس بنا پر ہمارے معاشرے پر اس فتنہ کے

گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن یہ تو بعد کی بات ہے' اس سے پہلے اس کا جو نتیجہ فوری طور پر نکلا وہ یہ تھا کہ جب غلام احمد قادیانی نے اِن احادیث نبویہ کی نفی کرنی شروع کی' تو اس کا عام جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں کوئی ردعمل پیدا نہیں ہوا۔ پھر یہ کہ مرزا قادیانی نے قرآن مجید میں آنے والے الفاظ ''خاتم النبیین'' کی اپنے انداز سے شرح کر کے ایک بے یقینی کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ اس کا جواب بھی قرآن سے آنا چاہیے تھا' مگر افسوس کہ نہیں آیا۔

## اِتمام و اِکمالِ نبوتِ محمدیؐ

اللہ کرے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں یہ بہت بڑے پیمانے پر علماء کرام تک پہنچے' اور وہ اس پر توجہ کریں۔ اس لیے کہ اس سے حضورﷺ کا مقام و مرتبہ صحیح طور پر متعین ہوتا ہے۔ بات کیا ہے؟ یہ کہ نبی اکرمﷺ پر نبوت اور رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں ہوا' بلکہ اتمام اور اکمال بھی ہوا ہے۔ یہی نہیں ہوا کہ نبوت ہموار طریقے سے چلے آ رہی تھی اور ایک جگہ آ کر ختم ہوگئی بلکہ یہ بھی ہے کہ یہ تدریجاً ترقی کرتے ہوئے اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ ختم نبوت کے حوالے سے اتمام اور اکمال نبوت کا پہلو زیادہ نمایاں نہ ہونے کی وجہ سے غلام احمد قادیانی نے بڑی ہوشیاری سے یہ بات کہی کہ وحی و نبوت تو رحمت ہے اور رحمت کیسے بند ہوسکتی ہے؟ وہ تو جاری رہے گی اور اگر جاری رہے گی تو میں نبی ہوں' میرے دعویٰ نبوت کو تسلیم کرو۔ ظاہر ہے' عام آدمی کے لیے' جس نے دین نہ پڑھا ہو' عربی زبان سے آگاہی حاصل نہ کی ہو' یہ باتیں بڑی متاثر کن ہوتی ہیں۔ مرزا قادیانی نے یہ گمراہ کن پروپیگنڈا بھی کیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے رسولِ محبوب تو زمین کے نیچے دفن ہوگئے اور حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمان پر اُٹھا لیے گئے ہوں۔ عام آدمی آج بھی یہ بات سنے گا تو چونک جائے گا کہ ہاں' یہ تو صحیح بات ہے۔ حضورﷺ کا رتبہ تو سب سے بلند ہے اور وہ تو زیرِ زمین دفن ہیں پھر عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر کیسے اُٹھا لیے گئے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں نے ناواقف لوگوں میں اثر پیدا کیا اور جب اُن کے ذہنوں میں علماء اور اپنے اسلاف کے بارے میں ایک گھٹیا رائے قائم ہوگئی تو اب وہ ایک ایسے جہاز کی مانند ہوگئے جس کا لنگر کٹ گیا ہو۔ اب کوئی بھی زوردار لہر آئے گی اور اُسے بہالے جائے گی۔ بے لنگر کا جہاز کا محاورہ ہمارے ہاں اسی لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہر فتنہ جو اُٹھتا ہے وہ پہلے پہل لوگوں کو اپنے اسلاف سے کاٹتا ہے۔ اُن کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ اسلاف بات کو صحیح طور سے سمجھ نہ سکے۔ اصل بات تو اب سامنے آئی ہے' اور یہ بات بتانے والے مجدد کامل ہیں' بلکہ معاذ اللہ یہ اللہ کے نبی ہیں۔

## اِتمام واِکمالِ نبوتِ محمدیؐ اور آپؐ کا مقصدِ بعثت

اتمام واکمالِ نبوت کے حوالے سے قرآن حکیم کی وہ آیت بہت اہم ہے جو آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت ''اظہارِ دینِ حق'' کے حوالے سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ تین مقامات پر آئی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ......﴾

''وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) دے کر اور دین الحق کے ساتھ' تاکہ وہ اُسے پورے کے پورے دین پر غالب کریں۔''

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ادبیت کا تقاضا یہ ہے کہ کلام میں تکرار نہ ہو۔ ایک ہی بات اگر آپ دوبارہ کہہ رہے ہیں تو بہتر ہے کہ ذرا اسلوب بدلیں ورنہ سامعین بور ہو جائیں گے۔ بقول مرزا غالب ع اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں۔ قرآن مجید میں غلبۂ دین کا مضمون بھی کئی بار آیا ہے' مگر اندازِ بیان میں تنوع ہے۔ دین کو غالب کرنے کے حوالے سے یہاں اظہار دین علی الدین کلہ کے الفاظ آئے ہیں۔ کسی جگہ اقامتِ دین کے الفاظ آتے ہیں۔ کہیں اِس کے لیے ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ کے اور کہیں ﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔

قرآن مجید کا اسلوب ہے کہ اہم ترین مضامین بار بار آتے ہیں' تاکہ ان پر خصوصی توجہ مرکوز کی جائے' اُن پر مائیکروسکوپ لگائی جائے۔ آپؐ کے مقصد بعثت ''اظہار دین الحق علی الدین کلہ'' کا مضمون جیسا کہ پیچھے واضح کیا گیا قرآن مجید میں تین جگہ آیا ہے۔ یعنی سورۃ الصّف: ۹' سورۃ الفتح: ۲۸' سورۃ التوبۃ: ۳۳ میں۔ سورۃ الصف اور سورۃ التوبہ میں تو بالکل ایک جیسے الفاظ آتے ہیں' البتہ سورۃ الفتح میں آیت کے آخری الفاظ ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کی جگہ ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ آئے ہیں۔ تو یہ ہے وہ عظیم مشن جو حضرت محمد ﷺ کو دیا گیا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آپؐ کے پیش نظر دین کی صرف تبلیغ ہی نہیں تھی' دین کو قائم کرنا بھی تھا۔ یہ نہیں کہ ہم نے پیغام رب پہنچا دیا' اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ نہیں' بلکہ آپؐ کو دین کو بالفعل قائم بھی کرنا تھا۔ اور یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تبلیغ دین اور اقامت دین میں بہت بُعد اور فاصلہ ہے۔ ع زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!

''اظہار دین الحق علی الدین کلہ'' کے الفاظ قرآن حکیم میں صرف نبی کریم ﷺ کے لیے آئے ہیں۔ آپؐ کے علاوہ دوسرے کسی رسول اور نبی کے لیے یہ الفاظ نہیں آئے۔ یہاں تک

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ابو الانبیاء ہیں، خلیل اللہ ہیں، امام الناس ہیں، اُن کے لیے بھی یہ الفاظ نہیں آئے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ انبیاء کی کچھ حیثیتیں تو سب میں مشترک ہیں۔ مثلاً تمام انبیاء اپنی جگہ پر روشنی کا چراغ تھے، داعی تھے، شاہد تھے، نذیر تھے۔ سورۃ الاحزاب میں حضور ﷺ کے لیے بھی یہی الفاظ آئے ہیں۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝﴾(الاحزاب) ''اے پیغمبرؐ، ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کی طرف بلانے والا اور چراغ روشن۔'' اگرچہ ان حیثیتوں میں ہر نبی اور رسول کا اپنا اپنا مقام ہے۔ حضور ﷺ ان پانچ باتوں میں بھی دوسروں سے بہت اونچے مقام پر ہیں۔ تاہم بنیادی طور پر یہ حیثیتیں تمام انبیاء ورسل کے درمیان مشترک ہیں، لیکن ''اظہار دین علی الدین کلہ'' کے الفاظ صرف نبی آخر الزماں ﷺ کے لیے آئے ہیں۔

آپؐ کے مقصد بعثت کے ذکر کے بعد دو جگہ تو ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ کے الفاظ آئے ہیں اور ایک جگہ فرمایا: ﴿وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝﴾ اس سے واضح فرما دیا کہ آپؐ کا یہ مشن جس قدر بھاری اور عظیم ہے، اسی قدر کفار اس کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے۔ مگر اس کام میں آپؐ کو اللہ کی مدد حاصل رہے گی۔ اللہ بطور مددگار آپؐ کے لیے کافی رہے گا۔

سورۃ الصّف اور سورۃ التوبہ کے ان دونوں مقامات سے پہلے ایک ایک ہم معنی آیت آئی، جن میں تھوڑا سا لفظی فرق ہے۔ سورۃ الصّف میں فرمایا: ﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ ''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ (کے چراغ) کی روشنی کو منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔'' اور سورۃ التوبہ میں الفاظ ہیں: ﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَی اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ دونوں جگہ ''یُرِیْدُوْنَ'' میں مستتر ضمیر فاعلی ''هُمْ'' یہود کی طرف راجع ہے کیونکہ اس سے پہلے انہی کا تذکرہ ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی تو چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، مگر اُن کی یہ خواہش ہرگز پوری ہونے والی نہیں ہے۔ اللہ بہر حال اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا، چاہے کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ یہی بات مولانا ظفر علی خان نے اپنے انداز سے یوں کہی تھی ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

## سیرۃ النبیؐ کا عمود

نبی ﷺ کے مقصد بعثت کے حوالے سے آنے والی یہ آیت قرآنی بہت اہم ہے۔ میں اپنے اسلاف میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو جامع ترین شخصیت سمجھتا ہوں۔ اُن کے بعد امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا نمبر آتا ہے۔ میرے نزدیک یہ دونوں شخصیات باہم مل کر شاہ ولی اللہ کے برابر ہیں۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ آیت پورے قرآن مجید کا عمود ہے۔ عمود سے آگاہی بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کسی کی بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی مراد سمجھی جائے کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ ایک خطیب جب خطبہ دیتا ہے تو اس میں بات کو سمجھانے کے لیے کئی مثالیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔ کئی ضمنی مباحث بھی بیان میں آ جاتے ہیں' مگر پورے بیان میں اہم ترین شے وہ مرکزی خیال ہوتا ہے جو معین ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک قرآن میں وہ معین مرکزی خیال یہ آیت ہے۔ اس آیت کے بارے میں شاہ صاحب کی یہ رائے ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کی اس آیت کی کس قدر خصوصی اہمیت ہے۔ اب میں بھی اس آیت کے بارے میں اپنی حقیر سی رائے پیش کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیت قرآن حکیم کا عمود ہو' نہ ہو' سیرۃ النبی ﷺ کا عمود ضرور یہی آیت ہے۔ سیرتِ مطہرہ کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا جب تک یہ آیت نہ سمجھ لی جائے۔ سیرت النبیؐ کا صحیح فہم اس آیت کی مدد سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہی آیت اُس عظیم مشن کے بارے میں بتاتی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے حوالے کیا گیا۔ یہ مشن آپؐ نے کیسے پورا کیا' اس کے لیے آپؐ نے کیا طریقہ اختیار کیا' آپؐ کن مراحل سے ہو کر گزرے' اِن ساری چیزوں میں ایک منطقی ربط اور تسلسل تبھی نظر آئے گا جب یہ آیت آپ کے سامنے ہو۔ یہ آیت سامنے نہیں ہوگی تو آپ سیرت کی بہت سی باتیں اور پہلو سمجھ نہیں پائیں گے۔ مثلاً آپؐ کی حیات طیبہ کے مکی دور میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ چاہے تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں' تم ہاتھ نہ اُٹھاؤ' تمہیں جوابی کارروائی کی ہرگز اجازت نہیں ہے' مگر جب آپؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو اس کے بالکل برعکس صورت ہوگئی۔ یہاں آپؐ نے غزوات کا آغاز فرما دیا۔ اسی طرح یہ بات بھی سمجھ نہیں آئے گی کہ نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر قریش کے ساتھ دب کر صلح کی تھی مگر اس صلح کے ایک ہی سال بعد جب قریش کا سردار ابوسفیان مدینہ آیا ہے تو آپؐ اس کی بات بھی نہیں سن رہے تھے۔

اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کر دوں۔ ۱۹۸۵ء کی بات ہے' انڈیا کے عالم دین

مولانا وحید الدین خان جو اپنے افکار کی وجہ سے حکومت ہندوستان کے چہیتے اور آر ایس ایس اور بی جے پی کی آنکھوں کا تارا ہیں' جامع القرآن قرآن اکیڈمی تشریف لائے۔ میری دعوت پر وہ اکیڈمی کے ہال میں تنظیم اسلامی کے رفقاء سے خطاب کر رہے تھے۔ اپنے خطاب میں اُن کا سارا زور اس نکتہ پر تھا کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے صلح سے ہوتا ہے' لڑائی سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دلیل پر دلیل دیئے جا رہے تھے۔ میں تنظیم اسلامی کا امیر تھا اور صدر مجلس کی حیثیت سے میں نے طے کیا تھا کہ میں کوئی بات نہیں کروں گا' بس یہ مقرر ہیں اور یہ میرے سامعین اور رفقاء تنظیم۔ میرے فکر میں کوئی غلطی ہو تو یہ ان کے سامنے پیش کر دیں' اور صحیح ہو تو اس کی تائید کر دیں۔ مولانا وحید الدین نے جب اپنی تقریر ختم کی تو میں نے اُن سے اجازت لے کر ایک سوال کیا کہ اگر جنگ اتنی ہی بری اور صلح اتنی ہی اچھی شے ہے' جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں تو پھر یہ بتایئے کہ صلح حدیبیہ ٹوٹ جانے کے بعد جب قریش کا سردار ابوسفیان یہ درخواست لے کر مدینہ آیا کہ آپؐ صلح کی تجدید کر دیں تو آپؐ نے اس کی تجدید کیوں نہیں فرمائی؟ میرا سوال سن کر وہ مبہوت ہو گئے۔ ان کا انگریزی زبان میں جواب صرف یہ تھا "No Comments"۔

مغربی مؤرخ ٹائن بی بھی آپؐ کے مقصد بعثت کو نہ سمجھ سکا۔ اسی بنا پر آپؐ کی حیات طیبہ کے مکی اور مدنی دور کے بارے میں اُس نے کہا: "Muhammad failed as a Prophet but succeeded as a statesman." اُسے مکے کا محمد ﷺ نبیوں کی طرح کا نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ اس دور میں آپؐ کی زندگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نقشہ ہے۔ آپؐ لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ کھڑے ہو کر وعظ کر رہے ہیں۔ کسی نے گالی دی تب بھی خاموش ہیں' بلکہ اُسے دعائیں دے رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے (نعوذ باللہ) آپؐ کو جنون کا عارضہ ہو گیا ہے۔ کوئی شاعر اور کوئی ساحر قرار دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ کذاب ہیں' کسی اور سے ڈکٹیشن لیتے ہیں اور آ کر ہم سے کہتے ہیں کہ مجھ پر وحی آئی۔ یہ سب باتیں آپؐ سن رہے ہیں مگر کسی کو کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں۔ ٹائن بی کے نزدیک' آپؐ کی یہ درویشی معاذ اللہ ناکامی ہے۔ اس کے برعکس مدینہ والے محمد ﷺ تو پہلے دن سے سپہ سالار ہیں' ہیڈ آف دی سٹیٹ ہیں' اور اس حیثیت سے بھرپور کامیاب ہیں۔ منٹگمری واٹ نے بھی اس سوچ کی بنیاد پر سیرت پر دو کتابیں لکھیں۔ "Muhammad at Makkah" اور "Muhammad at Madina" لیکن اس میں جو اصل زہر پوشیدہ ہے' وہ یہ خیال ہے کہ (معاذ اللہ) آپؐ کی سیرت کے مکی اور مدنی ادوار میں تضاد پایا ہے۔ مکی دور میں آپؐ کچھ اور ہیں اور مدنی دور میں کچھ اور۔ اس طرح کے اشکالات کو

صرف اس آیت کے حوالے سے رفع کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ بات معلوم ہو کہ آپؐ کا مقصد بعثت غلبۂ دین تھا، محض تبلیغ نہیں تھا، تو آپؐ کے حیاتِ طیبہ کے مکی اور مدنی ادوار میں کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا اور نہ ہی کوئی غلط فہمی ہوگی۔ اگر محض تبلیغ مقصود ہوتی تو یقیناً آپؐ کا ایک ہی طرزِ عمل ہوتا، لیکن چونکہ آپؐ کو دین قائم کرنا اور انقلاب برپا کرنا تھا، لہٰذا آپؐ درجہ بدرجہ آگے بڑھے۔ اگر مقصد بعثت پیش نظر ہوگا تو ہر انصاف پسند آدمی یہی کہے گا کہ آپؐ مختلف مراحل طے کرتے ہوئے غلبۂ دینِ حق کے ہدف کی طرف بڑھ رہے تھے۔

بہرحال نبوت و رسالت کئی ہزار سالوں کے دوران رفتہ رفتہ اور تدریجاً ارتقاء کے مراحل طے کر رہی تھی تا آنکہ آپؐ کی ذاتِ مبارک میں اپنے نقطۂ تکمیل یا نقطۂ عروج و کمال کو پہنچ گئی۔ چنانچہ ختم نبوت کے حوالے سے دونوں پہلو پیش نظر رہنے چاہئیں۔ یہ بات بھی کہ آپؐ پر نبوت و رسالت ختم ہوگئی، اب کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا، اور یہ بات بھی کہ آپؐ پر نبوت و رسالت اور ہدایت کامل اور مکمل ہوگئی۔ اسی لیے ہم اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ذکر میں تکمیل، اتمام اور اکمال کے الفاظ آتے ہیں۔ چنانچہ تکمیل دین کی آیت میں فرمایا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (المائدہ:۳)

''آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔''

اسی طرح اُس آیت میں جس کا پیچھے ذکر ہوا ہے، فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾

''اور اللہ اپنے نور کا اتمام کرنے والا ہے، خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔''

سورۃ التوبۃ میں فرمایا:

﴿وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۳۲﴾

''اور اللہ اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں، اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔''

حضور ﷺ کی ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) (۱)

---

(۱) مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب الرّفق والحیاء و حسن الخلق۔

’’مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اخلاق کی جو بلندیاں ہیں‘ ان کو مکمل کر دوں۔‘‘

تکمیل نبوت و رسالت کے ضمن میں ایک حدیث صحیح بخاری و مسلم میں آتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ مَثَلِي وَمَثَلَ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى بَيْتًا فَأَحْسَنَهُ وَأَجْمَلَهُ إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِيَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوفُونَ بِهِ وَيَعْجَبُونَ لَهُ وَيَقُولُونَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ قَالَ فَأَنَا اللَّبِنَةُ وَأَنَا خَاتِمُ النَّبِيِّينَ)) (۱)

’’میری مثال اور ان پیغمبروں کی مثال جو مجھ سے پہلے گزر گئے‘ ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک مکان بنایا اور اس کو بہت عمدہ اور خوشنما بنایا۔ اس کے ایک گوشہ میں صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ جب اس مکان میں جاتے تو تعجب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ کیوں نہیں رکھی گئی؟ آپؐ فرماتے تھے کہ وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔‘‘

## نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیل نبوت ورسالت کے مظاہر

اب آیئے‘ اس بات پر غور کریں کہ آپؐ کی ذات مبارکہ پر نبوت و رسالت کے کامل ہونے کے مظاہر کیا ہیں۔ کن چیزوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپؐ پر نبوت و رسالت کامل ہوگئی۔ اس ضمن میں بہت اہم اور توجہ طلب آیت مقصد بعثت سے متعلق آیت ہے‘ جس کا پیچھے ذکر ہوا ہے یعنی ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ......﴾ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت (۲) کی تکمیل کے تین مظاہر بیان ہوئے ہیں۔ ان

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۲) یہ سوال کہ نبوت و رسالت میں کوئی فرق ہے یا یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں‘ ایک مشکل اور پیچیدہ سوال ہے۔ اس وقت اس پر بحث مقصود نہیں کہ نبی کون ہوتا ہے اور رسول کون ہوتا ہے۔ یہ ایک علمی مسئلہ ہے۔ اس بارے میں میں نے اپنا موقف کئی مرتبہ اپنے دروس میں بیان کیا ہے۔ تاہم یہ بات واضح ہو جائے کہ اگر ایک شخص نبی بھی ہے اور رسول بھی ہے‘ تو اس کی ذات میں رسالت اور نبوت میں کیا نسبت ہے۔ نبوت و رسالت میں نسبت کا وہی معاملہ ہے جو ایک شخص کے دونوں ہاتھوں کا ہے جو باہم جڑے ہوئے ہوں۔ ایک ہاتھ کا رُخ ایک طرف اور دوسرے ہاتھ کا دوسری جانب ہوتا ہے۔

نبوت کا رخ آسمان کی جانب یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ یہ اللہ سے لینے والا معاملہ ہے۔ ◄

میں سے دو مظاہر تکمیل نبوت کے ہیں اور ایک مظہر تکمیل رسالت کا ہے۔ تکمیل نبوت کے دو مظاہر تکمیل ہدایت اور تکمیل دین ہیں' اور تکمیل رسالت کا مظہر ''اظہار دین حق'' ہے۔ تکمیل رسالت کا ایک اور مظہر (کل نوع انسانی کی طرف آپؐ کی بعثت ) دوسرے مقامات پر آیا ہے۔ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں عطا فرمائیں۔ ایک ''الھدیٰ'' اور دوسری ''دین حق'' یعنی سچا اور کامل دین' عدل وانصاف کے بلند ترین معیارات پر پورا اُترنے والا دین۔ یہ دو چیزیں جو آپؐ کو عطا کی گئیں' قبل ازیں ان دونوں میں ارتقائی مراحل طے ہوئے۔

تکمیل ہدایت: تکمیل نبوت کا پہلا مظہر یہ ہے کہ آپؐ پر ہدایت کی تکمیل ہوئی۔ آپؐ سے پہلے ہدایت بھی ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی اور آپؐ پر آ کر یہ کامل ہوگئی اور آپؐ کو ہدایت کا کامل ترین ایڈیشن قرآن حکیم کی صورت میں عطا کیا گیا۔ قرآن حکیم میں صحف ابراہیم کا ذکر آیا ہے' اگرچہ ہمیں معلوم نہیں کہ آج صحف ابراہیمؑ کہاں ہیں بلکہ دنیا میں کہیں ہیں بھی یا نہیں! میرا گمان ہے' اگرچہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ہندوؤں کے پاس جو اُپنشد ہے' وہ صحفِ ابراہیمی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ برہما کا لفظ بھی درحقیقت لفظ ابراہیم علیہ السلام کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح عیسائوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنالیا' اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کے بادشاہوں نے انہیں اپنا برہما (خدا) بنالیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے

◄ چنانچہ اللہ کی طرف سے نبی پر وحی آتی ہے۔ اس کے برعکس رسالت کا رخ زمین یعنی بندگانِ خدا کی طرف ہے۔ رسالت پیغام کا پہنچانا ہے۔ چنانچہ اللہ حکم دیتا ہے کہ میرے پیغام کو پہنچاؤ۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا: ﴿اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۝۲۴﴾ (طٰہٰ) ''جاؤ فرعون کی طرف کہ اُس نے سرکشی کی ہے۔'' تصوف میں یہ بحث چلتی ہے کہ نبوت بلند تر ہے یا رسالت۔ اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ رسالت بلند تر ہے۔ یہ نبوت سے اونچا مقام ہے۔ رسولوں کی تعداد صرف ۳۱۳ ہے' جبکہ نبی ایک لاکھ سے زائد آئے ہیں۔ مولانا رومی اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بلند تر درجہ نبوت ہے' رسالت نہیں۔ اس لیے کہ نبوت کا رخ اللہ کی طرف ہے۔ یہ انٹینا اُدھر سے ہے۔ نبوت مرتبۂ عروج میں ہے۔ رسالت مرتبۂ نزول میں ہے۔ غارِ حرا میں رسولِ خداؐ بلندی کے مراحل طے کر رہے تھے' اور جب آپؐ وہاں سے اُتر کر لوگوں کی طرف آئے تاکہ پیغامِ حق پہنچائیں' تو یہ گویا مرتبۂ نزول تھا ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

حضرت نوح علیہ السلام تھے‘ آخر ان پر بھی تو کوئی صحیفہ آیا ہوگا۔ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ مسٹر ڈیبوئس ایک فرنچ سکالر اور محقق تھا۔ اس نے انڈیا میں ہندو سکرپچرز کے تفصیلی مطالعے پر چالیس برس لگائے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندوؤں میں جو مَنُو ہے‘ جو مہانوح ہے وہ دراصل حضرت نوح علیہ السلام کا بگڑا ہوا نام ہے۔ ہندی میں ''مہا'' کسی بڑی شخصیت کے لیے آتا ہے جیسے مہا آتما۔ اس نسبت سے گاندھی کو مہاتما گاندھی کہا جاتا ہے۔ منوسمرتی کے متعلق اس کا کہنا ہے کہ یہ دراصل وہ صحیفہ تھا جو حضرت نوح علیہ السلام کو دیا گیا (واللہ اعلم)۔ میرا خیال ہے کہ ان چیزوں میں علمی طور پر کھوج لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تاہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا‘ سوائے اس چیز کے جو قرآن میں آ گئی۔ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے بعد بے شمار انبیاء پر صحیفے آئے۔ پھر تورات‘ زبور اور انجیل نازل ہوئیں۔ ان سب کتابوں میں لوگوں کے لیے ہدایت اور روشنی تھی جیسا کہ سورۃ المائدہ (آیت ۴۴) میں فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ﴾ ''بے شک ہم نے تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔'' لیکن یہ ہدایت ابھی ابتدائی مراحل میں تھی‘ ابھی مکمل نہ ہو پائی تھی۔ قرآن حکیم پر آ کر اس ہدایت کی تکمیل ہوگئی۔ چنانچہ قرآن کو ''الہدیٰ'' کہا گیا ہے۔ یوں سمجھئے‘ پہلے انسان ذہنی وفکری اعتبار سے عہد طفولیت میں تھا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا‘ ہدایت بھی ترقی کرتی گئی۔ ایک پرائمری کے طالب علم کے لیے اگر آپ پی ایچ ڈی ٹیوٹر رکھ دیں گے تو وہ اسے پی ایچ ڈی نہیں کرا سکے گا؟ اس لیے کہ بچے کا ذہنی افق ابھی بلند نہیں ہے۔ وہ اس کی ذہنی سطح کے مطابق ہی پڑھا پائے گا۔ اگرچہ اس کے پاس علم کا خزانہ ہے‘ مگر جس کو دینا ہے‘ اُسے اس کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر دینا ہوگا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت حضرت آدم علیہ السلام کے کم و بیش چھ ہزار سال بعد ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ذہنی وفکری‘ فلسفیانہ اور منطقی بحثوں اور مابعد الطبیعیات کے اعتبار سے انسان بالغ ہو چکا تھا۔ عجیب بات ہے کہ اسلام سے قبل کے تاریخ انسانی کے ۱۲۰۰ سال (۶۰۰ ق م تا ۶۰۰ عیسوی) ہی وہ عرصہ ہے جس میں مروجہ تمام مذاہب اور فلسفے پیدا ہوئے۔ اِسی عرصے میں بدھ ازم‘ جین ازم‘ کنفیوشش ازم اور تاؤ ازم آئے۔ اسی دور میں سقراط اور بقراط آئے۔ اسی عرصے میں مانی وانی آئے۔ وجود کی حقیقت کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ اس کی ابتدا اور انتہا کیا ہے؟ ہماری زندگی کی ابتدا اور انتہا کہاں ہے۔ ہم کہاں سے آئے اور کہاں جا رہے ہیں؟

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

یہ سارے سوالات وہ ہیں جن پر فلسفی غور کرتے رہے۔ اس عرصے میں چین' ہندوستان' ایران اور یونان کے فلسفیوں نے اس بارے میں اپنے اپنے نظریات اور خیالات پیش کیے' اور انہی کے فلسفوں کو شہرت ملی۔ بہر کیف جب ان ۱۲۰۰ سالوں کے دوران انسانی ذہن فلسفیانہ اور منطقی اعتبار سے اپنے عروج کو پہنچ گیا' تب رسول اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی اور الہدیٰ' کامل ہدایت کے نزول کا آخری مرحلہ آیا۔ نزول وحی سے قبل آپؐ غار حرا میں تشریف لے جاتے اور وہاں غور وفکر اور سوچ بچار کرتے تھے۔ دنیا میں غلط کام کیوں ہو رہے ہیں؟ ظلم و ناانصافی کا چلن کیوں عام ہے؟ انسان اس قدر پستی میں کیوں گر گیا ہے؟ کیا انسان میں پستی ہی پستی ہے یا اس کے وجود کا کوئی روشن پہلو بھی ہے؟ یوں سمجھئے' چھ ہزار سال میں انسان نے جو فلسفیانہ شعور حاصل کیا ہے' وہ سارا سفر محمد رسول اللہ ﷺ نے غار حرا کی خلوتوں میں چند مہینوں میں طے کیا۔ اس کے بعد آپؐ پر آیات قرآنی نازل ہونی شروع ہوئیں اور تیئس سالوں میں ''الہدیٰ'' کی تکمیل ہو گئی۔

تکمیل ہدایت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے کسی گزشتہ پیغام کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ اس کی تکمیل ہو چکی اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار میں ہوں' مگر قرآن کے متعلق فرمایا: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ۝۹﴾ (الحجر) ''بے شک ہم نے ہی یہ ''الذکر'' نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' اللہ نے دوسری کتب سماوی تورات' زبور' انجیل وغیرہ کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ چنانچہ ان میں تحریف ہو گئی۔ اگر اللہ اُن کی حفاظت کا ذمہ لے لیتا تو ان میں کبھی تحریف نہ ہو سکتی تھی۔ اگر اللہ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا ہوتا تو ہم بھی قرآن میں تحریف کیے بغیر نہ رہتے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ قرآن کے ترجموں اور تفسیروں میں تحریفیں کی گئی ہیں۔ پھر متن میں تحریف کیوں نہ ہوتی۔ مگر اس کا متن اس لیے محفوظ ہے کہ اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ میں لطیف انداز میں یہ کہا کرتا ہوں کہ سابقہ آسمانی کتابوں کو حق پہنچتا ہے کہ اللہ کی جناب میں شکوہ کریں کہ اے اللہ' ہم بھی تیری کتابیں تھیں' قرآن بھی تیری کتاب تھی' تو پھر تو نے کیوں ہمارے ساتھ سوتیلی بیٹیوں والا سلوک کیا۔ تو نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا' ہماری حفاظت کا ذمہ کیوں نہیں لیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دیکھو' ابھی تمہارے اندر ہدایت کامل نہیں ہوئی تھی۔

تمہاری حیثیت مختلف ادوار میں عبوری ہدایات کی تھی جبکہ ابھی ہدایت کا کامل اور مکمل ایڈیشن ''الہدیٰ'' نہیں آیا تھا۔ تمہارے اندر احکام ہی دے گئے تھے' ابھی حکمت نہیں آئی تھی۔ اگرچہ انجیل میں حکمت آئی تھی' مگر ابھی اس کا آغاز ہی ہوا تھا' جبکہ تورات میں تو سرے سے حکمت تھی ہی نہیں۔ اُس میں احکام ہی احکام تھے' بلکہ بائبل کے سب سے نمایاں الفاظ ہی The Ten Commandments (احکام عشرہ) ہیں۔ انسان ابھی اس قابل نہیں تھا کہ اس کو حکمت سمجھائی جاتی۔ لہٰذا عبوری دور کی تعلیمات ہونے کے سبب سابقہ کتب کی حفاظت کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن جب ہدایت اور حکمت کی تکمیل ہوگئی' تو اللہ نے اس کو محفوظ کر لیا۔

ایک دفعہ ایک قادیانی نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ مجھ سے سوال کیا کہ وحی و نبوت تو رحمت ہے۔ ٹھیک ہے' محمد ﷺ پر رحمت کامل ہوگئی' مگر رحمت بند کیسے ہو سکتی ہے؟ میں نے پوچھا' کیا تم یہ مانتے ہو کہ قرآن میں ہدایت کامل ہوگئی۔ کہنے لگا' جی بالکل۔ میں نے کہا' یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے خیال میں قرآن محفوظ ہے یا اس میں تحریف ہوگئی۔ اُس نے کہا' کیوں نہیں' یہ تو محفوظ ہے۔ میں نے کہا' جب یہ قرآن مکمل بھی ہے اور محفوظ بھی تو پھر مزید ہدایت کی گنجائش کہاں سے نکلے گی۔ یہ ہدایت محفوظ' یا کامل نہ ہوتی' پھر تو ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ محفوظ نہیں ہے' یا ابھی ادھوری ہے' ابھی کامل ہونی ہے' لہٰذا سلسلہ نبوت ابھی جاری رہنا چاہیے' مگر جب ہدایت محفوظ بھی ہے اور کامل بھی ہوگئی' تو مزید ہدایت کی ضرورت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ گلاس ابھی پورا بھرا نہ ہو تو پانی ڈالنا چاہیے۔ گلاس لبالب بھر جائے تو اس میں اور پانی کیسے ڈالیں گے۔ میں نے کہا کہ جب قرآن میں ہدایت کامل ہوگئی اور اللہ نے قرآن کو محفوظ بنا لیا تو پھر اس بات کے لیے قطعاً کوئی منطقی اور عقلی دلیل نہیں ہے کہ نبوت اور وحی کے جاری رہنے کا تصور بھی کیا جا سکے۔ وہ نوجوان جھگڑالو نہیں تھا۔ میری بات کو سمجھ گیا اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تکمیل دین اور تکمیل ہدایت کے حوالے سے اگر ہم حضور ﷺ کے مرتبہ و مقام کو نمایاں نہیں کرتے' تو پھر جتنے بھی فتنے سر اُٹھائیں گے' ان کا سدباب نہیں ہو سکے گا۔

تکمیل دین: تکمیل نبوت کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ آپؐ پر دین بھی کامل کر دیا گیا۔ آپؐ کو جو دین عطا کیا گیا وہ دین حق ہے۔ دین حق کیا ہے؟ یہ مکمل نظام زندگی ہے۔ اس کا بھی ارتقا ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے آباء و اجداد غاروں میں رہتے تھے۔ اُس وقت کوئی اجتماعی نظام نہیں تھا۔ کوئی میونسپلٹی نہیں تھی۔ ہر شخص آزاد تھا۔ اگلی سٹیج آئی تو قبیلے کے نظام نے جنم لیا۔ ہر قبیلہ کا

ایک اپنا نظام ہوتا تھا۔ افرادِ قبیلہ کے لیے قبیلے کے سردار کا حکم ماننا لازمی تھا۔ قبیلے کی روایات باعثِ فخر سمجھی جاتی تھیں۔ لوگ کہتے کہ یہ ہمارے قبیلے کا رواج ہے' یہ ہماری رسم ہے' یہ ہماری رِیت ہے وغیرہ۔ اگر غور کیا جائے تو قبائلی زندگی انسان کا تمدن کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس لیے کہ اس سے پہلے انسان کو کامل آزادی حاصل تھی' اب یہاں اُس پر قدغن لگنی شروع ہوگئی۔ انسان یہاں آکر پابند ہوگیا کہ بہرصورت قبیلہ کی رسم پوری کرے گا اور قبیلہ کی روایت پر چلے گا' خواہ وہ رسم اور روایت اُسے پسند ہو یا ناپسند۔ اس کے بعد اگلا دور آیا تو ایک قبیلے نے اپنا ایک شہر بھی بنالیا۔ اُس کے گرد ایک فصیل بھی کھینچ لی اور اپنے نظام کو اور مستحکم کرلیا۔ اس طرح ایک قبیلے کی شہری ریاست قائم ہوگئی۔ جب حضور ﷺ کی بعثت ہوئی ہے مکہ مکرمہ بھی ایک قبیلے کی شہری ریاست تھا۔ وہاں وہی شخص رہ سکتا تھا جو قرشی ہو' یا کسی قرشی کا حلیف ہو یا اُس کا غلام ہو یا اُس کی امان میں آجائے۔ مکہ میں کوئی دوسرا نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ پھر اگلا دور آیا تو کئی قبیلے ایک جگہ جمع ہوگئے اور ساتھ مل کر رہنے لگے۔ قبائل کے باہم مل کر رہنے سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اُن کا آپس میں انٹریکشن کس بنیاد پر ہوگا۔ ظاہر ہے' مختلف قبیلے ہیں' اُن کے سردار مختلف ہیں' اُن کا نظام الگ الگ ہے۔ اگر ایک شہر میں رہنا ہے تو کچھ چیزیں تو آپس میں بہرحال طے کرنی پڑیں گی۔ یہیں سے گویا آئین و دستور کے تصور کا آغاز ہوا۔ آپ حیران ہوں گے مدینہ منورہ بھی پانچ قبیلوں پر مشتمل ایک بستی تھی۔ تین قبائل یہودی تھے یعنی بنونضیر' بنوقریظہ اور بنوقینقاع اور دو عرب قبیلے تھے یعنی اوس اور خزرج۔ یہودیوں کا اپنا الگ نظام تھا۔ ان کے ہاں سردار تھے' مفتی اور علماء تھے۔ وہ تورات کے ماننے والے تھے۔ عرب قبائل اوس اور خزرج کے ہاں یہ طے تھا کہ اگر اوس کا کوئی نوجوان کسی خزرجی کو قتل کردے گا تو اُسے تین گنا دیت ادا کرنی ہوگی' اور اگر کوئی خزرجی اوسی کو قتل کرے گا تو اُسے صرف ایک تہائی دینی پڑے گی۔ ذرا سوچئے' اس صورتحال پر کسی اوسی نوجوان کا خون کس قدر کھولتا ہوگا کہ خزرجی کے مقابلے میں میرے خون کی قیمت ایک تہائی ہے۔ اس کے بعد اگلے مرحلے پر سلطنتیں قائم ہوئیں۔ جیسے عرب کے شمال میں کئی سو سال سے دو سلطنتیں تھیں: سلطنت روما اور سلطنت ایران۔ سلطنتیں وجود میں آئیں تو اب محلات کھڑے کیے گئے' فوجیں بنائی گئیں جو تربیت یافتہ اور مسلح تھیں۔ پھر بادشاہوں نے عوام کی گردنوں پر اپنی بادشاہی اور خدائی کا تخت رکھا۔ عوام پر ظلم ڈھائے جانے لگے۔ محنت مزدور کرتا اور اُس کی کمائی پر عیش

بادشاہ اور جاگیردار کرتا تھا۔ اگر کوئی شخص بادشاہ کے ظلم کے خلاف سر اُٹھاتا' تو فوجیں اُس کا سر کچل دیتی تھیں۔ مثلاً ایک شخص کپڑا بن رہا ہے تو اُس سے کہا جاتا کہ تمہیں اتنا ٹیکس دینا ہوگا ورنہ تمہارا سر کچل دیا جائے گا۔ یہ ظالمانہ نظام جب ظلم کی انتہا کو پہنچ گیا تو انسان غلام' مجبور' مقہور اور مظلوم بن کر رہ گیا۔ اس کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ ہوتا۔ اس کے مقابلے میں جاگیردار گل چھرے اڑانے لگے۔ بادشاہوں کے محلات میں مشرق و مغرب کا نسوانی حسن جمع کیا جانے لگا۔ کنیزوں کی فوجوں کی فوجیں لائی گئیں۔ یہی وقت تھا جب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔

ایک بات اور نوٹ کیجیے۔ اس دور سے لے کر تا قیامت انسان کی اصل ضرورت ایک عادلانہ نظام ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے انسان کی اس ضرورت کو بتمام و کمال پورا کیا۔ اُسے عادلانہ نظام عطا فرمایا۔ مگر افسوس کہ اس نظام سے انحراف کر کے انسان آج پھر ظالمانہ نظام کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ آج کا نظام کیا ہے؟ آسمانی تعلیمات سے بے گانہ پابندیاں۔ جو چیز حکومت طے کر دے گی آپ اس کے پابند ہوں گے۔ فرض کریں کہ آپ کی حکومت طے کر دے کہ بچوں کو فلاں فلاں نصاب پڑھایا جائے گا۔ اب آپ اُس نصاب سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔ آپ نے بچے کو سکول میں داخل کروا دیا۔ اس کے بعد بچے کے نصاب کے حوالے سے آپ کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ بچہ وہی پڑھے گا جو سرکار پڑھائے گی۔ اور یہ نصاب بنانے والے کون لوگ ہیں؟ یہ وہی قوتیں ہیں جو اسلام کی دشمن ہیں۔ آج امریکہ پوری اسلامی دنیا بالخصوص سعودی عرب اور پاکستان کے نصاب سے اسلام کو کھرچ کھرچ کر نکال رہا ہے۔ حکمرانوں کو ڈکٹیٹ کرایا جا رہا ہے کہ نصاب سے جہاد کا ذکر نکالو۔ ہم اہل پاکستان سے بتکرار یہ کہا جا رہا ہے کہ اپنی تاریخ سے تحریک پاکستان کا ذکر نکالو۔ نصاب تاریخ میں کوئی نظریاتی حوالہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح ہندو دشمنی کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ اس صورتحال میں ہم اپنے بچوں کو کہاں لے جائیں؟ کیا غاروں میں بند کر دیں؟ اسی طرح آپ ٹی وی کی تباہ کاریوں سے بچوں کو بچانا چاہتے ہیں تو کیسے بچائیں گے۔ کیا گھر میں ٹی وی نہ لا کر اس سے پوری طرح بچ جائیں گے۔ ظاہر ہے' ایسا نہیں ہے۔ آپ اپنے گھر میں ٹیلی ویژن نہیں لائیں گے تو بچے کہیں باہر جا کر دیکھ لیں گے۔ پنساری یا دودھ والے کی دوکان پر جا کے دیکھ لیں گے۔ پڑوسی کے گھر چلے جائیں گے۔ یا کسی کینٹین کا رُخ کر لیں گے۔ سارے مسائل حل تب ہوں گے جب آپ نظام بدلیں گے۔ جب تک غلط نظام نہیں بدلے گا' حالات کبھی نہیں

سدھریں گے۔ اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ تقسیم دولت کا نظام غلط ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک طرف دولت کے انبار ہوتے ہیں' گل چھرے اور عیاشیاں ہوتی ہیں' اور دوسری طرف بھوک اور فاقے ہوتے ہیں اور انسان کی حیثیت بار برداری کے اونٹ کی سی ہو جاتی ہے۔ انسان انسان نہیں رہتا۔ جو شخص صبح سے شام تک کمر توڑ دینے والی محنت کرتا ہے' پھر بھی اُس کے خاندان کی دو وقت کی روٹی پوری نہیں ہوتی' آپ اُس سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ کیا وہ رات کو کھڑے ہو کر اللہ سے لو لگائے گا؟ کسی اعلیٰ آدرش اور نصب العین کی فکر کرے گا؟ خود حضور ﷺ نے فرمایا: ((کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا))(۱) ''ہوسکتا ہے فقر انسان کو کفر تک پہنچا دے''۔ یہ فقر ہی تو ہے جو انسان سے خودکشیاں کروا رہا ہے۔ یہ فقر ہی تو ہے کہ ایک ماں اپنی تین بچیوں کو لے کر ریل کے سامنے کود جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں کہ تقسیم دولت کا غلط نظام دو دھاری تلوار ہے۔ یہ ادھر بھی کاٹتی ہے اور ادھر بھی کاٹتی ہے۔ نامنصفانہ نظام کے نتیجے میں جن لوگوں کے پاس دولت کے انبار لگ جاتے ہیں اُن کے ہاں عیاشیاں اور بدمعاشیاں ہوتی ہیں۔ وہ گل چھرے اڑاتے ہیں۔ اُن کی اخلاقی حس مردہ ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف جو لوگ وسائل سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ بھوکے مرتے ہیں' روزی روٹی کے علاوہ اُن میں کوئی اور فکر پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اُن میں خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کیونکر پیدا ہوگی' وہ نجاتِ اُخروی کے بارے میں کیسے سوچیں گے' جبکہ وہ تو بار برداری کے اونٹ اور کولہو کے بیل ہیں۔ واقعتاً شاہ ولی اللہ کی سماجی فکر (social thought) بہت بلند درجے پر ہے۔ تو یہ تھا وہ غلط نظام جس کے شکنجے میں حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے انسانیت جکڑی ہوئی تھی۔

اظہارِ دینِ حق: حضور ﷺ تشریف لائے۔ آپؐ کو دینِ حق عطا کیا گیا۔ آپؐ کا مقصدِ بعثت یہ تھا کہ آپؐ کل نظامِ اطاعت پر دینِ حق کو غالب کریں اور انسان کو ظالمانہ نظام کے شکنجے سے رہائی دلائیں۔

یہ واضح ہو کہ دینِ حق صرف الہدیٰ (قرآن) پر نہیں بنے گا۔ الہدیٰ اور دین الحق دونوں ایک نہیں ہیں' دو ہیں۔ الہدیٰ اور دینِ حق کے درمیان میں واوِ عطف آیا ہے۔ اور واوٴ عطف معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت پیدا کرتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ میں اور وہ۔ لفظ ''اور'' بتاتا ہے کہ میں اور ہوں اور وہ اور ہے۔ بلاشبہ الہدیٰ دینِ حق کی بنیاد اور اساس ہے مگر اس کا

(۱) الضعفاء الکبیر للعقیلی' راوی: عمر بن الخطابؓ، ج۴' ص ۲۰۶۔

تفصیلی ڈھانچہ اور خاکہ سنتِ رسولؐ سے بنتا ہے۔ جب آپ سنتِ رسولؐ کے بغیر نماز تک کا نظام نہیں بنا سکتے تو کوئی اور نظام کیا بنائیں گے۔ وہ لوگ بہت ظالم تھے اور ہیں جنہوں نے حدیث سے اُمت کا رُخ موڑنے کی سعی مذموم کی۔ افسوس کہ یہ فتنہ آج بھی پھیل رہا ہے۔ پرویزیت اور مشرقیت کے علمبردار ہمارے ہاں آج بھی موجود ہیں جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں اور حدیث کا انکار کرتے ہیں۔

حضور ﷺ کو جو دو چیزیں دی گئیں (یعنی الہدیٰ اور دین حق) اُن میں سے الہدیٰ کے ضمن میں آپؐ کی بنیادی ذمہ داری اُس کی تبلیغ تھی۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ میں فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٧﴾﴾

''اے پیغمبر! جو ارشادات اللہ کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچ دو۔ اور اگر ایسا نہ کیا تو تم اللہ کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔ (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ بیشک اللہ منکروں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اور قیامت کے دن اس بارے میں پوچھا جائے گا۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا:

﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٦﴾﴾

''تو جن لوگوں کی طرف پیغمبر بھیجے گئے ہم ان سے بھی پرسش کریں گے اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔''

حضور ﷺ نے تبلیغ کا یہ فرض نہ صرف بتمام وکمال پورا فرما دیا بلکہ خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع سے خطاب میں صحابہ کرامؓ سے یہ گواہی بھی لے لی کہ ''کیا میں نے (پیغام رب) پہنچا دیا؟'' صحابہؓ نے جواب دیا ''ہاں' حضور ﷺ ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حق امانت ادا کر دیا، آپؐ نے حق رسالت ادا کر دیا، آپؐ نے خیر خواہی کا حق بھی ادا کر دیا''۔ (1) یہ گواہی آپؐ نے اس لیے لی کہ مذکورہ آیات آپؐ کے سامنے تھیں۔ آخر رسول بھی اللہ کا بندہ ہوتا ہے کہ اُس سے بھی تو محاسبہ ہوگا۔

دین حق کے ضمن میں آپؐ کی ذمہ داری دین کو قائم کرنا تھا۔ دین صرف تبلیغ کی شے نہیں ہے۔ آپؐ کو حکم تھا کہ اسے غالب اور قائم کر کے دکھایئے' یہ تکمیل رسالت کا تقاضا ہے۔ آپؐ کا مقصد بعثت ہی یہ تھا کہ دین کو غالب کریں۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب خطبة ایّام منیٰ

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ......﴾ (الصف:۹)

''وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) دے کر اور دین الحق کے ساتھ' تا کہ وہ اُسے پورے کے پورے دین پر غالب کریں۔''

عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (کل نظام اطاعت پر) فرما کر اُمت کو یہ بتا دیا ہے کہ تعمیل وقیام دین میں مائنس ون' مائنس ٹو کی گنجائش نہیں۔ یہ دین ایک مکمل پیکیج ہے۔ لینا ہے تو پورا لو' اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ دین کو پورے طور سے غالب کرو۔ اس طور سے غالب کرو کہ پورا نظام زندگی اس کے تابع ہو جائے۔ سیاسی نظام اس کے تحت ہو۔ حاکمیت اعلیٰ نہ تو شخص واحد کی ہو' نہ جمہور کی بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہو۔ معاشی نظام اسلام کے تحت ہو۔ سود اور جوئے کی بیخ کنی ہو۔ شراب بنانے اور پینے پلانے کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔ عصمت فروشی کو ذریعۂ کمائی بنانا ختم ہو جائے۔ اشتہاروں میں عورتوں کی تصویروں کے ذریعے کمائی کا انسداد ہو جائے۔ ان سب چیزوں پر پابندی ہو۔ تب ہی عصمت وعفت کے پاکیزہ تصورات فروغ پائیں گے اور انسان کی خاندانی اور سماجی زندگی کو استحکام حاصل ہو گا۔

اگر اسلام کو غالب کر کے دکھا نہ دیا جاتا تو دنیا یہ کہہ سکتی تھی کہ اسلام پیغام تو بہت اچھا ہے کہ لیکن نا قابل عمل ہے۔ حضور ﷺ سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے افلاطون نے ایک کتاب "Republic" کے نام سے لکھی تھی' جس میں اپنی خیالی ریاست کا آئیڈیا پیش کیا تھا۔ لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ریاست سے متعلق اُس کا آئیڈیا ایک خواب ہی تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ وہ ہونے والی بات نہیں تھی۔ تو حضور ﷺ نے اسلام کے نظام عدل کے متعلق جو باتیں کہی تھیں' اگر آپؐ اسلامی نظام کو قائم کر کے نہ دکھاتے تو لوگ یہی کہتے کہ یہ ہونے والی بات نہیں ہے' یہ نری شاعری ہے۔ اگر اسلامی نظام قابلِ عمل ہوتا تو پیغمبر اسلام اُسے قائم کر کے دکھا دیتے۔ لوگ کہتے قوم کا سردار خادم ہوتا ہے' یہ بہت اچھی بات ہے' لیکن یہ عملاً ہو نہیں سکتی' یہ ناممکن ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قوم کا سردار ہو اور رات کے وقت ایک غریب عورت اور اس کے بچوں کے لیے آٹے کی بوری اپنے کندھے پر لاد کر لا رہا ہو۔ اِسی طرح یہ بات بھی انہونی لگتی کہ لاکھوں مربع میل کا حکمران پیدل چل کر یروشلم میں داخل ہو رہا ہے اور اُس کا خادم

اونٹ پر سوار ہے۔ اسلامی تاریخ کا واقعہ ہے کہ مسلمان کی فوجوں نے یروشلم کا گھیراؤ کیا۔ لیکن یہ شہر فتح نہیں ہو رہا تھا۔ خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں درخواست آئی کہ آپؓ یہاں تشریف لائیں۔ تب ہی بیت المقدس فتح ہوگا۔ اس لیے کہ وہاں کے عیسائی علماء نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ یہ شہر جس شخص کے ہاتھوں فتح ہوگا اس میں فلاں فلاں نشانیاں ہوں گی اور یہ نشانیاں تم میں نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ کبھی تمہارے ہاتھوں فتح نہیں ہوگا' چاہے تم قیامت تک یہاں پڑے رہو۔ اس لیے کہ یروشلم کی فصیلیں بہت اونچی تھیں اور اندر ہر چیز موجود تھی۔ مسلمانوں کے پیغام پر خلیفہ یروشلم روانہ ہوگئے۔ سات سو میل کا سفر تھا۔ ایک اونٹ اور ایک خادم ساتھ تھا۔ کوئی خدم و حشم نہیں' کوئی باڈی گارڈ نہیں۔ چونکہ ایک ہی اونٹ تھا' اور اُس پر راستے کا راشن بھی تھا' لہٰذا ایک وقت میں ایک ہی آدمی اُس پر بیٹھ سکتا ہے۔ اب اسلامی مساوات کے اصول کے تحت خلیفہ نے یہ طے کیا کہ ایک منزل اونٹ پر خلیفہ سوار ہوں' اور خادم اونٹ کے آگے آگے چلے اور اگلی منزل خادم اوپر بیٹھیں اور خلیفہ ٔوقت اونٹ کی نکیل پکڑ کر آگے چلیں۔ جب یہ یروشلم پہنچے تو خادم کی باری تھی۔ چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ خلیفہ اونٹ کی نکیل تھامے آگے آگے پیدل چلے آرہے ہیں اور خادم اونٹ پر سوار ہے۔ یہ ہے اسلامی مساوات کا عملی نمونہ جس کی نظیر کہیں پیش ہی نہیں کی جاسکتی۔ جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ چون این لائی کی بیٹی بھی سائیکل پر سکول جاتی تھی' مصر کے حکمران جمال ناصر کی بیٹی بھی سائیکل پر سکول جایا کرتی تھی تو ہمیں اُن کی عظمت کا احساس ہوا۔ اسی طرح یہ بات بھی ہمارے لیے خوشگوار حیرانی کا باعث بنی کہ جب ہندوستان کا وزیر اعظم لال بہادر شاستری مرا تو پورے ہندوستان میں اس کا کوئی گھر نہیں تھا اور اس کی بیوی اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی تھی۔ لیکن یہ ساری کی ساری بلندیاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گرد کو بھی نہیں پاسکتیں۔ اگر آپ ان سب لوگوں کو جمع کرلیں' پھر بھی یہ عمر رضی اللہ عنہ کے آس پاس بھی نہیں آئیں گے۔ یہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کا کارنامہ ہے کہ آپؐ نے عدل و مساوات پر مبنی نظام بالفعل قائم کر کے دکھا دیا۔ آپؐ کو حکم تھا کہ اس کو قائم کرو اور دنیا پر حجت قائم کردو' تاکہ لوگ جان لے کہ دین یہی ہے' حق یہی ہے' نظام یہی ہے۔ اسی نظام میں انسان کی فلاح ہے۔ اسی میں اس کی بہبود ہے۔ اسی میں اخلاقیات کی بلندی ہے۔ اسی میں تہذیب کی مضبوطی ہے۔ اسی میں تمدنی تقاضے پورے ہوسکتے ہیں۔

**کل نوعِ انسانی کی طرف بعثت:** تکمیل رسالت کا دوسرا مظہر یہ بھی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ

سے پہلے جتنے رسول آئے، وہ کسی قوم کے لیے' کسی علاقے کے لیے یا کسی شہر کے لیے آئے' پوری نوعِ انسانی کے لیے کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا۔ محمد عربی ﷺ اللہ کے واحد رسول ہیں جن کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ﴾ ''ہم نے نوح کو بھیجا اس کی قوم کی طرف''۔ حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں صراحت ہے کہ آپؑ قومِ عاد کے لیے بھیجے گئے: ﴿وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ﴾ حضرت صالح علیہ السلام قومِ ثمود کی طرف بھیجے گئے: ﴿وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ؕ﴾ اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام قومِ مدین کی طرف بھیجے گئے: ﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ﴾۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اشکال پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے اس وقت پوری دنیا میں ہیں اور ساری نسلوں کے لوگ ہیں..... تو اس سے شک ہوتا ہے کہ شاید حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہو' لیکن اس نکتے کو سمجھ لیجیے کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اور منصوص اور منقول ہونے کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ قرآن مجید میں سورۂ آل عمران میں کہا گیا: ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ''وہ رسول تھے بنی اسرائیل کی طرف''۔ قرآن کی اس نصِ قطعی کے علاوہ خود انجیل میں موجود ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: ''میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں۔''

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پہلے اور آخری رسول ہیں جن کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوئی ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں پانچ مرتبہ' مختلف الفاظ میں آیا ہے۔ سب سے واضح انداز میں سورۂ سبا میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (آیت ۲۸) ''(اے محمد ﷺ!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''۔ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ''ہم نے آپؐ کو (کسی ایک قوم یا کسی ایک علاقے کے لیے نہیں بلکہ) تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔ نبوت و رسالت ہمیشہ سے رحمت ہے' مگر آپؐ پر آ کر یہ رحمت ''رحمۃ للعالمین'' بن گئی ہے۔ یہ تکمیل رسالت کا ایک مظہر ہے۔ اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۸ میں خود نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ کہلوایا گیا: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ ''(اے محمد ﷺ! ڈنکے کی چوٹ) کہہ دو: اے لوگو! (اے بنی نوعِ آدم!)

میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' محمد ﷺ پہلے اور آخری رسول ہیں جو پوری نوع انسانی کے لیے بھیجے گئے۔ ہدایت اور نبوت و رسالت کی تکمیل کا تعلق انسان کے ذہنی و فکری اور تمدنی ارتقاء سے ہے۔ ذہنی و فکری ارتقاء کے ساتھ ساتھ آسمانی ہدایت میں اضافہ ہوتا گیا' یہاں تک کہ الہدیٰ' کامل ہدایت نامہ کے نزول کا مرحلہ آیا۔ دوسری جانب تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں انسان غاروں سے لے کر سلطنتوں کے دور تک آ پہنچا' تب دین حق آ گیا۔ تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں حضور ﷺ کے زمانے میں رسل و رسائل اس قدر پیدا ہو گئے تھے کہ ایک دعوت تمام انسانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ چنانچہ آپؐ کی بعثت پوری نوع انسانی کے لیے ہوئی۔ آپؐ کی رسالت پوری نوع انسانی کے لیے ہے۔ آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔

## خاتم النبیین ﷺ کا مشن اور اُمت مسلمہ کی ذمہ داری

حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے دو حصے ہیں۔ سورۃ الجمعہ میں فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۲ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۳﴾

''وہی تو ہے جس نے امیین میں انہی میں سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور انہیں (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔ اور ان میں سے اور لوگوں کی طرف بھی (ان کو بھیجا ہے) جو ابھی ان (مسلمانوں سے) نہیں ملے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔''

آپ کی بنیادی بعثت اُمیین کی طرف ہے۔ اسی لیے ان کی زبان میں یہ قرآن نازل ہوا ہے۔ امیین جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور دیگر مشرکین عرب جو ان سے ملتے ہیں' اُمت کی تشکیل میں ان کی حیثیت مرکزہ کی سی ہے۔ اُن کے بعد اسلام میں ایرانی' بربر' ہندی اور ترک داخل ہوئے۔ یہ گویا الیکٹرانز ہیں جو چاروں طرف چکر لگا رہے ہیں۔ آپؐ کی بعثت عمومی کل نوع انسانی کی طرف ہے۔ ﴿وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ انہی میں سے اور بھی ہیں جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے' یہ بھی بالآخر اسی اُمت کا حصہ بن جائیں گے۔

آپؐ کی بعثت خصوصی اور بعثت عمومی کے حوالے سے تکمیل رسالت کے دو پہلو ہو گئے۔ ایک یہ کہ آپؐ پر رسالت کا یہ حق ہے کہ دین کو غالب کر کے دکھائیں' اور آپؐ نے جزیرہ نما عرب کی حد تک دین کو غالب کر کے دکھا دیا۔ تکمیل رسالت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دین حق پوری دنیا پر غالب کر کے دکھا دیا جائے۔ آپؐ کا مشن ایک درجہ میں تو پورا ہو گیا کہ جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کے دین کا غلبہ ہو گیا۔ لیکن یہ تکمیل کُلی نہیں ہے' اس لیے کہ آپؐ صرف عرب کے لیے نہیں آئے تھے' پوری نوعِ انسانی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ لہٰذا جب تک پوری نوعِ انسانی تک وہ ہدایت نہ پہنچے' اور کل روئے ارضی پر وہ نظام قائم نہ ہو' اس وقت تک آپؐ کا مقصد بعثت اظہار دین حق اتمامی شان کے ساتھ پورا نہیں ہو گا' اور اس مشن کو آگے بڑھانے کا کام باقی رہے گا۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

یہ کام اس اُمت کو کرنا ہے۔ اگر امت یہ کام نہیں کرتی تو وہ مجرم ہے۔ ہاں' کوشش کے باوجود اگر دین غالب نہیں ہوتا تو یہ دوسری بات ہے۔ کام کرنے والے اللہ کے ہاں سرخرو ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس کام میں کوتاہی ہو رہی ہے' تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنے والوں کا حضور ﷺ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے' اگرچہ وہ اپنی جگہ سچے اُمتی بنے پھرتے ہوں۔ اس لیے کہ آپؐ نے فرمادیا کہ ((مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) ''جس نے میری سنت سے منہ موڑا' اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

## غلبۂ اسلام کی بشارت

اسلام کا غلبہ بالآخر ہو کر رہنا ہے۔ اس کا صغریٰ و کبریٰ قرآن مجید میں موجود ہے۔ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے کہ یہودیوں کی سازشوں کے علی الرغم نورِ توحید کا اتمام اور دین حق کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ اس کے لیے صغریٰ یہ آیات ہیں:

﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ (التوبۃ)

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ (کے چراغ) کی روشنی کو منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔''

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ......﴾ (الصف:۹)

''وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) دے کر اور دین الحق کے ساتھ' تاکہ وہ اُسے پورے کے پورے دین پر غالب کریں۔''

کبریٰ کیا ہے؟ کبریٰ درج ذیل آیت ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾ (النور)

''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین کی خلافت عطا فرمائے گا' جیسا ان سے پہلے لوگوں کو عطا کی تھی اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے (اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔''

اہل ایمان سے کہا جا رہا ہے کہ انہیں خلافت مل کر رہے گی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی اُس وقت مدینے میں حالات انتہائی مخدوش تھے۔ ہر وقت اندیشہ رہتا تھا کہ ابھی کفر یہ لشکر آئے گا اور حملہ آور ہو جائے گا۔ لیکن پھر دنیا نے دیکھا کہ اہل اسلام کو غلبہ حاصل ہوا' یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد انقلاب اسلامی کی تکمیل ہوگئی' اور لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ دور خلافت راشدہ میں یہ نظام جزیرہ نمائے عرب سے باہر ۲۲ لاکھ مربع میل کے علاقے میں پھیل گیا۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور اب دوبارہ آ کر رہے گا۔ یہ بات ایک طویل حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں حضور ﷺ نے اپنے زمانے سے لے کر قیامت تک پانچ ادوار گنا دیئے ہیں۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا، فَيَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ

اَنْ یَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا جَبْرِیَّۃً فَتَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَۃً عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّۃِ)) ثُمَّ سَکَتَ [1]

''دورِ نبوت تم میں اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا اس کو ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کی طرز پر خلافت کا دور ہوگا۔ پھر وہ دور رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کر دے گا جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت ہوگی۔ وہ دور بھی اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا۔ پھر جبر کی فرماں روائی (غلامی کی بادشاہت) ہوگی' وہ رہے گی جب تک اللہ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کر دے گا جب وہ اسے ختم کرنا چاہے گا۔ پھر نبوت کے طرز پر دوبارہ خلافت قائم ہوگی۔'' پھر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔

حدیث کے مطابق اُمت کا پہلا دور دورِ نبوت ہے۔ اس کے بعد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور آئے گا۔ پھر ظالم بادشاہت کا زمانہ آئے گا۔ پھر غلامی والی بادشاہت کا دور آئے گا۔ اس سے مراد اس وقت نہ جانے کیا سمجھی گئی ہوگی' مگر آج یہ بات بآسانی سمجھ میں آتی ہے۔ اس سے مراد عالم اسلام پر استعمار کی حکمرانی کا عہد ہے۔ دورِ استعمار سے پہلے مسلمانوں پر اچھے یا برے جیسے بھی تھے مسلمان ہی حکمران تھے۔ یہ چاہے بہت بُرے تھے یا بہت اچھے تھے' لیکن تھے یہ مسلمان' اور محمد ﷺ ہی کے نام لیوا تھے۔ مگر دورِ استعمار میں پورے عالم اسلام پر کہیں انگریز' کہیں فرانسیسی' کہیں ولندیزی' کہیں اٹالینز' کہیں فرنچ قابض ہو گئے اور مسلمان غیروں کے محکوم ہو گئے۔ اس کے بعد پانچواں دور دوبارہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا آئے گا۔ اس دور میں منہاجِ نبوت پر دوبارہ خلافت قائم ہوگی۔ یہ وقت آنے والا ہے۔ یہ خبر الصادق المصدوق محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

## امتِ مسلمہ چوتھے اور پانچویں دور کے درمیان

اُمتِ محمدیہ کے پانچ ادوار سے متعلقہ اس حدیث میں بیان کردہ چار ادوار سے اُمت گزر چکی ہے۔ اس وقت ہم چوتھے اور پانچویں دور کے درمیان کھڑے ہیں۔ چوتھا دور یعنی

(۱) مسند احمد: مرویات نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ۔

دورِ استعمار ایک اعتبار سے ختم ہو چکا ہے کہ مسلم خطوں سے انگریز چلے گئے، فرانسیسی چلے گئے، اٹالینز اور ولندیزی وغیرہ چلے گئے۔ لیکن ایک اعتبار سے اب از سرِ نو پوری نوعِ انسانی پر ایک نیا مالیاتی شکنجہ کسا جا رہا ہے۔ یہ آئی ایم ایف، ورلڈ بنک، ملٹی نیشنلز اور TRIPS کا شکنجہ ہے۔ یہ شکنجہ مغرب کا ہے جو شیطان اور یہودیوں کے دام میں پھنسا ہوا ہے۔ برسرِ میدان قیادت تو امریکہ کی ہے، مگر اُس کے پیچھے اصل طاقت اور منصوبہ ساز یہود ہیں۔ یہودی چاہتے ہیں کہ اپنے مالیاتی شکنجے میں پوری دنیا کو کس لیں جبکہ امریکہ یہ چاہتا ہے کہ پوری دنیا پر ہمارا قبضہ مکمل ہو جائے۔ صہیونیوں کا اپنا مخصوص پانچ نکاتی ایجنڈا ہے جو درج ذیل ہے۔

(۱) اُن کے بقول ''شرکی قوتوں'' کے خلاف عظیم جنگ ہونی چاہیے، جسے اُن کے مذہبی لٹریچر میں آرمیگاڈان کا نام دیا گیا ہے۔

(۲) آرمیگاڈان کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل قائم ہونا چاہیے۔

(۳) پھر مسجد اقصیٰ اور گنبدِ صحرہ کو گرا دینا چاہیے۔

(۴) مسجد اقصیٰ کی جگہ تھرڈ ٹمپل بنایا جائے جو ۱۰۰۰ ق م میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا تھا مگر بعد ازاں بخت نصر نے اُسے تباہ کر دیا۔ پھر اُس کی دوبارہ تعمیر کی گئی، مگر ۷۰ء میں اُسے ٹائٹس رومی نے برباد کر دیا تھا، تب سے یہ آج تک گرا پڑا ہے۔

(۵) تھرڈ ٹمپل تعمیر کرنے کے بعد اُس میں تختِ داوٗدی لا کر رکھ دیا جائے۔ یہ ایک پتھر ہے جس پر بٹھا کر حضرت داوٗد علیہ السلام کی تاج پوشی کی گئی تھی۔ بعد ازاں اِس پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تاج پوشی کی گئی اور اسے ہیکل سلیمانی میں رکھا گیا۔ جب ٹائٹس نے یروشلم کو تاراج اور ہیکل سلیمان کو برباد کر دیا تو واپس جاتے ہوئے وہ اِس پتھر کو اپنے ساتھ روم لے گیا۔ روم سے یہ پتھر آئر لینڈ، وہاں سے سکاٹ لینڈ اور وہاں سے انگلینڈ لایا گیا، اور یہاں پارلیمنٹ کے سامنے واقع چرچ میں رکھ دیا گیا اور ایک کرسی میں فٹ کر دیا گیا۔ اِسی کرسی پر تمام انگریز بادشاہوں کی تاج پوشی ہوتی ہے۔

صلیبی و صہیونی ایجنڈا بتدریج آگے بڑھے گا اور پھر جنگوں کا وہ دور آئے گا جس کی پیشین گوئیاں احادیث میں کی گئی ہیں۔ پھر حضرت مہدی آئیں گے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور پھر وہ دور آئے گا کہ عالمی سطح پر اسلام کا نظام قائم ہوگا اور تب یہ نظام گلوبل ہوگا۔ اسی کی طرف ایک حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے جو حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا' وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُهَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْهَا)) (۱)

''اللہ نے مجھے پوری زمین کو لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھا دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی۔ اور یقین رکھو کہ میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھائے گئے۔''

ایک اور روایت میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ کَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَذُلِّ ذَلِیْلٍ - اِمَّا یُعِزُّهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَیَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا اَوْ یُذِلُّهُمْ فَیَدِیْنُوْنَ لَهَا)) - قُلْتُ: "فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ" (۲)

''دنیا میں نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا' خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ (یعنی) یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالا دستی تسلیم کر کے اس کی فرماں برداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' میں (راوی) نے کہا: تب تو سارے کا سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے گا۔

اسی دور کا نقشہ اقبال نے اپنے اشعار میں یوں کھینچا ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

(۱) صحیح مسلم' کتاب الفتن واشراط الساعة' باب هذه الامة بعضهم ببعض۔

(۲) رواه احمد فی "المسند" بسند صحیح۔ تخریج مشکاة المصابیح للالبانی۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

## سخت دن آنے والے ہیں

یہ بات بھی واضح ہو کہ اگرچہ پوری دنیا میں بالآخر اسلام کا غلبہ ہو جائے گا' مگر اس سے پہلے ہم پر بڑا سخت اور کڑا وقت آنے والا ہے۔ ہم پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے کوڑے برسنے والے ہیں۔ عالم عرب پر تو خاص طور پر اللہ کا کوڑا برسے گا۔ اس لیے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہوئی۔ اللہ نے ان کو بہت اونچا مقام دیا' کہ انہی میں سے حضورﷺ کی بعثت ہوئی۔ حضورﷺ عربی النسل تھے۔ اب اس سے بڑی فضیلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی زبان میں اللہ کا کلام موجود ہے۔ مگر اس تمام تر فضیلت کے باوجود انہوں نے بھی زمین پر اللہ کا دین نافذ نہیں کیا۔

عربوں میں سے بعضوں نے امریکہ کو اپنا قبلہ وکعبہ بنالیا اور بعضوں نے روس کو اپنا امام بنالیا' مگر اسلام کی طرف کسی نے بھی پیش قدمی نہیں کی۔ لہٰذا یہ اللہ کی طرف سے شدید سزا کے مستحکم ہیں۔ اس کی خبر بھی حضورﷺ نے دے رکھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ)) ''تباہی و بربادی ہے عربوں کے لیے اس شر سے کہ جو قریب آ چکا ہے۔''

عربوں کے بعد سب سے بڑے مجرم ہم پاکستانی مسلمان ہیں۔ ہم نے یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ ہم نے اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگی تھیں کہ خدایا ہمیں انگریز کی غلامی سے نکال اور ہندو کی غلامی میں جانے سے بچا۔ قیام کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ہمارے اندر کوئی طاقت نہیں تھی' ہماری کوئی حیثیت نہیں تھی کہ پاکستان بنا سکتے۔ کوئی ہمارا پشت پناہ نہیں تھا۔ برطانوی حکومت ہمارے سخت خلاف تھی۔ ماؤنٹ بیٹن گاندھی کا چیلا تھا اور قائداعظم محمد علی جناح سے شدید نفرت کرتا تھا۔ پھر یہ کہ معاشی طور پر ہم کمزور تھے۔ تجارت پر ہندو قابض تھے۔ بڑے بڑے صنعت کار وہی تھے۔ تعلیم میں بھی وہ ہم سے بہت آگے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ نے ہمیں یہ ملک دیا' تاکہ دیکھے ہم آزاد وطن حاصل کر کے کیا کرتے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ اے موسیٰ علیہ السلام ہم پر تو آپؑ کے آنے سے پہلے بھی ظلم ہو رہے تھے اور اب بھی ہو رہے ہیں' ہمارا حال تو نہیں بدلا۔ اِس پر آپؑ نے فرمایا:

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ

مبارک شہید ہوئے ہیں اور اتنا خون بہا ہے کہ آپ بے ہوش ہو کر گر گئے اور یہ خبر پھیل گئی کہ آپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ غزوۂ احزاب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے' یا رسول اللہ! اب تو ہمارے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ دیکھئے' ہم نے پتھر باندھ کر اپنے پیٹوں کو چادر سے کس کر اپنے آپ کو کھڑا کیا ہوا ہے۔ اس موقع پر آپ نے اپنا کرتہ اُٹھا کر دکھایا تو آپ کے جسم اطہر پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ آپ کو یہ تمام تکلیفیں غلبۂ دین حق کے مشن میں اُٹھانا پڑیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کو بنی اسرائیل آپ سے زیادہ پیارے تھے کہ ذرا بھوک لگی تو اُن پر من وسلویٰ اتار دیا۔ دھوپ لگی تو اوپر بادلوں کا سائبان کر دیا۔ پیاس لگی تو پتھر سے ۱۲ چشمے جاری کر دیئے۔ ہرگز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا مقام تو یہ ہے کہ ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ رسول خدا ﷺ کو آزمائشوں اور امتحانات سے اس لیے گزارا گیا' تاکہ آپ کی سیرت امت کے لیے نمونہ بنے۔ اللہ چاہتا تو حضور ﷺ کے پاؤں مبارک میں کانٹا تک نہ چبھتا اور انقلاب آ جاتا۔ آپ محبوبِ ربّ العالمین تھے۔ کون یہ چاہے گا کہ اپنے محبوب کے پاؤں میں کانٹا چُبھا ہوا دیکھے۔ اللہ تعالیٰ یوں بھی کر سکتا تھا کہ آپ کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچتی اور دین غالب ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو اُمت محمدیہ کے لیے نمونہ بنانا تھا' جس نے بعد میں شہادت علی الناس کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ راہ حق میں آپ پر تکالیف اس لیے آئیں' تاکہ آپ کی اُمت پر حجت قائم ہو جائے اور اسے معلوم ہو جائے کہ اِس راہ میں بھوکا پیاسا رہنا پڑے گا' جیسے حضور ﷺ نے بھوک پیاس برداشت کی اور ہر طرح کے مصائب و آلام سے گزرنا ہوگا' پھر جا کر اللہ کی مدد آئے گی۔ اظہار دین حق کے مشن میں آپ کے سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم کو جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ فلسفہ یہی تھا کہ یہ کام یونہی نہیں ہو جائے گا۔ اس راہ میں قربانیاں دینی پڑیں گی۔ نبیؐ کے ہاتھوں اللہ نے جزیرہ نمائے عرب میں اپنے دین کو غالب کر دیا۔ آپ نے قرآن کی دعوت بھی پہنچا دی اور جزیرۂ نمائے عرب کی حد تک غلبۂ دین کا مشن بھی مکمل فرما لیا۔ اب اس مشن کی تکمیل اُمت مسلمہ کے ہاتھوں میں ہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ غلبۂ دین کا یہ کام کیسے ہوگا؟ اس کا طریق کار کیا ہے؟ اس پر گفتگو آئندہ نشست میں ہوگی۔ ان شاء اللہ!

خطبۂ سوم

# انقلابِ نبویؐ کا مرحلۂ اوّل:

# جماعت سازی اور اُس کا نبویؐ طریق

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیات قرآنی ☆' احادیثِ نبویؐ اورادعیۂ ماثورہ کے بعد!

معزز حاضرین اور محترم خواتین! سیرت خیر الانامؐ کے سلسلہ میں آج میری گفتگو کا عنوان ہے: انقلاب نبوی کا مرحلہ اوّل: جماعت سازی اور اُس کا نبویؐ طریق۔ ظاہر ہے اسلامی انقلاب مرد لائیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مردان کار کہاں سے آئیں گے' اور حزب اللہ کی تشکیل اور تنظیم کیسے ہوگی اور اس کے کارکنان کا تزکیہ اور تطہیر کیونکر ہوگی۔ اس کا نبویؐ طریقہ کار کیا ہے۔ اب تک جو دو خطبے ہو چکے ہیں' اُن میں پہلا خطبہ زیادہ بنیادی علمی نوعیت کا تھا۔ اُس میں بتایا گیا تھا کہ فلسفۂ دین میں نبوت و رسالت پر ایمان کا مقام کیا ہے۔ دوسرے خطبے میں یہ بات واضح کی گئی کہ حضور ﷺ کی عظیم المرتبت شخصیت میں نبوت و رسالت اپنے تکمیل کے مرحلے کو کیونکر پہنچی۔ اس کے دو مظاہر بتائے گئے تھے۔ ایک یہ کہ آپؐ پر ہدایت کامل ہوگئی۔ ہدایت کا آغاز تو حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا تھا' مگر یہ ہزاروں سال ارتقائی مراحل طے کر کے قرآن مجید میں آ کر اپنے آخری اور تکمیلی درجے کو پہنچ گئی۔ اور چونکہ ہدایت کامل ہوگئی' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا۔ دوسرے یہ کہ انسان کے تمدنی ارتقاء کے ساتھ دین حق بھی' ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے محمد رسول اللہ ﷺ پر آ کر مکمل ہوگیا۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۳ میں تکمیل رسالت کے ان دونوں مظاہر کا ذکر بایں الفاظ کیا گیا ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾

''آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔''

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ پر اپنا دین بھی مکمل کر دیا اور ''نعمت'' کی بھی تکمیل فرمادی۔ اور نعمت سے مراد نعمت ہدایت ہے۔ اگرچہ ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ صحت بڑی نعمت ہے' یہ دولت بھی نعمت ہے' اولاد بھی نعمت ہے۔ یقیناً یہ سب چیزیں نعمت ہیں۔ مگر سب سے بڑی بلکہ اصل نعمت نعمت ہدایت ہے۔ ہدایت کے ساتھ ہی یہ چیزیں بھی نعمت ہیں۔

---

☆ سورۃ الجمعہ' آیات: ۱۔۲

اگر ہدایت نہیں ہے تو پھر حقیقت میں کوئی شے بھی نعمت نہیں ہے۔ چنانچہ اگر صحت ہے مگر ہدایت نہیں ہے تو پھر یہ خرابیوں کا باعث بنے گی۔ پھر بدمعاشیاں ہوں گی' گل چھرے اڑائے جائیں گے' معاشرے میں فساد اور گندگی پھیلے گی۔ اسی طرح اگر دولت ہے مگر ہدایت نہیں ہے تو پھر اسراف وتبذیر کے شیطانی مظاہرے اور عیاشیاں ہوں گی' جیسا کہ آج کل دولت مندوں کے ہاں ہو رہا ہے۔ پس یہ دو مظاہر تکمیل نبوت کے ہیں۔ اسی طرح تکمیل رسالت کے بھی دو مظاہر ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ کو دین حق کی صرف تبلیغ ہی نہیں کرنا تھی بلکہ اس کو قائم بھی کرنا تھا۔ دوسرے دین کا غلبہ صرف جزیرہ نما عرب ہی میں نہیں ہونا بلکہ پوری دنیا میں ہونا ہے۔ یوں نبوت و رسالت کی تکمیل کے چار مظاہر ہو گئے۔

## نبی اکرم ﷺ کو تحریکی رول دیا گیا

اب آیئے' آج کے موضوع کی طرف! نبی اکرم ﷺ کو اللہ نے جو رول دیا وہ تحریکی رول ہے' وہ ایک انقلابی عمل ہے۔ آپؐ کو دین حق کو غالب کرنا تھا۔ یہ بات واضح ہو کہ کسی بھی نظام کو قائم کرنے کے لیے مخصوص طریقہ کار پر عمل کرنا ہوگا۔ تب ہی پہلے سے قائم نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا ممکن ہوگا' اور نیا نظام قائم ہوگا۔ پہلے سے رائج نظام کو ختم کریں گے تو پھر ہی نیا نظام قائم ہوگا۔ اس لیے کہ نظام کہیں بھی دو نہیں ہو سکتے۔ مذہب سو بھی ہو سکتے ہیں مگر نظام ایک ہی ہوگا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ کسی بھی جگہ نظام کا خلا نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی نظام بہرحال موجود ہوتا ہے۔ مثلاً کہیں بادشاہت کا نظام ہوگا' کہیں جمہوریت کا نظام ہوگا' کہیں سرمایہ داری ہوگی' کہیں کمیونزم کا نظام ہوگا' کہیں قبائلی سسٹم ہوگا' کہیں جاگیرداری ہوگی۔ کوئی جگہ ایسی نہیں ہو سکتی جہاں کوئی نظام نہ ہو' اور کسی جگہ پر نیا نظام لانے کے لیے پہلے سے قائم نظام کو اکھاڑ کر پھینکنا ضروری ہے۔ اسی کا نام انقلاب (revolution) ہے۔ قرآن حکیم میں تین مرتبہ وہ الفاظ آئے ہیں جن میں آپؐ کا مشن ''اظہار دین علی الدین کلہ'' بتایا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ﴾

''وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) دے کر اور دین الحق کے ساتھ' تا کہ وہ اُسے پورے کے پورے دین پر غالب کریں۔''

حضور ﷺ کی کچھ حیثیتیں تو وہ ہیں جو تمام انبیاء علیہم السلام میں مشترک ہیں۔ مثلاً سب انبیاء بشیر ہیں' سب نذیر ہیں' سب داعی الی اللہ ہیں' سب اپنے اپنے مقام پر سراج منیر ہیں' سب شاہد بھی

ہیں۔حضور ﷺ کے لیے بھی یہی الفاظ آئے ہیں۔سورۃ الاحزاب میں فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝﴾

''اے پیغمبر ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔اور اللہ کی طرف بلانے والا اور چراغ روشن۔''

پس یہ حیثیتیں آپؐ اور دوسرے انبیاء ورسل کے درمیان مشترک ہیں' لیکن اظہار دین حق کے الفاظ صرف اور صرف حضور ﷺ کے لیے آئے ہیں' اور جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ ایک بار نہیں' تین بار آئے ہیں۔اس آیت ﴿هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ کو شاہ ولی اللہ دہلوی نے پورے قرآن کا عمود قرار دیا ہے۔یعنی قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا جب تک یہ آیت نہ سمجھ آ جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن کا عمود ہے یا نہیں البتہ یہ سیرت کا عمود ضرور ہے۔سیرت ہرگز سمجھ میں نہیں آئے گی جب تک یہ آیت سمجھ میں نہ آ جائے۔گویا شاہ ولی اللہ کے نزدیک یہ آیت قرآن کا عمود اور میرے نزدیک یہ سیرت کی کلید ہے۔پھر یہ کہ اظہار دین حق کا جو مضمون یہاں اور دو دیگر مقامات پر بیان ہوا ہے' اس کے لیے قرآن مجید میں کئی اور اصطلاحات بھی آئی ہے۔ایک اصطلاح تکبیر رب ہے۔جیسا کہ فرمایا: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ ''اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو۔'' دوسری اصطلاح اقامت دین ہے۔ فرمایا: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ......﴾ یعنی ''دین کو قائم کرو......''۔ایک اور اصطلاح اَلدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ہے۔سورۃ الانفال میں فرمایا گیا: ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ ہے' یعنی ''دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے''۔ایک اور اصطلاح اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔فرمایا: ﴿كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ غلبۂ دین کے مضمون کی تکرار اور مختلف اسالیب میں بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس راہ میں جدوجہد کی کیا اہمیت ہے۔مگر افسوس کہ دین کے تعلق سے ہم اتنی اہم ذمہ داری کو قطعاً فراموش کر بیٹھے ہیں۔مسلمانوں کو خیال ہی نہیں کہ غلبۂ دین کے لیے اُنہیں جدوجہد کرنا ہے' یہ اُن کا فریضہ ہے۔اگر اسلام کے حوالے سے انہیں کوئی چیز یاد ہے تو وہ نماز' روزہ ہے اور وہ بھی کسی حد تک۔علامہ اقبال نے کہا تھا۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے!

## انقلاب کا مفہوم

اس تمہید کے بعد سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ انقلاب کسے کہتے ہیں۔ انقلاب کے لفظی معنی تبدیلی کے ہیں۔ ہم عام طور پر یہ لفظ کسی بھی لفظ کے ساتھ جوڑ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً علمی انقلاب' ثقافتی انقلاب' سائنسی انقلاب' فوجی انقلاب۔ لیکن لفظ ''انقلاب'' کے اصطلاحی مفہوم میں اس استعمال کی گنجائش نہیں' بلکہ کسی معاشرے کے سیاسی نظام' معاشی نظام یا سماجی نظام میں سے کسی ایک میں بنیادی تبدیلی کو صحیح انقلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آج دنیا بھر میں انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم مانا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک حصہ فرد کی انفرادی زندگی سے متعلق ہے' جبکہ دوسرا حصہ زندگی کے اجتماعی معاملات کو محیط ہے۔ ان میں سے مقدم الذکر حصہ مذہب کا دائرۂ کار ہے' جو کہ عقائد (dogmas) ' مراسم عبودیت (rituals) اور سماجی رسومات (social customs) پر مشتمل ہے۔ آج دنیا بھر میں ان معاملات میں فرد کو آزاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جس طرح کے چاہے عقائد اپنا لے۔ چاہے وہ ایک خدا کو مانے' چاہے سو کو مانے یا ہزار کو مانے' چاہے کسی کو بھی نہ مانے۔ جس طرح چاہے مراسمِ عبودیت بجا لائے۔ چاہے گوشہ نشین ہو کر تپسیائیں کرے' چاہے بتوں کے آگے سجدے کرے' یا ایک نادیدہ خدا کی پرستش کرے۔ مراسمِ عبودیت کی اسے آزادی ہے۔ چاہے روزے رکھے' نماز پڑھے' چاہے مندر میں جائے یا چرچ میں' اجازت ہے۔ اسی طرح سماجی رسومات ادا کرنے میں وہ آزاد ہے۔ شادی کے موقع پر چاہے نکاح پڑھوائے' چاہے پھیرے ڈلوائے۔ فوت شدہ شخص کی میت کو چاہے دفن کیا جائے' چاہے اسے جلا دیا جائے۔

زندگی کا دوسرا حصہ تہذیب' تمدن' ریاست اور سیاست یعنی اجتماعی نظام سے متعلق ہے اور یہ سیاسی نظام' معاشی نظام اور سماجی نظام (The Politico-Socio-Economic System) پر مشتمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق مذہب سے نہیں ہے۔ اسی کا نام سیکولرازم ہے۔ واضح رہے کہ سیکولرازم کا مطلب لامذہبیت نہیں ہے' بلکہ یہ ہمہ مذہبیت' لادینیت کے اصول پر مبنی ہے۔ سیکولرازم میں مذہب تو سارے قابلِ قبول ہیں۔ یہ بات تو بش بھی کہتا تھا کہ "We are ready to embrace Islam" اسلام بطور مذہب پر انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے امریکہ میں آ کر سینیگاگ اور چرچ خریدے اور انہیں مساجد بنا لیا' ہم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انہوں نے یہاں بڑی تعداد میں افرو امریکنز

کو اور کچھ گوروں کو بھی convert کر کے مسلمان بنا لیا' ہم نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ بحیثیتِ مذہب ان کی اسلام سے کوئی جنگ نہیں ہے' لیکن ایک نظام (Politico-Socio-Economic system) کی حیثیت سے اسلام انہیں قطعاً گوارا نہیں۔ اسلام کے اسی تصور کو وہ فنڈامنٹلزم کا نام دیتے ہیں اور فنڈامینٹلزم کو دہشت گردی (terrorism) کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا نعرہ لگاتے ہیں تو کبھی ''بنیاد پرستی کے خلاف جنگ'' کا۔ حقیقت میں یہ جنگ اسلام کے نظامِ حیات کے خلاف ہے۔ یہ جنگ اسلام کے عقائد' عبادات اور رسومات کے خلاف نہیں ہے۔

آج کی اصطلاح میں انقلاب اجتماعی نظام میں کسی تبدیلی کو کہتے ہیں۔ مذہبی میدان میں کسی بڑی سے بڑی تبدیلی کو بھی انقلاب نہیں کہا جا سکتا۔ تاریخ انسانی میں سب سے بڑی مذہبی تبدیلی 300 عیسوی میں ہوئی تھی' جب شہنشاہِ روم قسطنطینِ اعظم نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور ساری سلطنت عیسائی ہو گئی تھی۔ مذہبی تاریخ میں اتنی بڑی تبدیلی (conversion) کبھی نہیں ہوئی۔ سلطنت روما اُس وقت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی' یعنی پورا شمالی افریقہ' پورا مشرقی یورپ اور پورا مغربی ایشیا۔ لیکن اتنی بڑی مذہبی تبدیلی کو بھی کبھی انقلابات کی تاریخ میں نہیں گنوایا گیا۔ اس لئے کہ اس مذہبی تبدیلی سے سیاسی' معاشی یا سماجی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی' مذہب کی تبدیلی کے باوجود اجتماعی نظام بدستور وہی رہا۔ پس انقلاب (revolution) وہ تبدیلی کہلائے گی جو کسی ملک کے سیاسی نظام' معاشی نظام' یا سماجی نظام سے متعلق ہو اور بنیادی نوعیت کی ہو۔

## تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب

اب ہم دنیا کے چند مشہور انقلابات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان میں ''انقلابِ فرانس'' بہت مشہور ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ واقعی انقلاب تھا۔ لیکن اس سے صرف سیاسی نظام میں تبدیلی آئی تھی۔ مذہب پہلے بھی عیسائیت تھا' بعد میں بھی وہی رہا۔ سماجی ڈھانچے (social structure) میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ دوسرا بہت مشہور انقلاب روس کا بالشویک انقلاب ہے جو ۱۹۱۷ء میں آیا۔ اس سے صرف معاشی نظام تبدیل ہوا۔ چنانچہ تمام ذرائع پیداوار قومیا لئے گئے اور انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ نوٹ کیجئے کہ یہ دونوں انقلابات ہیں جبکہ رومن امپائر کا بیک وقت کرسچین ہو جانا انقلاب نہیں ہے۔

اب آپ ذرا محمد رسول اللہ ﷺ کے برپا کردہ انقلاب کا جائزہ لیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیں کہ کیا واقعی حضور ﷺ نے انقلاب برپا کیا یا ہم صرف جوشِ عقیدت میں یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف انقلاب برپا کیا بلکہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا۔ یہ بات محض جذباتی انداز سے نہیں بلکہ ٹھنڈے تجزیے (Cold Analysis) سے ثابت کی جاسکتی ہے۔ اس پر اپنوں کی ہی نہیں اغیار کی بھی گواہیاں موجود ہیں۔ عربی کا مقولہ ہے: ''اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ'' یعنی ''اصل فضیلت وہ ہوتی ہے جس کا دشمن بھی اقرار کریں''۔ دوست اور اعتقاد رکھنے والے تو ہر چیز کی تعریف ہی کریں گے' اصل تعریف وہ ہے جو دشمن کی زبان سے ہو۔ اگر شیر دل کنگ رچرڈ نے صلاح الدین ایوبی کی تعریف کی تو معلوم ہوا کہ واقعتاً صلاح الدین ایوبی بڑی عظیم شخصیت تھی۔

انقلاب نبویؐ کے حوالے سے پہلی گواہی ایم این رائے کی ہے۔ ایم این رائے ایک بنگالی ہندو تھا اور وہ انٹرنیشنل کمیونسٹ آرگنائزیشن کا رکن تھا۔ اس نے ۱۹۲۰ء میں بریڈلا ہال لاہور میں ''اسلام کا تاریخی کردار'' (The Historical Role of Islam) کے عنوان سے لیکچر دیا۔ اپنے لیکچر میں اُس نے صاف لفظوں میں کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب محمد (ﷺ) نے برپا کیا۔ واضح رہے کہ وہ عقیدت مند نہیں ہے' ایک بنگالی ہندو ہے اور ٹاپ کا کمیونسٹ ہے' لیکن وہ بھی یہ بات تسلیم کر رہا ہے۔ یہ گواہی پچھلی صدی کے آغاز سے ۲۰ برس بعد کی ہے۔

دوسری گواہی امریکی ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کی ہے۔ اُس نے پچھلی صدی کے اختتام سے بیس برس پہلے ایک کتاب "The 100" لکھی۔ اس کتاب میں اُس نے پانچ ہزار سالہ معلوم انسانی تاریخ میں سے ایسے ایک سو انسانوں کا انتخاب کر کے ان کی درجہ بندی (gradation) کی' جنہوں نے انسانی تمدن کے دھارے کے رخ کو موڑنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔ اس درجہ بندی میں وہ نمبر ایک پر لایا محمد رسول اللہ ﷺ کو۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ مذہب کے اعتبار سے عیسائی ہے۔ اس کی یہ کتاب دنیا میں بہت عام ہوئی ہے' لیکن اشاعت کے بعد وہ بہت جلد نایاب ہوگئی تھی اور عام خیال یہ تھا کہ شاید کسی سازش کے تحت اسے غائب کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس نے اس کتاب میں (عیسائیوں کے نزدیک خدا کے اکلوتے بیٹے) حضرت مسیح علیہ السلام کو نمبر تین پر رکھا اور حضور ﷺ کو نمبر ایک پر لایا' اور یہ بات عیسائی دنیا کے لئے قابل قبول اور قابلِ برداشت نہیں تھی۔ اس نے لکھا ہے:

*"My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."*

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے نزدیک انسانی زندگی کے دو علیحدہ علیحدہ میدان ہیں۔ایک ہے مذہب' اخلاق اور روحانیت کا میدان' جبکہ دوسرا ہے تمدن' تہذیب' سیاست اور معاشرت کا میدان' اور ان دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب (supremely successful) انسان تاریخ انسانی میں صرف اور صرف ایک ہی ہیں اور وہ ہیں حضرت محمد ﷺ۔جن لوگوں کو بالعموم بڑا سمجھا جاتا ہے ان کی عظمت کسی ایک پہلو سے نمایاں ہوتی ہے۔عبادت گزاری اور نفس کشی میں گوتم بدھ بہت اونچا ہے۔اخلاقی تعلیمات کے اعتبار سے حضرت مسیح علیہ السلام بہت اونچے ہیں' لیکن ریاست' حکومت اور سیاست میں ان کا کوئی دخل نہیں۔فتوحات اور ملک گیری کے حوالے سے سکندرِ اعظم بہت اونچا ہے' اٹیلا بہت اونچا ہے' چنگیز خان بہت اونچا ہے' اکبر اعظم بہت اونچا ہے' اور بھی بڑے بڑے حکمران ہو گزرے ہیں لیکن دین' اخلاق اور روحانیت میں ان کا کوئی مقام تھا؟ یہاں زیرو سے بھی کام نہیں چلے گا' minus لانا پڑے گا۔تاریخِ انسانی میں صرف اور صرف ایک ہی انسان ہے جو ہر دو اعتبار سے بلند ترین اور کامیاب ترین قرار پاتا ہے اور وہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ۔

اغیار کی گواہیوں میں سے تیسری گواہی ایچ جی ویلز کی ہے۔لیکن اس کی جس عبارت کا یہاں حوالہ دیا جا رہا ہے اس کی کتاب "A Concise History of the World" کے نئے ایڈیشن سے اس عبارت کو نکال دیا گیا ہے۔واقعتاً کسی دشمن کی زبان سے اس سے بڑا خراجِ تحسین ممکن نہیں۔اس لئے کہ ایچ جی ویلز بدترین دشمن ہے۔اس نے حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین (دو بدبخت جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے) ان سے کہیں زیادہ زہریلے اور ان سے کہیں زیادہ کمینگی والے جملے کہے ہیں۔لیکن جب اُس نے آنحضور ﷺ کے خطبۂ حجۃ الوداع کے مندرجہ ذیل الفاظ کا حوالہ دیا ہے تو وہ گھٹنے ٹیک کر خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔خطبۂ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((يَا اَيُّهَا النَّاسُ! اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ ' اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ

عَلٰی اَحْمَرَ اِلاَّ بِالتَّقْوٰی)) (۱)

''لوگو! آگاہ ہو جاؤ' یقیناً تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔''

ایچ جی ویلز اگرچہ عیسائی ہے' لیکن خطبہ حجۃ الوداع کا حوالہ دینے کے بعد وہ یہ اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ:

''اگرچہ انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے اور ایسے وعظ ہمیں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی تھے جنہوں نے تاریخِ انسانی میں پہلی بار ان اصولوں پر ایک معاشرہ قائم کیا۔''

چنانچہ دشمنوں کی گواہی سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا فرمایا۔

انقلابِ محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کا انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس سے تقابل کریں تو نظر آتا ہے کہ انقلابِ فرانس میں صرف سیاسی نظام بدلا اور انقلابِ روس میں صرف معاشی نظام تبدیل ہوا لیکن انقلابِ محمدیؐ میں ہر چیز بدل گئی۔ مذہب بھی بدل گیا' عقائد بھی بدل گئے' رسومات بھی بدل گئیں' سیاسی نظام بھی بدل گیا' معاشی نظام بھی بدل گیا' معاشرت بھی بدل گئی۔ کوئی بھی شے اپنی سابقہ حالت پر قائم نہیں رہی۔ ڈھونڈ کر بتایئے کہ فلاں چیز جوں کی توں رہ گئی۔ جس معاشرے اور قوم میں پڑھے لکھے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے' اس قوم کو آپؐ نے علم کے میدان میں دنیا کا امام بنا دیا۔ انہوں نے نئے نئے علوم ایجاد کئے' پوری دنیا کا علم سمیٹ کر' ہندوستان اور یونان تک سے علم لے کر' اور اسے مزید develop کر کے دنیا کے سامنے رکھا۔ تو پہلی بات یہ ثابت ہوئی کہ دنیا کا جامع ترین' گھمبیر ترین اور most profound انقلاب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا انقلاب تھا۔ کوئی دوسرا انقلاب اس کے مقابلے میں نہیں آ سکتا۔ باقی سب انقلابات جزوی (partial) تھے۔

انقلابِ محمدیؐ اس حوالے سے بھی بے مثال ہے کہ سارے انقلابی عمل کی قیادت آپؐ

---

(۱) السلسلة الصحيحه' المحدث البانی' راوی: جابر بن عبداللہؓ ۲۷۰۰

نے بنفسِ نفیس فرمائی۔ سیرت کا مطالعہ کریں تو آپ کو نظر آئے گا کہ آپؐ مکے کی گلیوں میں ایک مبلغ کی حیثیت سے گھوم رہے ہیں، تبلیغ کر رہے ہیں، لوگوں کے گھروں میں جا کر بات چیت کر رہے ہیں۔ آپؐ ہی بدر اور احد کے معرکوں میں فوج کو کمانڈ کر رہے ہیں۔ یہ خصوصیت دنیا کے کسی اور انقلاب میں موجود نہیں ہے۔ باقی دنیا کے انقلاب کئی نسلوں میں آئے۔ کسی ایک شخص نے فکر دیا، کسی دوسرے نے اُس فکر کے مطابق جدوجہد کر کے وہ انقلاب برپا کر دیا۔ دنیا کے انقلابات میں سے کوئی بھی دوسرا انقلاب ایک حیاتِ انسانی کے عرصے (span) میں پورا نہیں ہوا، بلکہ فکر دینے والے مرکھپ گئے، بعد میں کہیں وہ فکر پروان چڑھا اور اس کی بنیاد پر کہیں انقلاب آ گیا۔ مثال کے طور پر انقلاب فرانس کا فکر والٹیئر اور روسو نے دیا تھا، میدانِ عمل میں اُن کا کوئی کردار نہیں۔ اسی طرح اشتراکی انقلاب کی فکر مارکس اور اینجلز نے دی۔ مارکس نے جرمنی میں بیٹھ کر ''ڈاس کیپیٹل'' نامی کتاب لکھ دی، مگر یہ انقلاب اُن کے ہاتھوں نہیں آیا، بلکہ جرمنی اور انگلستان میں آیا ہی نہیں۔ انقلاب عملاً ۱۹۱۷ میں بالشویک کے ہاتھوں روس میں آیا۔ بہرحال حضور ﷺ کی زندگی اس اعتبار سے واقعتاً contrast کی حامل ہے کہ ایک انقلابی دعوت کا آغاز بھی آپؐ نے کیا اور اسے کامیابی کی آخری منزل تک بھی خود پہنچایا۔ جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب میں کل ۲۳ سال کے عرصے میں، الف سے ی تک انقلاب کے تمام مراحل طے ہو گئے۔ کوئی ہے تاریخ میں اس کی مثال؟ میں پھر ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے وہی الفاظ دہراؤں گا کہ He is the only, the only, the only person کہاں گلی گلی دعوت دینے والا ایک شخص، کہاں ایک فوج کی کمان کرنے والا قائد---کوئی ہے مناسبت؟

اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ آج عہدِ حاضر میں اجتماعیات، سوشیالوجی یا پولیٹکل سائنس کا کوئی طالب علم پوری دیانت داری سے انقلاب کا صحیح طریق کار اخذ کرنا چاہے تو اسے صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے مکمل راہنمائی مل سکتی ہے۔ مارکس، اینجلز، لینن یا والٹیئر کی زندگیوں سے اس ضمن میں قطعاً کوئی راہنمائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ گویا طریقِ انقلاب کے لئے اب دنیا کے سامنے صرف ایک ہی منبع و سرچشمہ (source) ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے۔

## انقلاب برپا کرنا کھیل نہیں

انقلاب کے حوالے سے یہ بات ذہنوں میں بالکل واضح ہو جانی چاہیے کہ انقلاب برپا

کرنا کوئی کھیل نہیں ہے' اور نہ ہی یہ کوئی دل پسند مشغلہ ہے بلکہ یہ نہایت مشکل کام ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ دیکھئے' ایک ہے دعوت و تبلیغ۔ جیسے ہمارے تبلیغی بھائی بستر اُٹھائے ہوئے گھوم رہے ہوتے ہیں۔ دور دراز کے سفر کرتے ہیں۔ گھر کا نرم بستر چھوڑ کر راتوں کو مسجدوں کے سخت فرش پر سوتے ہیں۔ تکلیف اور محنت' مشقت تو اس کام میں بھی ہے' لیکن اس میں جان و مال کا خطرہ نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو جائے گا کہ کوئی گالی دے دے گا' کوئی پاگل کہہ دے گا اور بس۔ یہی معاملہ علمی کام کا بھی ہے۔ اس میں بھی یہی ہوگا کہ آپ سے کسی کا فکری اختلاف ہو جائے گا اور کوئی آپ کی ریسرچ کے مقابلے میں اپنی ریسرچ لے آئے گا۔ وہ آپ کو پاگل قرار دے دے گا' آپ اس کو پاگل قرار دے دیں گے۔ مگر جان کو کوئی خطرہ اس میں بھی نہیں ہوگا۔ لیکن انقلابی جدوجہد وہ عظیم مشن ہے جس میں جان و مال کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انقلاب کی زد رائج الوقت نظام اور اس کے پروردہ لوگوں پر پڑتی ہے۔ یہ لوگ کیسے برداشت کریں گے کہ انقلاب کے علمبردار اُٹھیں اور اُس نظام کا قلع قمع کریں جو انہیں مراعات سے نوازتا ہے۔ وہ تو یہ کہیں گے کہ آؤ' انہیں ختم کرو' انہیں مارو' کہ یہ ہمارے نظام کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے مفادات کا یہ تقاضا ہے کہ سٹیٹس کو برقرار رہے اور یہ اس نظام کو بدلنے آئے ہیں' انہیں کچل دو۔ اسی لیے قرآن نے پہلے ہی بتا دیا کہ غلبۂ دین حق کی راہ میں آزمائشیں اور مشکلات آئیں گی۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾﴾

''اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے۔ تو صبر کرنے والوں کو (اللہ کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو۔ ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

اسی سورت میں آگے فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۗ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ﴿۲۱۴﴾

''کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ (یونہی) بہشت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تم کو پہلے لوگوں کی سی (مشکلیں) تو پیش آئی ہی نہیں۔ ان کو (بڑی بڑی) سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ (صعوبتوں میں) ہلا ہلا دیئے گئے' یہاں تک کہ پیغمبر اور مومن لوگ جوان کے ساتھ تھے سب پکار اٹھے کہ کب اللہ کی مدد آئے گی؟ دیکھو اللہ کی مدد (عن) قریب (آیا چاہتی) ہے۔''

## انقلابی عمل کے تین مراحل

اب آیئے' انقلابی عمل کے مراحل کی طرف! انقلابی عمل کے سات مراحل ہیں' چھ مراحل تو انقلاب برپا کرنے کے ہیں۔ یعنی انقلابی نظریہ کی اشاعت' تنظیم' تربیت' صبر محض' راست اقدام' مسلح تصادم — اور ساتواں مرحلہ انقلاب کو برآمد کرنا ہے۔ ظاہر ہے' ہر انقلاب کی یہ فطری خاصیت ہوتی ہے کہ وہ جغرافیائی' علاقائی یا ملکی اور قومی حدود کا پابند نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ پھیلتا ہے۔ کسی بھی انقلابی نظریہ کو نہ پاسپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے نہ ویزا کی۔ بلکہ وہ ان قیود سے آزاد ہوتا ہے۔ جدید اصطلاح میں اسے ''تصدیر الانقلاب'' کہتے ہیں۔ انقلاب اگر صحیح معنوں میں انقلاب ہو تو وہ ضرور پھیلتا ہے۔ فرانس کا انقلاب پہلے پہل فرانس میں آیا' مگر پھر دنیا بھر میں پھیل گیا۔ بالشویک انقلاب روس میں آیا' لیکن پھر لاطینی امریکہ تک پہنچ گیا۔ حضور ﷺ کا انقلاب پہلے عرب میں آیا۔ پھر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اس وقت کی آباد دنیا کا تقریباً آدھا حصہ اس انقلاب کے زیر نگیں آ گیا۔ یہ انقلاب کا خاصہ ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ پھیلے اور وسعت پذیر ہو۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کسی انقلاب کے حقیقتاً ''انقلاب'' ہونے کا حتمی ثبوت یہی ہے کہ وہ کسی علاقائی و جغرافیائی حد میں محدود ہو کر نہ رہ جائے' بلکہ پھیلے اور وسعت پذیر ہو۔ اگر وہ جغرافیائی حدود کے اندر محدود ہو کر رہ گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں جان نہیں تھی' اس کے بنیادی فلسفہ میں قوت تسخیر نہیں تھی' اس میں آفاقیت اور عالمگیریت نہیں تھی۔ بلکہ شاید اس کے اندر اصل فیصلہ کن عوامل صرف قومی و ملکی تھے۔ اس میں کوئی ایسا نظریہ' کوئی ایسا پیغام نہیں تھا جو بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہو اور جو قومی اور جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر نوعِ انسانی کے اذہان و قلوب میں اپنی جگہ بنا سکے۔ میں نے اپنی کتاب منہج انقلاب نبویؐ میں جو اِس موضوع پر مفصل کتاب ہے' سیرت کی روشنی میں انقلاب کے یہی سات (۱+۶)

مراحل بیان کیے ہیں۔اسی طرح اپنے ایک دوسرے کتابچہ ''رسولِ انقلابؐ کا طریق انقلاب'' میں میں نے اسلامی اصطلاحات سے ہٹ کر بتایا ہے کہ انقلابی عمل (revolutionary process) کے سات (۱+۶) مراحل ہیں۔لیکن اپنے ان خطبات میں میں نے مراحل انقلاب کومختصر کر کے تین (یعنی۱+۲) مراحل کی صورت میں بیان کر رہا ہوں۔انقلاب محمدی کے متذکرہ سات مراحل کو اگر اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے تو یہ تین مراحل بنیں گے۔دو مراحل انقلاب برپا کرنے کے اور ایک مرحلہ انقلاب کو برآمد کرنے کا۔علامہ اقبال کے دو اشعار میں نے بہت دفعہ سنائے ہیں۔اقبال داعیٔ انقلاب تھا' اگرچہ وہ میدان کا آدمی نہیں تھا۔وہ کلیم نہیں حکیم تھا۔لیکن اس کی حکیمی اور دانائی قابل داد ہے۔کہتا ہے ؎

گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد' گفتند کہ برہم زن!

اس شعر میں اقبال اللہ سے اپنا ایک مکالمہ بیان کر رہا ہے۔اللہ نے مجھ سے کہا' اے اقبال! میں نے تمہیں اپنی جس دنیا میں بھیجا ہے آیا وہ تمہارے ساتھ سازگار ہے؟ کیا تمہیں وہ پسند ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں' مجھے پسند نہیں! یہاں ظلم ہے' یہاں غریب پس رہا ہے۔یہاں مزدور کے رگوں کے خون کی سرخی سے شراب کشید کر کے سرمایہ دار پیتا ہے۔ ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دھقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!

سرمایہ دار نے مزدور کی رگوں میں دوڑنے والے خون سے سرخ شراب کشید کی ہے اور جاگیرداروں کے ظلم وستم سے دہقان کی کھیتی خراب ہے۔اس کے بچے بھوکے ہیں اور اس کی کھیتی سے ان کی غذا کا اہتمام نہیں ہو رہا۔یہ اقبال کی بڑی عظیم نظم ہے جس میں اس نے انقلاب کا نعرہ لگایا ہے۔تو اقبال کہتے ہیں کہ جب میں نے کہا کہ مجھے تیرا یہ جہان پسند نہیں' یہ میرے لئے سازگار نہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''برہم زن!'' یعنی اسے توڑ پھوڑ دو' درہم برہم کر دو! یہاں انقلاب برپا کر دو!!

اب اس انقلاب کا طریق کار کیا ہو؟ غلط نظام کو کیسے ختم کیا جائے' اسے اقبال نے دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔پہلے مصرعہ میں انقلاب کے متذکرہ چار مراحل اور دوسرے میں

دو مراحل بیان کیے ہیں ۔

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

یعنی پہلے درویشی کی روش اختیار کرو اور اپنا کام کرتے رہو۔ دعوت و تبلیغ میں لگے رہو۔ کوئی پاگل کہے یا کوئی گالی دے تو اُسے جواب میں دعا دو۔ یوں دکھائی دے گویا بدھ مت کے بھکشو بنے ہوئے ہیں۔ مارا جا رہا ہے مگر جواب نہیں دے رہے ہیں۔ اور جب تیار ہو جاؤ یعنی تعداد بھی کافی ہو، ٹریننگ بھی صحیح ہو چکی ہو، ڈسپلن کے بھی پابند ہو جاؤ اور ہر شے قربان کرنے کو تیار ہو جاؤ تو اب اپنے آپ کو سلطنتِ جم کے ساتھ ٹکرا دو۔ اسی سے انقلاب آئے گا۔ ٹکراؤ کے بغیر انقلاب نہیں آتا۔ محض وعظ سے انقلاب نہیں آیا کرتا۔ اور ٹکراؤ میں جانیں بھی جائیں گی، خون بھی دینا پڑے گا۔

## انقلاب کا پہلا مرحلہ: جماعت سازی اور اس کا طریق

انقلابی جدوجہد کے پہلے مرحلے کا عنوان ایک حقیقی انقلابی جماعت کی تیاری یعنی حزب اللہ کی تشکیل ہے، اور دوسرے مرحلے کا یک لفظی عنوان تصادم ہے۔ اس وقت موضوع بحث یہی پہلا مرحلہ ہے۔ یعنی مردانِ کار کی فراہمی اور حزب اللہ کی تشکیل و تنظیم اور تزکیہ و تطہیر کا نبویؐ طریقہ کار۔ یہ بات واضح کر دی جائے کہ جماعت سازی خاص طور پر نظریات کی بنیاد پر جماعت کی تشکیل دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ قومی سطح پر جماعت بنا لینا بڑا آسان کام ہے۔ رفاہی کام کے لیے جماعت بنانا بھی آسان ہے۔ اسی طرح علمی کام کے لیے جماعت بنا لینا بھی بہت آسان ہے۔ لیکن نظریاتی سطح پر، انقلاب برپا کرنے کے لیے جماعت بنانا انتہائی مشکل کام ہے۔ اس سے زیادہ مشکل اور کوئی کام نہیں۔ اِس مشکل کا ایک سبب تو یہ ہے کہ لوگوں کا مزاج اور ذوق مختلف ہوتا ہے۔ اُن میں ذہنی سطحوں کا فرق ہوتا ہے۔ سمجھ اور فہم کی گہرائی مختلف ہوتی ہے۔ ان سب کو جوڑنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ ایک حیوانوں کے گلّے کو تو ایک کتا بھی ہانک کر لے کر جا سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پٹھان لوگ کاغان اور ڈیرہ غازی خان سے کئی کئی سو بھیڑوں کا گلہ لے کر آتے ہیں۔ ایک آدمی لاٹھی لے کر پیچھے پیچھے چل رہا ہوتا ہے۔ اُس کے ساتھ ایک کتا ہوتا ہے جو بھیڑ بکریوں کو قابو رکھتا ہے۔ انسانوں میں تو ہر ایک کا اپنا فہم، اپنی سوچ اور اپنے نظریات ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی جگہ سقراط بقراط ہوتا ہے۔ انقلابی جماعت کی تشکیل کے

مشکل ہونے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر کوئی نہ کوئی سچی یا جھوٹی خودی ہوتی ہے۔

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر شے میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

بہرحال یہ وہ رکاوٹیں ہیں جن کو پار کر کے آپ کو انقلابی جماعت بنانی ہے۔

## جماعت سازی کے لوازم

انقلابی جماعت بنانے کے لیے چھ لوازم ہیں، جن کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر ان کو پورا نہ کیا گیا تو پھر کوئی جماعت انقلابی جماعت نہ بن سکے گی۔ میرے نزدیک انقلابی جماعت کے یہ پانچ لوازم درج ذیل ہیں:

(۱) انقلابی جماعت کے کارکنوں اور قائدین کے فکر اور نظریات و خیالات میں کامل نظریاتی ہم آہنگی ہو۔

(۲) دل و دماغ میں انقلاب کے علاوہ کوئی اور آرزو نہ ہو، یہی آرزو ہو کہ غلط نظام کا خاتمہ ہو جائے

(۳) انقلاب کے لیے تن، من، دھن لگا دینے کے لیے آمادگی ہی نہ ہو بلکہ انتہائی ذوق وشوق ہو۔

(۴) نظم کی پابندی کے لیے انسان اپنی انا کو کچل دے، اور خود کو سمع وطاعت کا خوگر بنائے۔

(۵) انقلابی کارکنوں میں انتہائی مضبوط نظریاتی عصبیت یعنی جذباتی وابستگی ہو۔

(۶) جماعت میں شامل افراد کا تزکیہ ہو۔

یہ چھ چیزیں انقلابی جماعت کے لوازم ہیں۔ اِن کے بغیر کوئی جماعت انقلابی جماعت نہیں بنے گی۔ اب آیئے، اس خاکے میں تھوڑا سا رنگ بھر دیں۔

نظریاتی ہم آہنگی: اس کا مطلب توحید پر یقین کامل ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی انقلاب کا اساسی نظریہ ہے۔ توحید محض ایک عقیدہ نہیں ہے بلکہ ایک انقلابی نظریہ ہے۔ اس کے تین پہلو ہیں۔

سیاسی میدان میں توحید کا مطلب اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعتراف واعلان ہے۔ اللہ کی زمین پر نہ کوئی انسان حاکم ہے اور نہ کوئی قوم حاکم ہے۔ حاکم فقط اللہ ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ بقول اقبال۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری!

نظریۂ توحید انسانی حاکمیت کی ہر شکل میں نفی کرتا ہے۔ انسانی حاکمیت نہ تو فردِ واحد کی بادشاہت کی شکل میں قابلِ قبول ہے، نہ کسی قوم کی دوسری قوم پر حاکمیت کی شکل میں، جیسے انگریز ہم پر حکمران ہو گیا تھا، اور نہ ہی عوام کی حاکمیت جائز ہے، جیسے کہ جمہوری نظام میں ہوتی ہے۔ حاکمیت (sovereignty) کا حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور انسان کے لئے خلافت ہے۔ غیر اللہ کی حاکمیت کی تمام صورتیں شرک ہیں اور دورِ حاضر میں حاکمیت جمہور (popular sovereignty) کا تصور تو بدترین شرک ہے۔ شارع (قانون ساز) صرف اللہ تعالیٰ ہے اور رسول ﷺ اس کے نمائندے ہیں۔ غور کیجیے، کیا توحید سے بڑا بھی کوئی انقلابی نعرہ ہوگا؟

معاشی میدان میں توحید کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شے کا مالک حقیقی اللہ ہے۔ یہ انقلابی نعرہ مروجہ معاشی نظاموں کی جڑوں پر تیشے کی طرح گرتا ہے۔ کوئی شخص کسی شے کا مالک نہیں ہے، نہ انفرادی طور پر نہ قومی طور پر۔ اس طرح سرمایہ داری کی بھی نفی ہو گئی اور کمیونزم کی بھی۔ مالک صرف اللہ ہے: ﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ ''اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے''۔ ہر شے کا مالک وہی ہے اور انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ امانت ہے ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالکِ ہر شے خدا ست!

میں اپنے جسم کا بھی مالک نہیں ہوں، میرا یہ جسم بھی اللہ کی ملکیت ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ ہاتھ پاؤں، یہ آنکھیں، یہ دماغ سب کچھ میرے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اُس نے مجھے کوئی گھر دے دیا ہے تو وہ بھی اس کی امانت ہے، اولاد دی ہے تو وہ بھی اُسی کی امانت ہے۔ چنانچہ ملکیت تامہ اسی کے لئے ہے۔ ہم مالک و مختار نہیں ہیں کہ جو چاہیں کرتے پھریں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: ﴿قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ﴿۸۷﴾﴾ (ھود) ''اے شعیبؑ! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے؟ اور یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ تم تو بڑے نرم دل اور راست باز ہو''۔ سرمایہ دار کا موقف یہ ہوتا ہے کہ یہ میرا مال ہے، میں اسے جیسے چاہوں تصرف میں لاؤں، خواہ اس سے سودی کاروبار کروں یا کسی کو سود پر قرضہ دوں۔ اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو سرمائے کا مالک سمجھتا ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو امین

سمجھیں گے تو آپ کا نقطۂ نظر یکسر مختلف ہو گا۔ پھر آپ اپنا ہاتھ بھی وہیں استعمال کریں گے جہاں اللہ کی اجازت ہے۔ آپ اپنے پاؤں سے بھی اسی راستے پر چلنا چاہیں گے جس پر اللہ چاہتا ہے کہ آپ چلیں۔ آپ کا مال وہیں خرچ ہو گا جہاں اللہ چاہتا ہے کہ آپ خرچ کریں۔

سماجی سطح پر توحید کا تقاضا یہ ہے کہ پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں' کوئی اونچا نہیں' کوئی نیچا نہیں۔ اس ضمن میں ایچ جی ویلز کی گواہی بتائی جا چکی ہے کہ ''انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے وعظ تو پہلے بھی بہت کہے گئے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں پہلی بار ان بنیادوں پر ایک معاشرہ قائم کیا ہے محمد (ﷺ) نے''۔ اسلامی معاشرے میں اگر کوئی اونچ نیچ ہے تو وہ ان کمالات کی بنیاد پر ہے جو آپ نے ازخود حاصل کیے ہیں۔ آپ نے علم حاصل کیا تو آپ اونچے ہو گئے' آپ کی عزت کی جائے گی۔ آپ نے تقویٰ کی روش اختیار کی' روحانی مقام حاصل کیا' اب آپ کی عزت کی جائے گی۔ ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ ''اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہو''۔ پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ شودر ہو یا برہمن' کالا ہو یا گورا' مرد ہو یا عورت' کوئی فرق نہیں۔ مرد اور عورت کے درمیان بھی فرق انتظامی اعتبار سے ہے۔ یہ اُسی طرح کا فرق ہے جیسے کسی محکمے میں ایک انچارج اور ایک باہر کھڑے ہوئے قاصد میں ہوتا ہے۔ بحیثیت انسان اُن میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں منصب اور اختیارات کے اعتبار سے سربراہ شعبہ کا منصب اونچا ہے' قاصد کا نیچا ہے' لیکن یہ محض انتظامی معاملہ ہے۔ پھر یہ کہ رنگ' نسل' علاقہ کی بنیاد پر لوگوں میں اونچ نیچ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اللہ نے فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ......﴾ (الحجرات:۱۳)

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے' تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔''

رنگ کی بنیاد پر امریکہ میں کالے کم تر قرار دیے گئے۔ لہٰذا انہیں سفید فام امریکیوں کے خلاف سول وار لڑنی پڑی۔ کیونکہ سفید فام امریکی کالے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسی طرح آج بھی ہندوستان میں ذات پات کے نظام کی لعنت موجود ہے۔ کچھ لوگ پیدائشی شودر ہیں' لہٰذا کم تر ہیں اور کچھ پیدائشی برہمن ہیں اور برتر حیثیت کے مالک سمجھے جاتے

ہیں۔حکومت نے ذات پات کے نظام کے خاتمے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا' مگر وہ نظام ختم نہ ہو سکا۔حکومت اس تفریق کے خاتمے کے لیے دلتوں کے لیے اسمبلی میں نشستیں مختص کرتی ہے' تو بڑی ذات والے اُن کی بستیاں جلا دیتے ہیں۔ ہندوستان میں جس قدر ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں' اُس سے بڑھ کر فسادات ہندوؤں کے آپس میں ہوتے ہیں۔ نچلی ذات والوں کی پوری پوری بستیاں جلا دی جاتی ہیں۔ یہ ہے حال دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہندوستان کا۔

مقصود و مطلوب: انقلابی جماعت کے لوازم میں سے دوسری چیز یہ ہے کہ واحد مقصود و مطلوب انقلاب ہو' لیکن یہ بات دنیا کے دوسرے انقلابات کی حد تک ہے۔ اسلامی انقلابی کارکنوں کا مقصود و مطلوب انقلاب نہیں' بلکہ اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح ہونی چاہیے۔ محض انقلاب ہمارا مطلوب و مقصود اور نصب العین نہیں ہے۔ اسلامی انقلاب کے لیے ہم اس لیے جدوجہد کرتے ہیں کہ یہ ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہم سے اللہ راضی ہو جائے اور ہمیں آخرت کی فلاح حاصل ہو جائے' جہنم سے چھٹکارا مل جائے۔ دوسری کوئی غرض' کوئی دنیوی مفاد پیش نظر نہ ہو۔ اسلامی انقلابی پارٹی کے کارکنوں کو ہر دم اپنا جائزہ لینا ہوگا کہ آیا ہمارے دل میں کوئی اور بت خانہ تو آباد نہیں' کہیں لیڈری کا سودا تو نہیں' کہیں حکومت اور اقتدار کی خواہش تو نہیں' کہیں نمایاں ہونے کا جذبہ تو نہیں ہے' کہیں شہرت کے حصول کی تمنا تو نہیں ہے۔ سینے اور دل کا اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے علاوہ ہر آرزو سے پاک ہو جانا ضروری ہے' اگرچہ یہ کام آسان نہیں' نہایت مشکل ہے۔ یہ کام محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے۔ آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا کیا حال تھا' اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی سے ایک مثال کافی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے۔ ایک جنگ میں آپؓ کا ایک کافر سے مقابلہ ہوا ہے۔ آپؓ نے کافر کو زیر کر لیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے اور خنجر گھونپنے ہی والے تھے کہ کافر نے آپؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ اِس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُسے فوراً چھوڑ دیا۔ کافر نے حیران ہو کر پوچھا' آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ آپؓ نے فرمایا' میری تم سے کوئی ذاتی جنگ نہیں ہے۔ میں اللہ کے لیے تمہیں مار رہا تھا۔ اب تم نے میرے منہ پر تھوکا ہے تو اس سے میرے اندر انتقامی جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ اب میں اگر تمہیں قتل کروں گا تو میرا یہ فعل خالصتاً اللہ کے لیے نہیں ہوگا۔ اندازہ کیجیے' جنگ کے دوران بھی جب مرو یا مارو کی کیفیت ہوتی ہے' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے اندر جھانکتے اور اپنی نیتوں کا جائزہ لیتے تھے۔

**شوقِ شہادت:** انقلابی جماعت کے کارکنوں میں اپنے مشن کے لیے تن من دھن لگا دینے کا سچا جذبہ ہو۔ اسلامی پارٹی کے کارکنوں کے دل راہِ حق میں شہادت کے لیے بے تاب ہوں۔ شہادت کی تمنا انہیں بے چین کیے رکھے۔ اگر اللہ کے راستے میں سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ اور شہادت کی آرزو نہیں ہے تو گویا ابھی آپ راہِ انقلاب پر نہیں آئے' خواہ آپ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں بڑا انقلابی کارکن ہوں۔ قرآن عزیز میں فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۙ﴾ (الاحزاب: ۲۳)

''مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ جو اقرار انہوں نے اللہ سے کیا تھا اس کو سچ کر دکھایا۔ تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں۔''

**نظم کی پابندی:** انقلابی جماعت کے لوازم میں سے ایک نظم کی پابندی ہے۔ انقلابی کارکن نظم میں یوں پروئے گئے ہوں گویا ''بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ'' ہے' یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار —— جب تک یہ کیفیت نہ ہو تنظیم وجود میں نہیں آ سکتی۔ اس کے لیے بنیاد کیا ہے؟ سمع و طاعت! سنو اور اطاعت کرو: ''وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا'' (listen and obey)۔ انقلابی کارکن سمع و طاقت کے خوگر ہوں۔ ایک امیر کی اطاعت کے لیے کٹ مرنے کو تیار ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کی قائم کردہ انقلابی جماعت میں سمع و طاعت کا معاملہ کس نوعیت کا تھا! اس کے لیے دو واقعات کافی ہیں۔ پورے مکی دور میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے حکم یہ رہا ہے کہ چاہے مشرکین تمہیں کتنا ہی ماریں' کتنی ہی ایذائیں دیں' حتیٰ کہ تمہیں ہلاک کر دیں لیکن تم ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں تھی —— اور تاریخ میں اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ کسی نے حضور ﷺ کے اس حکم کی خلاف ورزی کی ہو۔ یاد رہے کہ قرآن مجید میں ایسا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ جو بدنصیب لوگ سنت کی اہمیت کے قائل نہیں ہیں' ان کے لیے یہ بات خاص طور پر غور کرنے کی ہے کہ مکی دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کس حکم پر اس شدت اور سختی سے عمل پیرا تھے؟ قرآن حکیم میں تو کہیں جا کر ۵ھ یا ۶ھ میں سورۃ النساء میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ ......﴾ ''(اے نبیؐ) کیا آپؐ نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جن کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے

رکھو......'' لیکن پورے مکی قرآن میں یہ حکم موجود نہیں ہے۔ دراصل یہ حکم اللہ کا نہیں تھا بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ یا یوں کہیے کہ اللہ نے یہ حکم حضور ﷺ کو وحی خفی کے ذریعے سے دیا۔ وحی جلی میں یہ حکم بہرحال موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں اس کی توثیق فرمائی ہے۔ اس آیت سے اس بات کی وضاحت ہوگئی ہے کہ اے مسلمانو! ایک دَور وہ تھا جب حکم یہ تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو' اُس وقت تو تم کہا کرتے تھے کہ ہمیں جنگ کی اجازت ہونی چاہیے۔ اور آج جبکہ جنگ کا حکم دے دیا گیا ہے تو تم گھبرا رہے ہو! ـــــ کسی جماعت کے اس درجہ منظّم ہونے اور اپنے رہنما' قائد اور لیڈر کے حکم کی پابندی کی ایسی مثال پوری انسانی تاریخ میں آپ کو نہیں ملے گی۔

مواخات باہمی: انقلابی جماعت کا ایک اہم لازمہ یہ ہے کہ انقلابی کارکن ایک دوسرے سے رشتہ اخوت میں جڑے ہوئے ہوں۔ اشتراکی تحریک میں کامریڈ ہوتے ہیں اور کامریڈ کا رشتہ بہن بھائی کے رشتے سے بھی بڑھ کر خیال کیا جاتا ہے۔ اگر کارکنوں میں یہ عصبیت اور جذباتی لگاؤ نہ ہوگا تو انقلاب برپا نہیں ہوگا۔ اس کی خصوصی اہمیت ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس پر توجہ کم ہوئی ہے' حالانکہ اس پر خصوصی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ سورۃ الفتح میں رسول خدا ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۛ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾﴾

''محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل۔ (اے دیکھنے والے) تو ان کو دیکھتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکے ہوئے سربسجود ہیں اور اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں۔ (کثرت) سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔ (وہ) گویا ایک

کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی' پھر اس کو مضبوط کیا' پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے' تاکہ کافروں کا جی جلائے۔ جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے اللہ نے گناہوں کی بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔"

پھر یہی مضمون سورۃ المائدہ میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾

"اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں' اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی کشائش والا اور جاننے والا ہے۔ تمہارے دوست تو اللہ اور اس کے پیغمبر اور مومن لوگ ہی ہیں جو نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے اور (اللہ کے آگے) جھکتے ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے پیغمبر اور مومنوں سے دوستی کرے گا تو (وہ اللہ کی جماعت میں داخل ہو گا اور) اللہ کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔"

محولہ بالا آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ جب تم اس معیار پر پورے اُتر جاؤ گے کہ تمہاری ولایت' تمہارا دلی تعلق اللہ سے' اس کے رسول ﷺ سے اور اہل ایمان سے ہو گا' تو پھر ہی تم وہ حزب اللہ بن سکو گے' جو اللہ کے وعدے کے مطابق غالب آ کر رہے گی۔

<u>تزکیہ و روحانی ترقی</u>: ایک اسلامی جماعت کے لیے ان پانچ باتوں کے علاوہ چھٹی بات بھی درکار ہے اور وہ افراد کا تزکیہ نفس اور روحانی ترقی ہے۔ اس کے بغیر بھی ایک اسلامی جماعت انقلابی جماعت نہیں بنے گی۔

تزکیۂ نفس کا مطلب کیا ہے؟ اپنے نفس کو پاک کرنا۔ لہٰذا انقلابی کارکنوں کا مقصود صرف

اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح ہو محض انقلاب برپا کر دینا نہ ہو۔ اُن کے ذہنوں میں یہ بات بالکل واضح ہو کہ اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کرنا میرا فریضہ ہے۔ میں مسئول اور ذمہ دار ہوں۔ اس بارے میں اللہ کے ہاں مجھ سے سوال ہوگا۔ مجھ سے پوچھا جائے گا کہ تم نے باطل نظام کے ساتھ سازگاری کیوں اختیار کیے رکھی؟ اس نظام کے تحت کیوں پھل پھول رہے تھے؟ تم حزب اللہ میں شامل کیوں نہیں ہوئے' حزب الشیطان کا حصہ کیوں بنے رہے؟ وہ بات جو کبھی امریکی صدر بش یا پاول نے کہی تھی؟:You are with us or against us صرف اللہ کو کہنے کا حق ہے۔ یعنی ?You are with me or with Shatan (یعنی تم یا تو حزب اللہ میں ہو یا پھر حزب الشیطان میں ہو۔) اگر فی الواقع میرے ساتھ ہو' حزب اللہ میں ہو تو پھر تمہیں نظام شیطانی سے بغاوت کرنا ہوگی۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم حزب الشیطان کا حصہ ہو۔ بغاوت کا ایک ادنیٰ مظہر یہ ہوگا کہ تمہیں غیر اسلامی نظام سے نفرت ہو' اُس سے کسی قسم کا تعاون نہ کرو' اُسے پروموٹ نہ کرو۔ اس نظام کے تحت پھلنے پھولنے کی کوشش نہ کرو۔ اس سے اگلا مرحلہ یہ ہوگا کہ زبان سے کہو کہ یہ نظام غلط ہے۔ اور اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ جب طاقت حاصل ہو جائے تو بزورِ قوت اس نظام کا قلع قمع اور خاتمہ کرو۔ یہی بات ایک حدیث میں آئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَّاٰی مِنکُمْ مُّنکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ فَاِن لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِن لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (۱)

''تم میں سے جو شخص برائی دیکھے اُسے چاہیے کہ اُسے ہاتھ سے روکے۔ اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر زبان سے روکے۔ اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے روکے (یعنی برا جانے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

# فرد کی تبدیلی کے لیے قرآن حکیم کا پروگرام

اب آیئے' یہ دیکھیں کہ فرد کی تبدیلی کے لیے قرآن کا پروگرام کیا ہے؟ اگرچہ انقلاب جماعت کے ذریعے آئے گا مگر ظاہر ہے' جماعت افراد ہی سے بنے گی۔ لہٰذا انقلابی جدوجہد کا نقطہ آغاز انقلابی فرد کی تیاری ہے۔ فرد کی تبدیلی کے لیے ہم قرآن مجید کی جانب رجوع کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کی

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب نہی عن المنکر من الایمان

وضاحت کے لیے اگر تین بار ان الفاظِ مبارکہ کو دہرایا کہ: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ (التوبۃ:٣٣ الفتح:٢٨ الصف:٩) ''یعنی وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو 'الہدیٰ' اور 'دین حق' کے ساتھ تاکہ غالب کردے اُس کو پورے کے پورے دین پر!'' تو انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کی وضاحت کے لیے چار اہم اور بنیادی اصطلاحات کو پورے چار بار دہرایا — یعنی: (۱) تلاوتِ آیات' (۲) تزکیہ نفوس' (۳) تعلیم کتاب اور (۴) تعلیم حکمت!

(۱) چنانچہ سب سے پہلے سورۃ البقرہ کے پندرہویں رکوع کے آخر میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دعا میں یہ الفاظ وارد ہوئے:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٢٩﴾﴾

''اے رب ہمارے ہم دونوں کو بھی اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی اُمت برپا کیجیے جو تیری فرمانبردار ہو۔ اور ہمیں تعلیم فرما ہماری عبادت کے طور طریقے۔ اور قبول فرما ہماری توبہ۔ یقیناً تو توبہ قبول کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب ہمارے تو مبعوث فرمائیو ان میں ان ہی میں سے ایک رسول جو اُن کو سنائے تیری آیتیں اور انہیں تعلیم دے کتاب اور حکمت کی اور تزکیہ کرے اُن کا۔ بے شک تو ہی ہے سب پر غالب اور کامل حکمت والا۔''

(۲) پھر تین ہی رکوعوں کے بعد' اٹھارہویں رکوع کے آخر میں یہ واضح کرتے ہوئے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت دراصل اسی دعائے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْھِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کا ظہور ہے' ان ہی چار اصطلاحات کو دہرایا گیا:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾﴾ (البقرۃ)

''چنانچہ بھیج دیا ہے ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے' جو سناتا ہے تمہیں ہماری آیات اور تزکیہ کرتا ہے تمہارا اور تعلیم دیتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت کی اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ان چیزوں کی جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔''

(۳) اگلی سورت یعنی سورۂ آل عمران میں یہ مضمون مزید شان اور آن بان کے ساتھ وارد ہوتا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ (آل عمران)

''اللہ نے احسانِ عظیم فرمایا ہے اہل ایمان پر کہ اُٹھایا ان میں ایک رسول ان ہی میں کا جو سناتا ہے اُنہیں اُس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے اُنہیں کتاب اور حکمت کی۔ اور یقیناً وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں!''

(۴) آخری بار یہ مضمون اٹھائیسویں پارے میں سورۃ الجمعہ میں آتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے اُٹھایا اُمیوں میں ایک رسول ان ہی میں سے جو سناتا ہے انہیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب اور حکمت کی۔ یقیناً وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں!''

اور یہاں اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ سورۃ الجمعہ سے متصلاً قبل ہے سورۃ الصّف، جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں آنحضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کو واضح کیا گیا ہے، یعنی اظہارِ دین حق۔

سورۃ الجمعہ اور سورۃ الصّف کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ ان دونوں سورتوں کے شروع میں تسبیح باری تعالیٰ کا ذکر آیا ہے۔ سورۃ الجمعہ میں مضارع (حال و مستقبل) کے صیغے میں فرمایا گیا: ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱﴾ اور سورۃ الصّف میں ماضی کے صیغے میں فرمایا گیا: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱﴾ پھر یہ کہ سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ......﴾ ہے اور سورۃ الصّف کی مرکزی آیت ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ......﴾ ہے۔

سورۃ الجمعہ کی پہلی آیت کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنٰی میں سے چار اسماء

وارد ہوئے ہیں اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔قرآن مجید میں اللہ کے اسماء وصفات عام طور پر آیات کے آخر میں وارد ہوتے ہیں' لیکن اکثر و بیشتر جوڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔مثلاً وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ' وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ' وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ—— وقس علیٰ ذلك۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اکٹھے چار اسماء وارد ہوئے ہیں۔اس کا اصل سبب اس سورۂ مبارکہ کے عمود والی آیت ہے۔اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کے طریق کار کے ضمن میں چار اصطلاحات آئی ہیں' یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ آپؐ کی چار شانوں کا ذکر ہے: تلاوتِ آیات تزکیہ' تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت۔درحقیقت ان چاروں کا بڑا گہرا ربط ہے ان چار اسماءِ حسنیٰ کے ساتھ!......وہ ''الملک'' ہے۔یعنی بادشاہِ ارض وسماوات ہے۔چنانچہ اس کی آیات پڑھ کر سنائی جارہی ہیں' جیسے کوئی منادی کرنے والا شہنشاہ کے فرامین (proclamations) لوگوں کو سنا رہا ہو۔گویا ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ عکس ہے اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی ''اَلْمَلِكُ'' کا۔دوسری شان اللہ کی یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ ''اَلْقُدُّوْسُ'' ہے' یعنی انتہائی پاک۔ اللہ تعالیٰ کی شان قدوسیت کا بڑا گہرا تعلق ہے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بیان کردہ دوسری اصطلاح ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ یعنی عمل تزکیہ کے ساتھ—— اسی طرح ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ (وہ تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب یعنی احکام شریعت کی) میں اللہ تعالیٰ کی شان ''العزیز'' کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔وہ زبردست ہے' مختارِ مطلق ہے' وہ جو چاہے حکم دے۔بندوں کا کام ہے اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت! سورۃ التغابن میں یہ مضمون آ چکا ہے: ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ''سنو اور اطاعت کرو''۔سورۃ البقرہ میں سود کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ کان کھول کر سن لو! اللہ نے سود حرام کیا ہے اور بیع کو حلال ٹھہرایا ہے' تم کون ہوتے ہو اُس پر اعتراض کرنے والے؟ یہ ہے ''العزیز'' کا مفہوم۔یعنی ایک ایسی ہستی جس کے اختیارات پر کوئی تحدید نہ ہو' کوئی limitations نہ ہوں' کوئی checks and balances نہ ہوں' مختار مطلق!—— اور آخری اور چوتھا لفظ جو اللہ کی شان میں آیا ہے ''الحکیم'' ہے۔اس کا ربط و تعلق گویا ازخود ظاہر ہے نبی اکرم ﷺ کے فرائض چہارگانہ میں سے چوتھے کے ساتھ' جو درحقیقت نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہاج کا نقطۂ عروج ہے' یعنی تعلیم حکمت! غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی دعا میں تلاوت آیات کے فوراً بعد تعلیم کتاب و حکمت کا ذکر آیا ہے' تزکیہ کا ذکر آخر میں آیا ہے۔باقی

تینوں جگہوں پر پہلے تلاوت آیات' تزکیہ اور آخر میں کتاب وحکمت کی تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب فرق کیا ہے؟ اس سے لطیف فرق یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں اعلیٰ قدر تزکیہ تھی' اب یہ حکمت ہے۔ کیونکہ تین جگہ اللہ تعالیٰ نے حکمت کا ذکر آخر میں فرمایا ہے۔

یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ یہ چاروں اصطلاحات جن میں ہمارے مفسرین نے مغائرت پیدا کی ہے دراصل ایک ہی شے ہے۔ ان چاروں کا مرکز ومحور قرآن ہے۔ ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ اس سے مراد آیات قرآنی کی تلاوت ہے۔ ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ تعلیم کتاب سے مراد بھی قرآن حکیم کی تعلیم ہے۔ اس میں بھی کوئی شک اور اختلاف نہیں۔ تزکیہ اور حکمت بھی قرآن سے باہر کی شے نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِمَا اَوْحٰىٓ اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل: ۳۹) ''(اے پیغمبرؐ) یہ ان (ہدایتوں) میں سے ہیں جو اللہ نے دانائی کی باتیں تمہاری طرف وحی کی ہیں۔'' کتاب قرآن میں بھی ہے اور حدیث نبویؐ میں بھی ہے۔ اِس سے مراد قانون ہے (تفصیل بعد میں بیان ہوگی)۔ اسی طرح حکمت قرآن میں بھی ہے اور احادیث میں بھی ہے۔ اور تزکیہ exclusively قرآن کی شے ہے۔ پس حضور ﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن ہے۔ آپؐ نے اسی کے ذریعے افراد کی سیرت وکردار میں انقلاب برپا کیا۔ بقول الطاف حسین حالی ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

آیئے' انقلابِ نبوی کے اساسی منہاج کے حوالے سے اِن چار اصطلاحات کا تفصیل سے مطالعہ کریں۔

تلاوت آیات: آپؐ لوگوں پر آیات قرآنی کی تلاوت فرماتے تھے۔ حضور ﷺ نے کبھی کوئی طویل تقریر نہیں کی۔ کبھی کوئی اپنا فلسفہ بیان نہیں کیا۔ کبھی کوئی لمبا چوڑا وعظ نہیں فرمایا۔ ایسا ہوا ہے تو بہت کم ہوا ہے۔ آپؐ لوگوں کو اکثر قرآن سناتے تھے۔ اس لیے کہ یہی قرآن مردانِ کار کی تلاش اور فراہمی کا ذریعہ ہے۔ یہ روح انسانی کے لیے مقناطیس ہے۔ اگر قرآن سرسری طور پر بھی سنایا جائے تو جس شخص کی فطرت مسخ نہ ہوگئی ہو وہ اس میں کشش محسوس کرے گا۔ وجہ کیا ہے؟ قرآن اور روح دونوں کا ذریعہ ایک ہے۔ ہماری روح بھی اللہ کی طرف سے آئی اور قرآن بھی اللہ کی طرف سے آیا ؏ از کجا می آید ایں آوازِ دوست؟ (میرے دوست کی آواز

کہاں سے آ رہی ہے) ہاں جن لوگوں کی روح مر چکی ہے' جن کے جسم چلتے پھرتے مقبرے بن چکے ہیں اور روح اُن کے اندر دفن ہو چکی ہے' ان پر قرآن کا بھی اثر نہیں ہوگا۔ جیسے ابوجہل پر اس کا اثر نہیں ہوا ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

قرآن کو ایک مقناطیس کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ سلیم الفطرت لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے لکڑی کے برادے میں سے لوہ چون کو مقناطیس اپنی جانب کھینچ کر الگ کر دیتا ہے۔ قرآن مجید کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے قرآن سنا تو وہ لوگ نہ صرف فوراً ایمان لے آئے بلکہ قرآن کے داعی بن گئے۔ اس کا ذکر سورۃ الجن میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ① يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ﴾

''(اے پیغمبر ﷺ لوگوں سے) کہہ دو کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے (اس کتاب کو) سنا تو کہنے لگے ہم نے ایک عجیب قرآن سنا' جو بھلائی کا راستہ بتاتا ہے' سو ہم اس پر ایمان لے آئے۔''

یہ بات بھی یاد رہے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے اور اس کا اساسی مفہوم اور پیغامِ ہدایت اس کی اوپری سطح پر موجود ہے۔ اس کا جوہر اس کی بالائی سطح پر ہے۔ جیسے اگر سمندر میں کوئی آئل ٹینکر ڈوب جائے تو اس میں سے جو تیل نکلے گا وہ ظاہر ہے' سطحِ آب پر ہی رہے گا' نیچے نہیں جائے گا۔ ہدایت و یاد دہانی کے مقصد کے لیے قرآن حکیم کو آسان بنایا گیا ہے' جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ⑰﴾ (القمر)

''اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟''

ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کو مقناطیس کے سے انداز میں معاشرے میں بڑے پیمانے پر گھمایا پھرایا جائے' تاکہ سلیم الفطرت لوگ اس کی جانب کھنچے چلے آئیں۔

تزکیہ: نبی کریم ﷺ کے فرائض چہارگانہ میں دوسرا فریضہ تزکیہ ہے۔ جس کے لیے یہاں الفاظ ﴿يُزَكِّيْهِمْ﴾ آئے ہیں۔ تزکیہ کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس مرحلے پر اسے اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے۔ تزکیہ کے لفظی معنی پاک کرنا ہیں۔ یہ ایک باغبان کا فعل ہے۔ ایک باغبان

اپنا باغ لگاتا ہے۔ اس میں پھل دار درخت اور پھولوں والے پودے ہوتے ہیں' لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکار بھی اُگ آتی ہے جو زمین کی ساری قوت نمو اور پانی کو جذب کر لیتی ہے۔ اگر یہ قوت نمو اور پانی پھل دار درخت اور پھولوں کے پودے حاصل کریں تو اُن کی بڑھوتری اور نشوونما زیادہ بہتر ہو۔ لہٰذا باغبان اس گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکار کو نکال باہر کرتا ہے' تاکہ اُس کے لگائے درخت اور پودوں کی نشوونما میں حائل رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان کی شخصیت کا ہیولہ دو چیزوں سے تیار ہوتا ہے۔ ایک اُس کا ظاہری جسم اور وجود ہے اور دوسرا اُس کا معنوی وجود ہے۔ انسان کے معنوی وجود کی نشوونما اور ترقی میں بہت سی چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں۔ تزکیہ یہ ہے کہ اُن رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے' تاکہ اُس کی نشوونما صحیح طور سے ہو سکے۔

قرآن حکیم نے ''تزکیہ'' کا لفظ چار معنی میں استعمال کیا ہے۔ سب سے پہلی چیز تطہیر فکر ہے۔ یعنی انسان کی فکر میں جو غلط چیزیں' غلط خیالات' غلط عقائد' غلط فلسفے وغیرہ ہوتے ہیں' اُن کو نکال باہر کرنا۔ دوسری چیز تزکیہ نفس ہے۔ نفس پر حیوانی جبلتیں غالب آ جاتی ہیں۔ نفس کو اس طور سے پاک کرنا کہ وہ ان جبلتوں پر قابو پالے' یہ اُس کا تزکیہ ہے۔ تیسری چیز تصفیۂ قلب ہے۔ قلب انسانی آئینہ کی مانند صاف ہوتا ہے' مگر اس پر غبار آ جاتا ہے۔ اس غبار کو ہٹا کر قلب کو صاف کرنا' یہ بھی تزکیہ کے ذیل میں آتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''دلوں (کے آئینے) پر بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسے کہ لوہے پر زنگ لگ جاتا ہے''۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ! اس کی جلا کیا ہے؟ فرمایا: ''موت کا کثرت سے ذکر اور تلاوت قرآن''۔ چوتھی چیز تجلیۂ روح ہے۔ ہماری ارواح ہمارے جسمانی وجود سے بہت پہلے عالم ارواح میں پیدا کی گئیں۔ روح بھی غلط اثرات سے مضمحل ہو جاتی ہے' اِسے جلا دینا' اس روشنی کو بھڑکانا بھی تزکیہ ہے۔

قرآن مجید شفاء لما فی الصدور ہے۔ سورۂ یونس' آیت ۵۷ میں وہ خود کہتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾

''لوگو! تمہارے پاس آ گئی ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی بیماریوں کی شفا۔''

قرآن موعظہ اور وعظ ہے جو دل کی کھیتی کو نرم کرتا ہے۔ آپ زمین کو ہل چلا کر پہلے نرم کرتے ہیں' پھر بیج ڈالتے ہیں' تب ہی اُس میں فصل اُگتی ہے۔ اگر زمین کو نرم کیے بغیر بیج ڈال دیں گے تو وہ ضائع ہو جائے گا۔ اسی طرح ضروری ہے کہ پہلے موعظہ سے دل کو نرم کیا جائے' اور

جب نرم ہو جائے تو اس میں قرآن کا بیج ڈالا جائے۔ پھر ہی وہ سینوں میں جو حب الدنیا' حب مال ہے اور حب شہوات کے روگ ہیں' اُن کے لیے شفا بنے گا۔ قرآن سے یہ ساری چیزیں اندر سے نکلیں گی اور باطن کی صفائی ہوگی' اسی کا نام تزکیہ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں بھی فرمایا گیا:
﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴾ (آیت:۸۲) ''اور ہم قرآن (کے ذریعے) سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔''

تزکیہ کے لیے قرآن حکیم ہی عظیم ترین شے ہے' اسی قرآن کے ذریعے اندر کے روگوں کا علاج ہو سکتا ہے۔ یہی اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔ قرآن حکیم تزکیہ کا جو نسخہ بتاتا ہے وہ چار چیزوں پر مشتمل ہے: (۱) قرآن اور نماز' (۲) صلوٰۃ تہجد' قیام اللیل' (۳) روزہ' (۴) انفاق فی سبیل اللہ۔ اگر قرآن مجید کو تزکیہ کا مرکز و محور بنایا جائے گا تو یہ آپ کے ذہن سے اُتر کر قلب سے ہوتے ہوئے آپ کے پورے وجود کو دھو کر صاف کر دے گا۔

بدقسمتی سے تزکیۂ نفس کے ضمن میں ہمارے صوفیاء نے جو مختلف طریقے اختیار کیے ہیں وہ نبویؐ طریق سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتے۔ ہماری ایک بڑی بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد ہمارے ہاں اس وحدتِ فکر و عمل میں بتدریج زوال آتا چلا گیا جو دورِ خلافت راشدہ کا طرۂ امتیاز تھی۔ کچھ لوگ قانون اور فقہ کے ماہر بن گئے اور کچھ نے تزکیۂ نفس کے میدان کو اختیار کر لیا۔ اس طرح مختلف گوشوں میں یہ تمام امور بڑھتے چلے گئے اور ہر گوشہ اپنے ہی انداز میں ترقی کرتا اور پروان چڑھتا رہا۔ اس طرح وہ وحدت فکر و عمل جو قرآن مجید نے عطا کی تھی' مجروح ہوئی۔ چنانچہ تزکیۂ نفس کے معاملہ میں نہ معلوم کہاں سے یہ نظریات لیے گئے اور کہاں سے یہ نفسیاتی ریاضتیں اور مشقتیں اخذ کی گئیں کہ جن کے ذریعے سے تصفیۂ باطن' تزکیۂ نفس اور تربیت روحانی کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ میں گہرے احساس کے ساتھ اور علیٰ وجہ البصیرت یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس میدان میں طریق نبویؐ سے کچھ زیادہ ہی دوری ہوتی چلی گئی۔ نبی اکرم ﷺ کا طریقۂ تربیت اور اسلوبِ تزکیہ اس سے بہت مختلف تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے تزکیۂ نفس کے لیے جو طریقہ اختیار فرمایا تھا وہ یہی تھا کہ پہلے اس قرآن کے ذریعے سے فکر کی تطہیر کی جائے' نقطۂ نظر اور سوچ کی اصلاح کی جائے' نتیجتاً غلط اعمال پت جھڑ کی طرح از خود جھڑ جائیں گے یا جیسے اس درخت کے پتے سوکھ کر جھڑ جاتے ہیں جس کی جڑ کاٹ دی گئی ہو۔ یہ ہے تزکیہ کا عمل۔ قرآن مجید ہی درحقیقت اس عمل تزکیہ کا محور ہے۔ ''تلاوتِ آیات'' کی طرح تزکیہ کی اساس اور بنیاد بھی یہی قرآن ہے۔ افسوس یہ ہے کہ

اس معاملے میں جو طریقے اختیار کیے گئے ان میں بالعموم قرآن حکیم کو نظر انداز کر دیا گیا۔ علامہ اقبال نے اس تلخ حقیقت کی جانب اپنے اشعار میں بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے:

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوّال مست
آتش از شعرِ عراقی در دِلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

صوفیوں کا بالعموم حال یہ ہو گیا کہ عراقی یا اس قبیل کے دیگر شعراء کے اشعار سے تو ان کے دلوں میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے لیکن قرآن کو سن کر اُن کی آنکھیں پُرنم نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ تلاوتِ قرآن کے ذریعے سے اندرونی کثافتوں اور کدورتوں کی صفائی کرنے کا جو طریقہ تھا محمد رسول اللہ ﷺ کا' وہ متروک ہوتا چلا گیا اور تزکیہ کا عمل جو درحقیقت براہِ راست نتیجہ تھا ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ کا اسے اس کی اصل سے کاٹ دیا گیا۔ علامہ اقبال نے بعض حقائق کی تعبیر بڑی خوبصورتی سے کی ہے' وہ کہتے ہیں:

کُشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زاں کہ اُو گم اندر اعماقِ دل است

''ابلیس کو قتل کر دینا اور اس کو بالکل ختم کر دینا بڑا مشکل کام ہے' اس لیے کہ وہ تو لوگوں کے وجود کے اندر سرایت کر جاتا ہے' دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ یہ درحقیقت اس حدیثِ نبویؐ کا ترجمہ یا ترجمانی ہے کہ جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ)) (۱)

''بے شک شیطان تو انسان کے وجود کے اندر اس طرح جاری وساری ہو جاتا ہے جیسے (اس کی رگوں میں) خون دوڑتا ہے۔''

اس کے بعد علامہ اقبال فرماتے ہیں ۔

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

اس شعر کے پہلے مصرعے میں بھی درحقیقت ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ ایک مرتبہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتکاف' باب ھل یخرج المعتکف لحوائجه الی باب المسجد۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ اس پر صحابہ ؓ میں سے واقعتاً کسی نے بڑی ہمت کر کے سوال کیا کہ حضور ﷺ کیا آپ کے ساتھ بھی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں ہے' لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے[1]۔ علامہ اقبال نے اسی حدیث کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ع خوشتر آں باشد مسلمانش کنی۔ یعنی بہتر یہ ہے کہ تم اس شیطان کو مسلمان کر لو! لیکن اس کا طریقہ کیا ہے؟ وہ یہ کہ ع کشتۂ شمشیر قرآنش کنی! اسے قرآن کی شمشیر سے قتل کرو۔ تمہارے اندر اگر غلط خیالات' غلط رجحانات' غلط جذبات اور غلط شہوات پیدا ہو رہی ہیں تو یہ درحقیقت تمہاری غلط سوچ اور فکر اور تمہارے نقطۂ نظر کے کج ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ یہ قرآن ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہاری سوچ کو صحیح کرے گا' تمہارے نقطۂ نظر کو درست کرے گا' اور تمہارے نظامِ اقدار (Values system) کو صحیح بنیادوں پر استوار کرے گا۔ یہ ہے وہ طریقہ کہ جس سے تمہاری شخصیت میں بھی انقلاب آئے گا اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ غلط عادات اور غلط افکار کے دھبے تمہاری شخصیت سے خود بخود دور ہوتے چلے جائیں گے اور باطن کے اس انقلاب کے بعد ہی تم اس قابل ہو سکو گے کہ خارج میں بھی انقلاب برپا کر سکو!

نبی اکرم ﷺ کے اس انقلابی عمل میں قرآن حکیم کو جو اہمیت حاصل ہے اور جس کو بڑے ہی اجمال کے ساتھ مولانا حالی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں اس حقیقت کو علامہ اقبال مرحوم نے کما حقہ سمجھا ہے اور اس کا ادراک کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی عظمت کا بیان جس طرح ہمیں ان کے ہاں ملتا ہے' وہ اس دور کے کسی اور شخص کے ہاں نہیں ملتا۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لا یزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است

(۱) صحیح مسلم' کتاب صفات المنافقین ' باب فتنة الشیطان فی العرب من التحریش۔

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویاست ایں
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

ان اشعار میں سے آخری شعر میں علامہ اقبال نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ جب یہ قرآن کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے' اس کے اندر ایک عظیم انقلاب آ جاتا ہے' اس کی سوچ' اس کا فکر اور اس کے نظریات بدل جاتے ہیں' اس کی اقدار' اس کا نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب گویا کہ وہ مکمل طور پر ایک بدلا ہوا انسان ہے اور اس کے اندر سے جو یہ تبدیلی ابھری ہے' یہی درحقیقت صحیح طور پر خارج میں ایک تبدیلی برپا کرے گی اور اس طرح تمام غلط رویے اور تمام غلط اعمال خود بخود ختم ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ اندر سے ان کو غذا دینے والی جڑیں اب کاٹی جا چکی ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہو کہ اتباعِ شریعت کے لیے تزکیہ نہایت ضروری ہے۔ اگر تزکیہ نہیں ہوگا تو احکامِ شریعت کی پیروی پر آمادگی نہ ہوگی۔ آپ اپنے بیٹے کو نماز پڑھنے کا کہتے ہیں۔ اگر اس کا تزکیہ نہیں ہوا ہے تو وہ نماز نہیں پڑھے گا۔ اگر وہ سعادت مند ہے تو آپ کے سامنے پڑھ بھی لے تو آپ کی عدم موجودگی میں نہیں پڑھے گا۔ سبب کیا ہے؟ اُسے آپ نماز پڑھوانا چاہتے ہیں' حالانکہ اسے خدا پر یقین نہیں ہے۔ آپ نے اُسے جہاں پڑھایا ہے وہاں سے اُسے بے یقینی اور تشکیک کے جراثیم منتقل ہوئے ہیں ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

پہلے اُس کی فکر کی تطہیر کرو' تب اندر سے نماز ابھرے گی۔ جب اُس کے دل میں یقین ہی نہیں تو وہ عمل پر کیسے آمادہ ہوگا۔ جب فکر کی تطہیر ہوتی ہے تب اندر سے خودبخود شریعت کی طلب اُبھرنے لگتی ہے۔ پھر انسان اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ میرا کوئی قدم راہِ شریعت سے ہٹنے نہ پائے۔ وہ حکمِ شریعت معلوم کرتا ہے' تاکہ اُس پر چلے۔ قرآن مجید میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں آتا ہے کہ ﴿یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْاَہِلَّۃِ ط﴾ (آیت ۱۸۹) [(اے محمدؐ) تم سے نئے

چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے)]﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَا يُنفِقُوْنَ ط﴾ (آیت ۲۱۵) [(اے محمدؐ) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں۔]﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ط﴾ (آیت ۲۱۷) [(اے محمدؐ) لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔] ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ط﴾ (آیت ۲۱۹) [(اے پیغمبرؐ) تم سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں۔]﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ط﴾ (آیت ۲۲۰) (اور تم سے تیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں)﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ط﴾ (آیت ۲۲۲) (اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔) (البقرہ)﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَآ اُحِلَّ لَهُمْ﴾ (المائدہ:٤) (تم سے پوچھتے ہیں کہ کون کون سی چیزیں ان کے لیے حلال ہیں۔) ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ط﴾ (الانفال:١) [(اے محمدؐ مجاہد لوگ) تم سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔] صحابہ نبی ﷺ سے یہ سوالات کیوں پوچھتے تھے؟ اس لیے کہ تزکیہ نفس کے بعد اُن کے اندر اتباع شریعت کی سچی طلب پیدا ہوگئی تھی اور اتباع کے لیے راستہ معلوم ہونا ضروری ہے۔

تعلیم کتاب: تلاوت آیات اور تزکیہ نفوس کے بعد تیسرا مرحلہ ''تعلیم کتاب'' کا ہے۔ چنانچہ آگے فرمایا:

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾

''اور وہ تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب کی۔''

جیسا کہ آغاز میں واضح کیا جا چکا ہے کہ ''تلاوتِ آیات'' میں بھی پیش نظر قرآن ہے۔ لیکن یہاں پھر جو کتاب کا لفظ آیا ہے تو اس میں یقیناً قرآن مجید کا کوئی دوسرا پہلو پیش نظر ہے۔ اس طرح مختلف الفاظ سے قرآن مجید ہی کے مختلف گوشوں یا مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید میں لفظ ''کتاب'' بالعموم قانون کے لیے آتا ہے' مثلاً کسی چیز کے وجوب اور فرضیت کا بیان ''کُتِبَ'' کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ ''تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا۔'' ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ ''تم پر قتال فرض کر دیا گیا۔'' ایسے ہی وصیت کے وجوب کے بارے میں جو ابتدائی حکم تھا اس کے الفاظ ہیں: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ

الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ......﴾ ''تم پر واجب کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ موجود ہو اور اگر وہ کچھ مال چھوڑ کر جا رہا ہو تو والدین اور رشتے داروں کے لیے وصیت کر جائے!'' کہیں آتا ہے: ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ......﴾ ''یہاں تک کہ قانون اپنی اصل مدت کو پہنچ جائے۔'' تو لفظ ''کتاب'' کا اطلاق اس کی پوری ہمہ گیریت کے ساتھ پورے قرآن مجید پر بھی ہوگا۔ لیکن جب قرآن کے مختلف پہلوؤں کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جا رہے ہوں تو ''کتاب'' سے مراد قوانین اور احکام ہوں گے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کی وضاحت کے لیے مختلف الفاظ آ رہے ہیں۔ سب سے پہلے فرمایا: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ اور یہاں ''تلاوت آیات'' سے مراد لازمی طور پر قرآن حکیم ہی کی آیات کی تلاوت ہے۔ اس کے بعد ﴿يُزَكِّيْهِمْ﴾ کے الفاظ میں تزکیۂ نفوس کا ذکر کیا گیا ہے جو اسی کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ پھر ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ میں جو لفظ ''کتاب'' دوبارہ آیا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ یہاں اس سے مراد احکامِ شریعت (Dos and Don'ts) ہیں' یعنی یہ کرو اور یہ نہ کرو! یہ حلال ہے اور یہ حرام!

حلال و حرام کے احکام دینے میں یہ تدریج اور ترتیب برقرار رکھی گئی ہے کہ انہیں قلوب و اذہان کو بدلے بغیر نافذ نہیں کیا گیا۔ جب ذہن و فکر کی تبدیلی عمل میں آ چکی' دلوں کی دنیا میں ایمان جاگزیں اور راسخ ہو چکا اور بنیادی طور پر بُرے کردار اور بُرے اخلاق سے انسان کا دامن صاف ہو چکا تو اب یوں سمجھئے کہ گویا زمین میں ہل چل چکا ہے اور وہ بیج ڈالے جانے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اب بیج ڈالیں گے تو وہ بیج بار آور ہوگا' نتیجہ خیز ہوگا۔ زمین کو تیار کیے بغیر بیج ڈال دیا جائے تو بیج ضائع ہو جائے گا۔ چنانچہ جب ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ کا عمل کیا جا چکا اور تزکیے کے بنیادی تقاضے پورے ہو چکے' تب کہا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو! اور اس وقت ہر حکم کو پوری خوشدلی کے ساتھ قبول کیا گیا۔ غور کیجیے' قرآن میں پہلے ہی حلال اور حرام کے احکام کیوں نہیں آ گئے اور ان کا نزول اتنی دیر کے بعد کیوں ہوا؟ یا پورا قرآن یک دم کیوں نازل نہیں کر دیا گیا؟ اس کی وجہ یہی حکمت تدریج ہے۔ پہلے وہ آیات اور سورتیں اتریں جنہوں نے قلوب و اذہان کی دنیا میں ہل چلایا اور اس میں سے کثافتوں کو نکال کر باہر پھینک دیا' ایمان کی بنیادوں کو استوار کیا' نتیجتاً بنیادی انسانی اخلاق پروان چڑھے اور گندگیوں سے سیرتیں پاک ہو گئیں۔ اس طرح جب یہ زمین پوری طرح تیار ہو گئی تو اس میں بیج ڈالا گیا اور یہ بیج

خوب بارآور ہوا۔ یہ ہے وہ حکمت اور تدریج کہ جو قرآن مجید نے اپنے نزول میں ملحوظ رکھی' یا صحیح تر الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ قرآن کے نازل کرنے والے نے اس کے نازل کرنے میں پیش نظر رکھی اور اسی حکمت اور اسی تدریج کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے انقلاب برپا کیا۔ یہ اسی کا مظہر ہے کہ ذہنی و قلبی تربیت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو بھی حکم دیا گیا وہ انہوں نے بلا تامل قبول کیا۔ انہیں جس چیز کے چھوڑنے کو کہا گیا وہ انہوں نے فوراً ترک کر دی۔

**تعلیم حکمت:** انقلاب نبوی کے اساسی منہاج کا آخری مرحلہ ''تعلیم حکمت'' کا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ''حکمت'' کا لفظ سہ حرفی مادہ ح ک م ہے۔ عربی میں ''ح ک م'' کا مادہ بنیادی طور پر کسی شے کی پختگی اور استحکام کے لیے آتا ہے۔ حکمت دراصل انسانی عقل اور شعور کی پختگی ہے۔ انسان کے اندر غور و فکر کی جو استعداد ہے' اس کا پختہ (mature) ہو جانا اور اس میں اصابت رائے کی صلاحیت پیدا ہو جانا حکمت ہے اور یہ انسان کی صلاحیتوں میں بلند ترین چیز ہے۔ عام تعلیمی نظام میں بھی تربیت انسانی کے نقطۂ نظر سے یہ تدریج ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ کسی بچے کو آپ پہلے تاریخ کے واقعات کا مطالعہ کروائیں گے اور اس کو یاد کروائیں گے کہ فلاں فلاں واقعات کب اور کیسے ہوئے۔ اس کے بعد پھر ایک مرحلہ ''فلسفۂ تاریخ'' کا آتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ فلاں قوم کو شکست کیوں ہوئی' فلاں تہذیب کو عروج کیوں حاصل ہوا اور فلاں تمدن زوال پذیر کیوں ہوا؟ وغیرہ۔ اسی طرح آپ جغرافیہ میں پہلے یہ پڑھائیں گے کہ فلاں ملک کی آب و ہوا کیا ہے' وہاں کی زرعی پیداوار کیا ہے اور وہاں کون کون سے معدنی ذخائر پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد پھر طبعی جغرافیہ (Physical Geography) میں یہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ یہ تغیر و تبدل کیوں ہے؟ یہ موسم اس طرح کیوں بدلتے ہیں؟ فلاں جگہ یہ چیز کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ اور فلاں خطے میں یہ معدنیات کیوں پائی جاتی ہے؟ تو درحقیقت یہ ''کیوں اور کیسے؟'' ہر گوشۂ علم میں چوٹی کی چیز ہے۔ اسی طرح دین کا معاملہ ہے۔ انسانی ذہن اور شعور تربیت پا کر وہ پختگی حاصل کر لیں کہ انسان دین کے ''کیوں اور کیسے'' کو سمجھ سکے تو یہ ''حکمت'' ہے۔ فاتح دورِ حاضر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق کتاب ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَة'' کا موضوع یہی حکمت دین ہے کہ احکامِ شریعت میں کیا حکمتیں ہیں' ان کے کیا مقاصد ہیں۔

دین پر عمل کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کو شریعت کے اوامر و نواہی کی پابندی کرنی

ہے۔ ''سمع و طاعت'' اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔ لیکن اس سے بلند تر سطح یہ ہے کہ وہ بصیرت باطنی اور enlightment پیدا ہو جائے کہ جس سے نظر آنے لگے کہ یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے' اس کی حکمتیں کیا ہیں' اس کی غرض کیا ہے' اس کی علت کیا ہے' اس کی مصلحتیں کیا ہیں! انسان کے اپنے مفاد میں اور نظام اجتماعی کے مصالح کے اعتبار سے دین کے ان احکام کی کیا اہمیت اور کیا مقام و مرتبہ ہے۔ اس مرحلے پر پہنچ کر یہ حکم بوجھ محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک نعمت معلوم ہونے لگتا ہے۔ تب شریعت کے اوامر و نواہی طبیعت کے لیے کسی ناگوار کیفیت کے حامل نہیں رہ جاتے' بلکہ ان کے اندر اللہ کے انعام و احسان ہونے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں شریعت کو نعمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ......﴾ یعنی یہ اللہ کا انعام ہے کہ اُس نے تمہیں تمام پیچیدہ اور پُر پیچ راہوں میں ایک درمیانی راہ ''صراطِ مستقیم'' عطا فرما دی اور ایک متوازن اور معتدل نظام تمہیں عطا فرمایا۔ یہ سراسر انعام خداوندی ہے' اور اس نعمت کا اتمام ہوا ہے محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ سورۃ البقرہ میں اس ''حکمت'' کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا﴾ ''اور جس کو حکمت عطا کر دی گئی اسے تو خیر کثیر سے نواز دیا گیا۔'' اور واقعہ یہ ہے کہ یہ حکمت اللہ کی بہت بڑی دولت ہے اور اللہ کا اُس شخص پر بہت ہی بڑا احسان ہے جسے اُس نے حکمت سے نوازا ہو۔ علامہ اقبال نے اسے ''اسرارِ دین'' سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اے کہ می نازی بہ قرآنِ حکیم
تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن!
نکتہ شرعِ مبیں را فاش کن!

تو حکمت دین کی تعلیم اور اس کا عام کیا جانا انقلاب نبوی کے اساسی منہاج کی چوٹی کا معاملہ ہے۔ گویا یہ اس کا مرتبۂ کمال اور نقطۂ عروج ہے۔ قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ عہد نبویؐ سے پہلے انسان اپنے شعور کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ لہٰذا پہلی امتوں کو حکمت نہیں دی گئی۔ وہاں صرف احکام ہی احکام تھے۔ تورات میں سب سے اہم چیز ہی وہ احکام ہیں جنہیں احکام عشرہ کہا جاتا ہے۔ تورات صرف احکام پر مشتمل تھی۔ انجیل میں پہلی مرتبہ حکمت کا ذکر آتا ہے۔ لیکن یہ بھی ابتدائی درجے میں تھی۔ قرآن میں آیات بھی ہیں' تزکیہ کا عمل بھی ہے' قانون بھی ہے اور

حکمت بھی ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے مراد سنت ہے۔ حکمت قرآن سے باہر کی شے نہیں ہے' بلکہ اس کا جزو لاینفک ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ﴾ (آیت: ۳۹) یعنی ''اے نبیؐ' یہ ہیں وہ باتیں جو حکمت کی قبیل سے آپ کے رب نے آپ پر وحی کی ہیں۔''

﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ﴾

''اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی۔''

حکمت قرآن میں بھی ہے اور حدیث میں بھی۔ حکمت کے نادر موتی آپ کو حدیثوں میں بکثرت ملیں گے' اور بسا اوقات یہ ضعیف حدیثوں میں زیادہ ملتے ہیں۔ اگرچہ علماء کے ہاں یہ طے ہے کہ ضعیف حدیث سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں جو علم وحکمت ہو وہ حاصل کیا جا سکتا ہے' جو قرآن کے منافی نہ ہو۔

حکمت دو طرح کی ہے۔ ایک حکمت اصولی یا حکمت ایمانی ہے۔ یہ ایمان کی میٹا فزکس' ایمان کے فلسفہ اور اس کے اجزاء کے باہمی ربط کو اُس کی گہرائیوں میں اُتر کر سمجھنا ہے۔ یہ جاننا کہ ایمان باللہ خالصتاً صرف فطرت کی آواز ہے' البتہ ایمان بالآخرت میں فطرت کے ساتھ منطق بھی لگے گی۔ اور قرآن مجید کے حوالے سے آپ کو یہ ساری چیزیں ایک عقلی اور حکیمانہ نظام کے ساتھ پیش کرنی ہوں گی۔ مولانا روم نے کہا تھا ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں
حکمتِ قرآنیاں را ہم بخواں!

ارسطو کی منطق' ابن رشد کے ذریعے سے ترجمہ ہو کر ہمارے پاس پہنچ گئی۔ ابن سینا' فارابی' کندی یہ سب ان کے غلام اس کی شرحیں لکھتے رہے۔ مولانا روم کہتے ہیں کہ کب تک یونانیوں کی حکمت پڑھتے رہو گے۔ قرآن کی حکمت سیکھو' اِس کو حکمت کا ذریعہ بناؤ۔

دوسری حکمت تشریعی یا حکمت تفصیلی ہے۔ اسی کا دوسرا نام حکمت فروعی' یعنی حکمت احکام بھی ہے۔ اس کا تعلق احکامات کی علت کے فہم سے ہے۔ اللہ نے ایک حکم دیا ہے' تو یہ حکم کیوں دیا؟ فلاں چیز اُس نے کیوں فرض کی ہے؟ اللہ تعالیٰ الحکیم ہے۔ کسی حکیم ہستی کا کوئی بھی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ تو اللہ نے جو حکم دیا ہے وہ یقیناً مبنی بر حکمت ہے' مگر یہ حکمت کیا ہے۔ اگر آپ اُس کی حکمت سمجھ لیں گے تو اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا۔ حکم تو آپ کو ماننا

ہے خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جب آپ مومن ہیں' آپ نے اللہ کو مانا ہے تو اس کا حکم بھی ماننا پڑے گا۔ لیکن اگر اس کی حکمت سمجھ میں آ جائے' تو اس حکم پر عمل کے لیے آپ کا سینہ کھل جائے گا۔ اس کو قبول کرنے کے لیے ذہن بیدار ہو جائے گا۔ طبیعت میں آمادگی پیدا ہو جائے گی۔ اسلام میں کچھ احکام ہیں۔ یہ کرو' یہ نہ کرو' اور کچھ چیزوں سے روکا گیا ہے۔ یہ اوامر و نواہی یونہی نہیں دے دیئے گئے بلکہ یہ حکیمانہ ہیں۔ خدا کے بندو جس چیز سے تمہیں روکا گیا ہے۔ تمہارے بھلے کو روکا گیا ہے' اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کریں' آپ مری جا رہے ہیں۔ آپ سڑک پر سے پہاڑی پر چڑھتے ہیں تو آپ کو جگہ جگہ سگنل دکھائی دیتے ہیں' جن میں آپ کو ہدایت دی جاتی ہے کہ اپنی رفتار کم کرو' آگے موڑ آ رہا ہے۔ ظاہر ہے' آپ ان ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ آپ یہ نہیں کہتے کہ ہمیں تیز رفتاری سے کوئی نہیں روک سکتا' ہم اپنی مرضی سے ڈرائیو کریں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ تیز رفتاری سے تمہارے ہی فائدے کے لیے روکا جا رہا ہے۔ کیونکہ موڑ کے ساتھ گہری کھائی ہے۔ اگر رفتار کم نہیں کرو گے تو گہری کھائی میں گر پڑو گے۔ اسی طرح کا معاملہ شرعی احکام اور پابندیوں کا ہے۔ شریعت ہمارے اپنے فائدے کے لیے دی گئی ہے۔ اس پر چلنے سے ہماری شخصیت کی تعمیر ہو گی' خودی کو تقویت ملے گی۔ حکمت دین کے حوالے سے امام الہند شاہ ولی اللہؒ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' بہت ہی جامع ہے' جو اس حوالے سے شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا ابتدائی حصہ حکمت اصولی سے متعلق ہے۔ اس میں مجھے کہیں کہیں ان سے اختلاف ہے۔ لیکن جو حصہ حکمت الاحکام کا ہے میں سمجھتا ہوں کہ واقعتاً ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔

حکمت و احکام کو جمع کرنے سے ہی نظام بنتے ہیں۔ مثلاً یہ سیاسی نظام ہو گا۔ یہ معاشرتی نظام ہو گا' یہ معاشی نظام ہو گا' ورنہ نظام قرآن حکیم میں لکھا ہوا کہیں نہیں ہے۔ قرآن میں احکام ہیں' بتا دیا گیا کہ یہ حلال ہے' یہ حرام ہے' یہ اوامر ہیں' یہ نواہی ہیں۔ ہم انہی کے حوالے سے اپنا نظام بنائیں گے کہ ہمارا معاشی نظام یہ بنتا ہے۔ گویا لاء اینڈ سوشل سائنسز دونوں کی بنیاد حکمت تفصیلی ہے۔

حکمت درحقیقت تعلیم و تربیت محمدیؐ کا درجۂ خصوصی ہے۔ حکمت کا ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ عرب قوم کا بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ بحیثیت مجموعی حکمت کی اہل نہیں تھی۔ اسی لیے حضور ﷺ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ حکمت چاہے ثریا پر بھی ہو گی اس کی قوم کا

کوئی شخص اس کو لے آئے گا۔ گمان یہی ہے کہ یہ پیشین گوئی حضرت امام ابوحنیفہ کے لیے ہے۔ عرب فلسفی اور منطقی نہیں تھے۔ اگرچہ حضورﷺ کے ساتھیوں میں سے کچھ ایسے ضرور تھے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے حکمت دی' مگر بحیثیت مجموعی عرب قوم کا مزاج فلسفیانہ اور حکمت والا نہیں تھا۔ اُن کی پہچان کچھ اور چیزیں تھیں۔ ان میں عمل کا مادہ اور جوش و جذبہ پایا جاتا تھا۔ ایک بات مان لی ہے تو اب اُس کے لیے جان دے دیں گے۔ زبان دے دی ہے تو اب وعدہ خلافی نہیں کریں گے۔ مہمان آ گیا تو خود بھوکے رہ جائیں گے' مگر اس کو کھلائیں گے۔ باپ کے قاتل نے بھی آ کر پناہ مانگ لی ہے تو' پھر اُسے کچھ نہیں کہیں گے۔ اگر اُسے حرم میں دیکھ لیا' پھر بھی کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ سادہ سلیم الفطرت لوگ تھے۔ لہٰذا قرآن کی دعوت ان کے دل میں جا کر لگ گئی۔ ایرانی فلسفی تھے' یونانی فلسفی تھے' چینی فلسفی تھے' اسی طرح ہم ہندی بھی فلسفی تھے۔ اُمت کی بدقسمتی یہ ہوئی ہے کہ قرآن مجید بہت جلد پس منظر میں چلا گیا۔ حضورﷺ کے زمانے میں اہل ایمان کے ہاں دو ہی چیزیں تھیں۔ اُن کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار۔ قرآن سے ایمان بنتا تھا اور ایمان سے جہاد اُبھرتا تھا۔ بعد میں جب بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوگئیں تو زیادہ اہمیت قانون کی ہوگئی۔ اب جہاد کا مطلب غلبۂ اسلام کی بجائے سلطنتوں کا دفاع یا مزید علاقے فتح کر کے اپنی حکومتیں بڑھانا رہ گیا۔ دوسرے' علم کے میدان میں قرآن پیچھے رہ گیا جبکہ حدیث اور فقہ آگے آ گئے۔ یوں بتدریج قرآن نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ قرآن مجید صرف حصول ثواب یا ایصال ثواب کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔ ہندیوں کی خاص طور پر بدقسمتی یہ بھی ہوئی ہے کہ اسلام عرب سے نکلا' وہ مغرب کی جانب گیا تو اس نے فلسطین کراس کیا' اور مصر' لیبیا سے ہوتے ہوئے موریطانیہ تک جا پہنچا۔ یہاں کلچر کا خلا تھا۔ کوئی تہذیب تھی' نہ کوئی تمدن اور نہ ہی کوئی زبان تھی۔ لہٰذا عربی زبان اور عرب کلچر شمالی افریقہ پر چھا گیا۔ عربی زبان اور تہذیب نے مقامی زبانوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ بربر زبان اور تہذیب اُس کے آگے سرنگوں ہوگئیں۔ اس کے برعکس جب اسلام مشرق کی طرف چلا تو اُس کے لیے سب سے پہلے لوہے کا چنا ایران ثابت ہوا۔ ایران میں فلسفہ' زبان اور ادب ہر شے موجود تھی۔ لہٰذا یہاں عربی تہذیب و تمدن ایرانی زبان و تہذیب کے دلدل میں پھنس گئی۔ پھر اسلام جتنا بھی آگے گیا' وہ فارسی زبان کے ذریعے سے گیا۔ اس پر عجمی فکر و تہذیب نے اثرات چھوڑے۔ ہندوستان میں بھی جتنے عرصے

مسلمان حکمران رہے' ہماری عدالتی زبان فارسی تھی' عربی نہیں تھی۔ اگر ہماری زبان عربی ہوتی تو ہمارے حالات بھی مختلف ہوتے۔ ہم قرآن سے دور نہ ہوتے۔ اس صورتحال میں علامہ اقبال یا شیخ الہندؒ کی جو تشخیص تھی کہ مسلمانوں کو قرآن سے جوڑنا چاہیے' میں نے اُسی کو اپنی دعوت کی بنیاد بنایا۔ اقبال نے کہا تھا ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

زوال اسلام کی اصل وجہ قرآن مجید سے ہماری دوری ہے۔ قرآن پر بادشاہوں نے پردے ڈالے۔ خود علماء نے قرآن پر پردے ڈالے' اس لیے کہ عوام اگر قرآن پڑھیں گے تو ہمیں اس کی روشنی میں جانچیں گے۔ انہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کا کردار تو وہ نہیں ہے' جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ لہٰذا انہیں قرآن سے دور ہی رہنے دو ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

جب قرآن کا فلسفہ اور حکمت ختم ہوئی تو فلسفہ یونان آ گیا ہے اور اس کے ڈنکے بجنے لگے۔ اب وہی شخص پڑھا لکھا شمار ہونے لگا جو فلسفۂ یونان کا جاننے والا تھا' خواہ وہ حقیقت پسندی (realism) ہو یا مثالیت پسندی (idealism)۔ یہ ہے اصل میں وہ حادثہ جو ہمارے ساتھ ہوا۔ اقبال وہ شخص ہے کہ جس نے مسلمانوں کو بتایا کہ تمہاری ذلت و رسوائی کا سبب قرآن کو ترک کر دینا ہے۔ اگر سربلندی اور کامرانی چاہتے ہو تو تمہیں قرآن کو تھامنا ہوگا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن
خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

میں نے رجوع الی القرآن کی تحریک برپا کرنے میں پچاس برس یونہی نہیں بسر کیے'

علیٰ وجہ البصیرۃ بسر کیے ہیں۔ یہ میرا پیشہ نہیں تھا۔ میں کسی دار العلوم سے فارغ التحصیل نہیں تھا۔ میرا درس کوئی روایتی درس نہیں تھا۔ اس کے ذریعے لوگوں کو قرآن مجید کی طرف اور فرائض دینی کی جانب متوجہ کرنا مقصود تھا۔ میں شعوری طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ احیائے اسلام کا عظیم مشن دعوت قرآنی ہی کے ذریعے انجام پائے گا۔

حکمت تعلیم و تربیت محمدیؐ کا خصوصی درجہ ہے۔ تربیت ہی کا ایک حصہ تنظیم ہے۔ انقلابی جماعت جب تک منظّم نہ ہوگی' اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکے گی۔ انقلابی جماعت کی تنظیم فوج کی طرح ہونی چاہیے۔ فوج میں یہی ہوتا ہے کہ حکم ماننا ہے اور بس! اگر کوئی سپاہی اپنے افسر سے پوچھے جناب پہلے مجھے بتایئے کہ آپ یہ حکم کیوں دے رہے ہیں' اس میں کیا حکمت ہے؟ تو ایسی فوج ہرگز فوج نہیں کہلائے گی۔ انقلابی کارکنوں کا کام بھی یہی ہے کہ انہیں بہرصورت حکم ماننا ہے' اس لیے کہ انہیں انقلاب لانا ہے' سٹیٹس کو ختم کرنا ہے۔ رائج الوقت نظام کو تحفظ دینے والے اوپر بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ نظام کے بچاؤ کے لیے ہر حربہ اختیار کریں گے' فوج کو استعمال کریں گے' طاقت کا بے رحمانہ استعمال ہوگا۔ اگر اُن کا مقابلہ کرنا ہے تو انقلابیوں میں فوج کا سا ڈسپلن ہونا ضروری ہے۔ اگر اُن میں ملٹری ڈسپلن نہیں ہوگا تو وہ انقلابی عمل کی طرف آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ قرآن مجید نے اسی کو سمع و طاعت کہا ہے۔ انقلابی کارکنوں کا کام listen and obey ہے۔ اس ضمن میں مجھے Alfrd, Lord Tennyson کی نظم بہت پسند ہے جو امریکہ میں خانہ جنگی کے دوران پیش آنے والے ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ چھ سو سواروں کا ایک دستہ تھا۔ اسے کہا گیا کہ !Forward, The light Brigade انہیں معلوم تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا' مگر انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔

Cannon to right of them,
Cannon to left of them,
Cannon in front of them,
Vollyed and thundered
Theirs not to make reply.
Theirs not to reason why?
Theirs but to do and die
Rode Into the valley of death
Died the six hundred.

یقینی طور پر سامنے موت نظر آ رہی تھی' مگر چھ سو سواروں کے دستے نے حکم مانا۔ یہ نہ کہا کہ ہمیں موت کے منہ میں کیوں دھکیلا جا رہا ہے۔ اس اقدام کے نتیجے میں وہ چھ سو کے چھ سو قتل ہو گئے۔ آرمی تو اس ڈسپلن کا نام ہے۔ یہی انداز انقلابی جماعت کا ہونا چاہیے۔ اس نظم جماعت کے لیے قرآن مجید نے سمع و طاعت کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

# جماعت سازی کی مسنون بنیاد: بیعت

جو لوگ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے' انہیں آپؐ نے منظّم کیا' ان کی تربیت کی' انہیں سمع و طاعت کا خوگر بنایا۔

تیرہ برس تک مکے میں حکم یہ تھا کہ مسلمانو' چاہے تمہارے ٹکڑے کر دیے جائیں' تمہیں زندہ جلا دیا جائے' تم ہاتھ نہیں اُٹھاؤ گے۔ کوئی جوابی کارروائی نہیں کرو گے۔ اندازہ کیجیے' کیا سمع و طاعت کی اس سے بڑی ٹریننگ بھی ممکن ہے۔ حضرت خبابؓ بن ارت کی نگاہوں کے سامنے دہکتے ہوئے انگارے بچھا دیے گئے اور کہا گیا کہ کُرتہ اتارو اور اُن پر لیٹ جاؤ۔ وہ لیٹ گئے۔ اُن کی پیٹھ کی کھال جلی' چربی پگھلی' جس سے انگارے ٹھنڈے ہو گئے۔ ذرا سوچیے' جو شخص یہ دیکھ رہا ہو' کہ مجھے بھون ڈالنے کی تیاری ہو رہی ہے' اس کو اگر رکاوٹ نہ ہو تو وہ دو چار کو مار کر ہی مرے گا۔ بلی کو بھی آپ گھیر لیں' کارنر کر لیں تو وہ آپ کے اوپر حملہ کرے گی۔ لیکن کیا شے ہے کہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ یہ سمع و طاعت کا تقاضا تھا۔ ابھی تصادم کی اجازت نہیں تھی۔ اس حکم پر عمل کرنے سے بڑھ کر میرے نزدیک ڈسپلن کی ایکسر سائز اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ پریڈ کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے کہ ہاتھ نہیں اُٹھانا' تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہاتھوں کو روکے رکھا۔ اس طرح کی سمع و طاعت اور ڈسپلن کی تربیت پا کر جماعت آگے بڑھی' تا آنکہ تصادم کے مرحلہ میں داخلے کی نوبت آئی۔ اقبال کا شعر ہے ؎

با نشہ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

اللہ تعالیٰ نے یہ ساری منزلیں طے کرائیں۔ تب جا کر ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴾ (بنی اسرائیل) کی منزل آئی۔

انقلابی عمل کا لازمہ تصادم ہے۔ تصادم سے بچ کر انقلاب کبھی نہیں آ سکے گا۔ اگر کوئی بڑا

امن پسند ہے تو گھر میں جا بیٹھے۔ اور باطل کے غلغلہ کو برداشت کرے۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔ لیکن اگر آپ باطل نظام کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے تصادم ناگزیر ہے۔ جہاد کیا ہے؟ یہ تصادم ہی تو ہے۔ جہاد جہد سے بنا ہے۔ جب ایک جہد دوسری جہد کے مقابلے میں آتی ہے تو جہاد اور مجاہدہ ہو جاتا ہے۔ قتل قتل کے مقابلے میں آئے گا تو قتال اور مقاتلہ کہلائے گا۔ لیکن تصادم سے پہلے جماعت کی تیاری ناگزیر ہے۔ جماعت کے کارکنوں کو سمع و طاعت کا خوگر بنانا ضروری ہے۔ جماعت کے لیے سمع و طاعت کی مشق کیا ہے؟ یہ کہ حکم مانو۔ دورِ نبویؐ کے ابتدائی مرحلے میں کوئی ظاہری وصوری بیعت نہیں تھی۔ بیعت کا کوئی نظام نہیں تھا۔ بس یہی تھا کہ جب اللہ کے رسول کو مانا ہے تو آپؐ کا حکم بھی ماننا پڑے گا۔ یہ آپؐ پر ایمان کا تقاضا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ﴾ (النساء: ٦٤) ''ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر یہ کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔'' لہٰذا جس نے نبیؐ کو اللہ کا رسول مان لیا' اُسے آپؐ کی اطاعت کرنی ہے۔ چنانچہ عہد نبویؐ میں تنظیم کی سب سے پہلی بنیاد آپؐ پر ایمان تھی۔ جن لوگوں نے مان لیا کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں' آپؐ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اللہ کی جانب سے کہہ رہے ہیں' یہ آپؐ پر وحی آئی ہے' تو پھر ان کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ آپؐ کے حکم سے سرتابی کریں؟ کیا نبی کی بات سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے؟

وہ جماعت جو نبوت کی بنیاد پر قائم ہوئی اس سے زیادہ مضبوط جماعت کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ سچی نبوت تو درکنار جھوٹی نبوت بھی تنظیم کی بڑی بنیاد ہے۔ اندازہ کیجیے' غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کی بنیاد پر جو جماعت احمدیہ چل رہی ہے وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی' اور ان کا لاہوری فرقہ' جس نے غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں مانا' وہ منتشر ہو کر ختم ہو گیا۔ تو مضبوط ترین جماعت جو دنیا میں بن سکتی ہے وہ نبوت کے دعویٰ کی بنیاد پر بن سکتی ہے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سچی اور آخری نبوت کی بنیاد پر جو جماعت بنی' وہ دنیا کی مضبوط ترین جماعت تھی' جس کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ (الفتح: ٢٩) ''اللہ کے رسول محمدؐ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں' کافروں پر بہت سخت اور آپس میں رحیم و کریم ہیں۔'' اس جماعت میں کسی نے رسول اللہ ﷺ کو جماعت کا صدر منتخب نہیں کیا تھا' بلکہ آپؐ نبی اور داعی ہونے کی حیثیت سے خود بخود امیر تھے۔ آپؐ کے ساتھی ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' (ہم نے سنا اور مانا) کے اصول پر کاربند تھے۔

البتہ حضور ﷺ نے مستقبل کے لئے ایک مثال قائم کرنے کے لئے بیعت کا سلسلہ شروع کیا' تاکہ آئندہ اگر مسلمان اسی انقلابی جدوجہد کا آغاز کریں تو انہیں معلوم ہو کہ جماعت کیسے بنے گی۔ بیعت کے سلسلہ میں حد درجہ جامع اور نہایت عظیم روایت وہ ہے جو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے اور سند کے اعتبار سے اس سے زیادہ صحیح حدیث ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ ''ہم نے بیعت کی اللہ کے رسول ﷺ سے''۔ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ ''اس بات پر کہ آپ کا ہر حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے'' فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ ''تنگی اور سختی میں بھی اور آسانی میں بھی'' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ ''طبیعت کی آمادگی کی صورت میں بھی اور طبیعت پر جبر کرنا پڑا تب بھی''۔ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا ''اور چاہے آپ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دیں''۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ آپ نے ایک نو وارد نوجوان کو ہم پر امیر کیوں بنا دیا؟ ہم آپ کے پرانے خدمت گار اور جاں نثار ساتھی ہیں' ہم پر اس نوجوان کو کیوں ترجیح دی گئی؟ آپ کا اختیار ہوگا جو چاہیں کریں۔ وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ ''اور جس کو بھی آپ امیر بنا دیں گے' اس سے جھگڑیں گے نہیں''۔ وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ(۱) ''اور یہ کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں' اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہیں کریں گے''۔ ہماری جو رائے ہوگی' ہمارے نزدیک جو بات حق ہوگی وہ ضرور کہہ دیں گے۔ اس لئے زبانیں بند نہیں کریں گے کہ لوگ کہیں گے کہ لو جی انہوں نے کیا کہہ دیا۔ یہ بیعت آرگنائزیشن کی دوسری بنیاد ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث اسلامی انقلابی جماعت کا مکمل دستور ہے۔ اس پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کو اس بیعت کی ضرورت تھی؟ کیا آپ پر ایمان لانا ہی کافی نہیں تھا کہ آپ کی ہر بات ماننی ہے' ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾(النساء: ٦٤) ''ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔'' اس سلسلہ میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی تقریر کے وہ الفاظ ایمان افروز مثال ہیں جو آپ نے ایک مجلس مشاورت میں کہے تھے۔ غزوۂ بدر سے پہلے حضور ﷺ نے ایک مجلسِ مشاورت منعقد

(۱) سنن النسائی' کتاب البیعۃ' باب البیعہ علی ان لا ننازع الامر اھلہ۔

کی تھی کہ قریش کا ایک قافلہ شمال سے مالِ تجارت سے لدا پھندا آ رہا ہے جس کے ساتھ صرف چالیس یا پچاس محافظ ہیں' جبکہ کیل کانٹے سے لیس ایک مسلح لشکر جنوب سے آ رہا ہے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان دو میں سے ایک پر تمہیں ضرور فتح عطا فرما دے گا۔ بتاؤ' کدھر چلیں؟ کچھ لوگوں نے کہا کہ حضور ﷺ! قافلے کی طرف چلیں' تھوڑے سے آدمی ہیں' ان پر ہم آسانی سے قابو پا لیں گے' مالِ غنیمت بہت ہاتھ آ جائے گا' اور ہتھیار بھی ملیں گے' جن کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ لیکن حضور ﷺ مزید مشورہ طلب فرماتے رہے۔ تب صحابہ کرام ؓ نے اندازہ کیا کہ حضور ﷺ کا اپنا رجحانِ طبع کچھ اور ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر پہلے مہاجرین نے تقریریں کیں کہ حضور ﷺ! آپؐ ہم سے کیا پوچھتے ہیں' جو آپؐ کا حکم ہو ہم حاضر ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور حضرت عمر فاروق ؓ نے تقریریں کیں' لیکن حضور ﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے حضور ﷺ کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔ مہاجرین میں سے ہی حضرت مقداد بن اسود ؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ ''حضورؐ جو آپ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجئے' ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجئے جنہوں نے اپنے نبیؑ سے یہ کہہ دیا تھا کہ ''اے موسیٰؑ آپ اور آپ کا رب دونوں جائیں اور جا کر جنگ کریں' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں''۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہمارے ذریعے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔ لیکن حضور ﷺ اب بھی انتظار کی کیفیت میں تھے۔ اب حضرت سعد بن معاذ ؓ کو خیال آیا کہ رسول اللہ ﷺ کا روئے سخن دراصل انصار کی جانب ہے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں طے یہ ہوا تھا کہ اگر قریش آپؐ کا پیچھا کرتے ہوئے مدینے پر حملہ آور ہوئے تو ہم آپؐ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں۔ لیکن صورتِ واقعہ یہ تھی کہ قریش نے مدینے پر حملہ نہیں کیا تھا اور حضور ﷺ خود باہر نکل کر تصادم کا آغاز کر چکے تھے' لہٰذا انصار اس معاہدے کی رو سے مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کے پابند نہیں تھے۔ حضرت سعد ؓ کو فوراً خیال آ گیا کہ ہو نہ ہو حضور ﷺ ہماری تائید کے منتظر ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کھڑے ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! معلوم ہوتا ہے آپؐ کا روئے سخن ہماری جانب ہے۔ اب دیکھئے' کس قدر عمدہ جملہ کہا: فَاِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ یعنی حضور! ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں اور ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے۔ ہم نے آپؐ کو اللہ کا نبی اور رسول مانا ہے۔ اب ہمارا اختیار کہاں رہا؟ آپؐ جو بھی حکم دیں گے' سر آنکھوں پر! آپؐ ہمیں جہاں بھی لے جانا ہو لے چلئے۔ خدا کی قسم' اگر آپؐ

ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم ڈال دیں گے......!

تو حضور ﷺ کو کسی سے بیعت لینے کی ضرورت نہیں تھی' آپؐ تو اللہ کے نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے مطاع تھے ـــــ لیکن اس کے باوجود آپؐ نے بیعت کیوں لی؟ اس لئے کہ جماعت سازی کے حوالے سے آپؐ کی امت کے سامنے ایک کامل اسوہ آئے۔ آپ ﷺ کے بعد مسلمان جماعت بنانے کے لئے انگریزوں' روسیوں یا جرمنوں سے کوئی طریقہ مستعار نہ لیتے پھریں' بلکہ جماعت بنانے کے لئے وہ بنیاد اختیار کریں جو آپؐ چھوڑ کر تشریف لے گئے۔ یہ طویل حدیث جیسا کہ پیچھے کہا گیا ایک حزب اللہ کا مکمل دستور ہے۔ لیکن ہمارے افلاس' بدنصیبی اور بدبختی کا یہ عالم ہے کہ کسی بھی مذہبی جماعت نے اس بنیاد پر جماعت سازی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ اس حدیث کی انتہا درجے کی ناقدری ہے۔ چھوٹی چھوٹی حدیثوں کی بنیاد پر تو دوسروں کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے کہ تم نے رفع الیدین نہیں کیا' تم نے آمین بالجہر کہہ دیا' لہٰذا ہماری مسجد سے نکل جاؤ' مگر اس حدیث کی جانب کسی نے کوئی توجہ نہیں دی۔

خطبۂ چہارم

# سیرتِ طیّبہ میں

# اسلامی انقلاب کے ضمن میں ابتدائی مراحل

خطبہ مسنونہ' تلاوتِ آیاتِ قرآنی ☆' احادیثِ نبویؐ اور ادعیہ ماثورہ کے بعد!

# سابقہ خطابات کے ضمن میں چند مزید نکات

حضرات! آج کے خطاب کا اصل موضوع تو اگرچہ انقلاب اسلامی کے ضمن میں تصادم کے مراحل ہے لیکن قبل ازیں مجھے اپنے پچھلے تین خطبات کے بعض مضامین کے چند اہم نکات بیان کرنے ہیں' جو بیان ہونے سے رہ گئے تھے۔ لہٰذا آج کا مضمون پورا نہ ہو پائے گا' بلکہ یہ اگلے اتوار کو ہی مکمل ہوگا' ان شاء اللہ۔

میرا جو پہلا خطبہ تھا' اس میں بحمد اللہ ایمان کی بحث بہت جامعیت کے ساتھ پوری ہوگئی۔ یہی اسلام کا فلسفہ ہے۔ یہی اسلام کی میٹافزکس ہے۔ اسی کے لیے انگریزی لفظ world view ہے' یعنی کائنات اور انسان کے بارے میں آپ کا تصور کیا ہے؟ دینی اصطلاح میں اِسی کا نام ایمان ہے۔

## ایمان کے ضمن میں ایک بہت بڑا مغالطہ

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس دور میں ہم عام طور پر ایمان کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے جملہ متضمنات کے ساتھ ہمیں پہلے ہی حاصل (taken for granted) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ہم مسلمان ہیں تو صاحب ایمان بھی ہیں۔ حالانکہ یہی سب سے بڑا مغالطہ ہے۔ ہماری تحریکیں اور دینی جدوجہد اس لیے ناکام ہو رہی ہے کہ ان کا نقطہ آغاز (starting point) ہی غلط ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں وراثتاً ایک عقیدہ منتقل ہوگیا ہے اور ہم زبان سے اُس کا اقرار بھی کرتے ہیں' مگر بغور جائزہ لیا جانا چاہیے کہ وہ حقیقی ایمان' وہ یقین والا ایمان کہاں ہے۔ ذرا اپنے گریبانوں میں جھانکئے اور اپنے آپ سے یہ سوالات کیجیے۔

*Am I really convinced about the existense of God?*
*Am I really convinced about the direction and the life after death?*
*Am I really convinced that Muhammad ﷺ is the prophet of Allah and The Quran is the guide book of Allah?*

---

☆ سورۃ الصّف' آیات: ۴' ۱۴

اِس سے معلوم ہوگا کہ اگرچہ ہم میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ ان حقائق کے بارے میں گمان تو ہے مگران پر وہ یقین نہیں جو فی الواقع ہونا چاہیے۔ بلکہ ہم میں سے اکثر کی کیفیت یہ ہے کہ

﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿٣٢﴾﴾ (الجاثية)

''ہم اس کو محض وہمی خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا۔''

جب میں نے اپنے طور پر دعوتی وتحریکی جدوجہد کا آغاز کیا تو ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کے عنوان سے ایک مضمون قلم بند کیا' جو جون ۱۹۶۷ء کے میثاق میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ''قرآن اکیڈمی'' کا تصور موجود تھا۔ اس وقت تعلیم وتعلّم قرآن کوتحریک کی شکل میں برپا کرنے کا خاکہ ذہن میں آیا تھا۔ بہرحال اس کتابچے کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ اگرچہ اس صدی کا یہ خاص معاملہ ہے کہ اس میں عالمی سطح پر احیائے اسلام کے لیے جدوجہد ہورہی ہے' گزشتہ پچاس ساٹھ برس سے جماعت اسلامی' الاخوان المسلمون' مسجومی پارٹی' تبلیغی جماعت' عباد الرحمٰن گروپ اور سعید نورسی کی تحریک' سب ہی اپنے اپنے انداز میں اور اپنے فکر کے مطابق پوری محنت اور کوشش کررہے ہیں' لیکن یہ سوال ذہنوں میں آتا ہے کہ یہ سب تحریکیں دُنیوی نتائج کے اعتبار سے ناکام کیوں نظر آتی ہیں؟ تاحال کہیں پر بھی اسلامی انقلاب بالفعل برپا نہیں ہوسکا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ میری رائے میں ان تمام تحریکوں کے خلوص اور محنت کے باوجود ناکامی کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ تحریکیں ایمان کو taken for granted لے رہی ہیں' یعنی جب ہم مسلمان ہیں تو ایمان تو لازماً موجود ہے۔ جو زور ایمان کے حصول پر ہونا چاہیے تھا ان تحریکوں نے بالعموم اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ یہی وہ چیز ہے جہاں پانی مررہا ہے۔ جسے ہم ایمان سمجھ رہے ہیں وہ محض ایک موروثی عقیدہ بن کر رہ گیا ہے جس کا ہماری عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں' لیکن حقیقی ایمان یعنی یقین قلبی اور personal conviction کے درجے تک پہنچنے والا ایمان سرے سے مفقود ہے۔ ہم اپنی زندگیوں کو دیکھیں' اپنے معمولات پر تنقیدی نگاہ ڈالیں' اپنی اقدار کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہمارے اذہان وقلوب پر مسلط ہے۔ آخرت پر اگر فی الواقع ایمان موجود ہو تو انسان کی دنیاوی زندگی کچھ اور ہی قسم کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان اگر ذہن و قلب میں راسخ ہو تو کچھ اور ہی طرح کا کردار وجود میں آتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ سے حقیقی محبت اگر دل میں موجود ہو تو اس کا اظہار کسی اور طرح سے ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کہاں ہے؟ معلوم ہوا کہ اصل کمی یہاں ہے' پانی یہاں مررہا ہے!!

ان تحریکوں کی ناکامی میں کچھ حصہ عجلت پسندی اور جلد بازی کا بھی ہے کہ ایک متعد بہ افراد اور معاشرے کے ذہین عناصر کے ذہنوں کو بدلے بغیر قبل از وقت سیاسی میدان میں چھلانگ لگا دی گئی۔ مختلف تحریکوں نے اس نوع کی غلطیاں بھی کی ہیں' لیکن ان تمام غلطیوں میں سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ ایمان پر جو زور (emphasis) ہونا چاہیے تھا' وہ نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمان ہیں تو مومن بھی ہیں۔ حالانکہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ کسی بھی دینی جماعت نے ایمان پر زور نہیں دیا' سوائے تبلیغی جماعت کے۔ بلاشبہ تبلیغی جماعت کے ہاں ایمان پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ان کی گفتگوؤں میں' ان کے خطابات میں' ان کی تقاریر میں ایمان ویقین کا خصوصی ذکر اور حوالہ ہوتا ہے۔ یہ بات بتکرار یاد دلائی جاتی ہے کہ ہر شے اللہ کے کرنے سے ہوتی ہے' محض اسباب سے نہیں ہوتی۔ بھوک روٹی سے نہیں مٹتی' اللہ کے اذن سے مٹتی ہے۔ پیاس پانی سے نہیں بجھتی' اللہ کے اذن سے بجھتی ہے۔ لہٰذا توکل اسباب پر نہیں بلکہ اللہ مسبب الاسباب پر ہونا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے تبلیغی جماعت میں بھی ایمان کی جو intellectual dimension ہے' جو تفقہ والا حصہ ہے' جس کو قرآن علیٰ وجہ البصیرت ایمان قرار دیتا ہے' اُس پر فوکس نہیں ہے۔ میں نے علیٰ وجہ البصیرت ایمان کی تحریک پیدا کرنے کے لیے اپنی سی کوشش کی ہے۔ میری روز اول سے یہ کوشش رہی ہے کہ عہد حاضر کی عام علمی سطح پر آ کر intellectual dimension کے ساتھ ایمان کی وضاحت کی جائے۔

## ☆ مبدأ و معاد کا علم

میں آج ایمان کی بحث کے ضمن میں ایک نقطہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی وضاحت کرتے ہوئے ایک اصطلاح مبدا و معاد استعمال کی۔ یہ اصل میں حضرت مجدّد الف ثانی امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ کی ایک تالیف کا نام ہے۔ مبدا کے معنی اُس جگہ کے ہیں جہاں سے ابتدا ہوتی ہو' اور معاد وہ مقام ہے جہاں لوٹ کر جانا ہے۔ مبدا و معاد کا علم جو ہمیں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ضمن میں ملتا ہے' ہمارے سامنے نہ ہو تو ہمارا حال ان لوگوں کا سا ہوگا جو تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک بہت خوبصورت شعر ہے ؎

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے' نہ انتہا معلوم

ہمیں یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ پتا ہوگا کہ میں اتنے سال پہلے اپنی ماں کے پیٹ میں نو مہینے رہ کر اس دنیا میں آیا تھا اور بس۔ اس سے پہلے کیا تھا؟ یہ کائنات کب سے ہے اور کب تک رہے گی؟ کچھ پتا نہیں ہوگا۔ اسی طرح یہ تو معلوم ہوگا کہ ایک وقت میں قبر پر اُتار دیا جاؤں گا لیکن اس کے بعد کیا ہوگا' کوئی پتا نہیں ہوگا۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کو ذرا اپنے اوپر طاری کر کے سوچئے۔ فرض کیجئے آپ لاہور سے کراچی جا رہے ہیں۔ آپ ریل میں بیٹھے ہیں' تو آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا گھر اور بال بچے یہاں لاہور میں ہیں اور کراچی آپ فلاں کام کے لیے جا رہے ہیں۔ فلاں جگہ جانا ہے۔ یہ سب باتیں آپ کے ذہن میں ہیں۔ اب فرض کیجئے' آپ کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ ہو جاتا ہے' مثلاً اوپر سے ٹرنک گر کر آپ کے سر پر لگ جاتا ہے جس سے آپ کی یادداشت زائل ہو جاتی ہے۔ اب کیا ہوگا؟ آپ کو کچھ یاد نہیں ہوگا کہ میں کون ہوں' کہاں رہتا ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟ میرے اہل وعیال کہاں ہیں؟ آیا میرا کوئی ہے بھی یا نہیں ہے؟ آپ گاڑی میں بیٹھے یہ دیکھیں گے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گاڑی رکتی ہے' کچھ لوگ اُس میں سے اُتر جاتے ہیں اور کچھ لوگ اُس پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو اور کسی بات کا بھی علم نہیں ہوگا۔ اِس کیفیت سے آپ کو جو اُلجھن ہوگی' وہ ناقابل بیان ہوگی۔ یہی معاملہ ایمان کی دولت سے محروم انسان کا ہوتا ہے۔ اگر ہمارا اللہ اور آخرت پر ایمان نہ ہو تو مبدأ و معاد کے علم کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں ہوگی۔ ہم اس کے بارے میں بے علمی اور بے یقینی کا شکار ہوں گے۔ معلوم ہی نہیں ہوگا کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ سورۃ الملک میں اللہ فرماتا ہے:

﴿اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴿۲۲﴾﴾

''بھلا جو شخص چلتا ہوا منہ کے بل گر پڑتا ہے وہ سیدھے راستے پر ہے یا وہ جو سیدھے راستے پر برابر چل رہا ہو؟''

یہاں اللہ مثال دے کر سمجھا رہا ہے کہ ایک شخص وہ ہے جو اوندھے منہ زمین پر گھسٹ رہا ہے' اور دوسرا وہ شخص ہے جو کھڑا سیدھے راستے پر چل رہا ہے۔ کیا یہ برابر ہو سکتے ہیں؟ ان میں ہدایت یافتہ کون ہوگا؟ ظاہر ہے' وہ شخص ہدایت یافتہ نہیں کہ جو اوندھے منہ گھسٹ رہا ہے۔ وہ تو اپنے پیٹ کے بل پر چل رہا ہے۔ اُس کے پیش نظر تو پیٹ اور جنس کے تقاضے ہیں۔ یہی اُس کی زندگی

ہے۔مبدا و معاد کا علم نہ ہو تو انسان یہی سمجھے گا کہ میں پیٹ کے لیے اور جنس کے لیے جی رہا ہوں' اللہ اللہ خیر سلا۔ایسا شخص سیدھے راستے پر کیونکر ہو سکتا ہے۔صحیح راہ پر تو وہ شخص ہوگا جو کھڑا ہو کر سیدھا چل رہا ہے۔اس کے سامنے اس کی منزل ہے۔اُس کا ایک ہدف ہے۔اُسے معلوم ہے کہ میں اللہ کے پاس سے آیا ہوں اور مجھے اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

## ☆ حیاتِ انسانی کی حقیقت

حیاتِ انسانی یہی نہیں جس میں ہم جی رہے ہیں بلکہ یہ بہت طویل ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

اس ضمن میں قرآن مجید میں سورۃ المومن میں بڑی عظیم آیت آئی ہے۔ اکثر و بیشتر مفسرین اسے سمجھ نہیں سکے۔ اس آیت میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جہنمی اللہ کے سامنے فریاد کریں گے۔

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿11﴾﴾ (المؤمن)

''وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار تو نے ہمیں دو دفعہ بے جان کیا اور دو دفعہ جان بخشی۔ہم کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے تو کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔''

تو یہ موت کی دو صورتیں کون سی ہیں؟ جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ہم تو ایک ہی موت سے واقف ہیں۔اسی طرح یہاں مذکور دو احیاء کون سے ہیں ہم تو ایک ہی احیاء سے آگاہ ہیں جو قیامت کے دن ہوگا۔یہی بات سورۃ البقرہ میں ایک اور انداز میں بھی آئی ہے۔

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿28﴾﴾

''(کافرو) تم اللہ سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو' جس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو جان بخشی۔پھر وہی تم کو مارتا ہے۔پھر وہی تم کو زندہ کرے گا۔پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔''

انسان کی پانچ زندگیاں ہیں یا یوں کہیے کہ طویل زندگی کے پانچ ادوار ہیں' جن میں سے

دو ادوار سوتے ہوئے گزرتے ہیں اور تین بیداری میں ہیں۔ سب سے پہلا دور وہ ہے جب عالم ارواح میں انسان کی روح کو پیدا کیا گیا۔ اُس وقت صرف روح تھی، جسم نہیں تھا۔ اور وہی عالم امر ہے۔ وہاں صرف روحانی زندگی تھی۔ اِس پہلی زندگی کے بعد ہمیں سلا دیا گیا۔ یہ گویا دوسری زندگی ہے۔ یہ موت اور نیند کی کیفیت ہے۔ اس کے بعد ہمیں تیسری زندگی اِس دنیا میں ملی۔ اس زندگی کا آغاز رحم مادر سے ہوتا ہے، جب انسان کو مادی جسم عطا کیا جاتا ہے۔ رحم مادر میں انسانی جنین جب ۱۲۰ دن کا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتا ہے جو اُس میں روح پھونکتا ہے۔ حیات دنیا کا ستر اسّی سالہ عرصہ مکمل ہوتے ہی انسان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ یہاں سے اُس کی چوتھی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ عالم برزخ اور قبر کی زندگی ہے۔ پانچویں زندگی آخرت کی ہے۔ یہ اُس وقت شروع ہوگی جب صور پھونکا جائے گا۔ صور کے اثر سے سب مرے ہوئے لوگ جی اُٹھیں گے، اور اپنی قبروں سے نکل کر دی گئی خبروں کی سچائی کا نظارہ کریں گے اور اپنے رب کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ ہر مردہ اُسی ہیئت اور حالت پر اُٹھے گا جس میں اُس کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہماری یہ حیات دنیوی دو موتوں کے درمیان ہے۔ ایک موت وہ ہے جب ہماری ارواح کو پیدا کرنے اور اُن سے عہدِ الست لینے کے بعد انہیں کولڈ سٹوریج میں رکھ دیا گیا اور دوسری موت وہ جو اِس دنیا کی زندگی کے اختتام پر آتی ہے۔ یہ زندگی ایک طویل سفر حیات کا ایک مختصر سا حصہ ہے، اور یہ اس لیے عطا کی گئی ہے، تاکہ ہمیں آزمایا جائے، جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط﴾ (الملک:۲)

''اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔''

یہ زندگی امتحان کے لیے ہے۔ ہم کمرۂ امتحان میں بیٹھے ہیں۔ ہم بالعموم جس امتحان سے واقف ہیں، وہ تین گھنٹے کا ہوتا ہے مگر یہ امتحان زندگانی ساٹھ ستر سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اس امتحان کا نتیجہ آخرت میں جنت یا جہنم کی صورت میں سامنے آئے گا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

## ☆ نبی اور رسول کے مابین نسبت

میں نے اپنے پچھلے خطاب میں عرض کیا تھا کہ نبوت و رسالت میں کوئی فرق ہے یا نہیں ہے' اس موضوع پر میں بحث نہیں کروں گا' لیکن آج میں نے طے کیا ہے کہ اس ضمن میں بھی اپنے خیالات واضح طور پر آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ اگرچہ میرے خطبات اور دروس قرآن میں اس ضمن میں بارہا اشارات آئے ہیں' لیکن اجمال سے بات نہیں بنتی۔ اس بارے میں بہت سے لوگوں نے مجھ سے سوالات کیے' خطوط کے ذریعے بھی یہ کہا کہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھوں' لیکن مجھے لکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اب نہ جانے کتنی مہلت عمر باقی ہے' لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ یہ واضح کر دوں کہ میرے نزدیک نبی اور رسول کے مابین کیا نسبت ہے۔

نبی اور رسول کے معانی: سب سے پہلی بات یہ ہے کہ لغوی طور پر نبی کے معنی کیا ہیں؟ نبی کا لفظ نبأٌ سے بنا ہے' جس کے معنی ''خبر'' کے ہیں۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: خَبَرٌ ذُوْ فَائِدَةٍ عَظِيْمَةٍ ایسی خبر جس سے بہت بڑا فائدہ ہو رہا ہو۔ ''نبی'' کے معنی خبر دینے والے کے ہیں۔ ''نُبُوَّةٌ'' بلندی کو کہتے ہیں۔ پس نبوت بہت بلند مقام و مرتبہ ہے۔ حضور ﷺ نے اس مقام و مرتبہ کو تشبیہہ کے طور پر اپنے ایک عمل کے ذریعے سے نمایاں کیا تھا۔ آپؐ کو جب حکم ہوا تھا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ یعنی ''آپؐ ڈنکے کی چوٹ بیان کیجیے' جو آپؐ کو کہا گیا ہے۔'' تو آپؐ کوہِ صفا پر کھڑے ہو گئے۔ کوہِ صفا اس وقت چھوٹی سی چٹان کی شکل میں ہے' حضور ﷺ کے زمانے میں وہ پہاڑ تھا۔ کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر آپؐ نے ''وَاصَبَاحَا'' کا نعرہ لگایا۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ اگر کوئی شخص کسی بُری خبر کا اعلان کرتا یا اپنی قوم کو کسی بڑے خطرے سے آگاہ کرتا تو وہ کسی اونچی جگہ کھڑا ہو جاتا' کپڑے اتار دیتا اور پکارتا ''واصباحا''۔ ہائے وہ آنے والی صبح۔ اس لیے کہ غارت گر قبائل جو غارت گری کرتے تھے' اکثر رات میں کرتے تھے' بلکہ رات کے بھی اُس پہر میں جب نیند بہت گہری ہوتی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تھپک کر آدمی کو سلا رہی ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی اسی روایت پر عمل کیا۔ ہاں اِس روایت میں جو غلط چیز تھی' یعنی برہنگی' اُسے اختیار نہیں فرمایا۔ اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اسلام کی اشاعت کے لیے اپنے دور میں ہر ذریعہ تبلیغ اختیار کریں' ہاں یہ احتیاط ضرور کی جائے کہ وہ ذریعہ حرام نہ ہو۔ اگر ہم ابلاغ کے جدید ذرائع کو چھوڑ دیں گے تو گویا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماریں گے۔ بہرحال آپؐ کے پکارنے پر لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے اُن سے پوچھا'

لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک دشمن ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری بات کو مانو گے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا' کیوں نہیں' ہم آپ پر ضرور یقین کریں گے' کیونکہ آپؐ صادق اور امین ہیں' آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا' دوسرے یہ کہ آپؐ بلندی پر کھڑے ہیں۔ آپؐ پہاڑ کے اُدھر بھی دیکھ رہے ہیں' اِدھر بھی دیکھ رہے ہیں۔ تو یہ ہے مقام نبوّت۔ نبی بلند مقام و مرتبہ پر ہوتا ہے۔ وہ دنیا کو بھی دیکھ رہا ہوتا ہے اور آخرت کو بھی اور اِسی بلندی سے وہ لوگوں کو حقائق کی خبر دیتا ہے۔ ''رسالت'' بڑا سادہ سا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ر س ل ہے۔ اس مادہ سے باب افعال سے ارسل یرسل ارسالاً آتا ہے' جس کے معنی پیغامبر بھیجنا' خط بھیجنا' پیغام بھیجنا' تحفہ بھیجنا کے ہوتے ہیں۔

<u>نبوّت و رسالت کے ضمن میں متفق علیہ باتیں</u>: نبوت اور رسالت کے ضمن میں دو باتیں متفق علیہ ہیں۔ پہلی بات جس پر تمام علماء کا اتفاق ہے' یہ ہے کہ یہ بھی ان چند اصطلاحات میں سے ہیں جو قرآن حکیم میں جوڑوں کی شکل میں آئی ہیں' اور قریب المعنی ہیں۔ یہ اگر کہیں ایک ساتھ آجائیں تو ان کے معنی جدا ہو جائیں گے' اور اگر علیحدہ علیحدہ ہوں تو کچھ معنی اکٹھے ہو جائیں گے۔ اہل علم کہتے ہیں: اذا اجتمعا تفرقا واذا تفرقا اجتمعا۔ اِس کی ایک مثال مؤمن اور مسلم کی ہے۔ یہ دو الفاظ بھی قریب المعنی جوڑا ہے۔ ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں' خواہ آپ مؤمن کہہ لیں یا مسلم' دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن ان کے علیحدہ علیحدہ معانی بھی ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجرات میں فرمایا:

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

''دیہاتی کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ان سے) کہیے' تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو۔ (ہاں) یوں کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں، اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

یہاں ایمان اور اسلام کے معانی علیحدہ ہو گئے۔ اسی طرح کا معاملہ نبی اور رسول کا ہے۔ الفاظ کا یہ جوڑا ہم معنی بھی ہے اور مختلف بھی ہے۔ جب نبی اور رسول کے الفاظ علیحدہ علیحدہ آئیں گے تو ہم معنی ہو جائیں گے' اور جب ایک جگہ آئیں گے تو پھر اِن کے معانی علیحدہ ہو جائیں گے۔

دوسری بات جو علماء کے نزدیک متفق علیہ ہے' یہ ہے کہ نبی عام ہے اور رسول خاص ہے' جیسے مسلم عام ہے اور مومن خاص ہے۔ ہر مومن تو لازماً مسلم ہے لیکن ہر مسلم لازماً مومن نہیں ہے۔ آج دنیا میں ڈیڑھ ارب مسلمان ہیں۔ لیکن کیا یہ مومن بھی ہیں؟ اگر فی الواقع مومن ہوتے تو دنیا میں کبھی ذلیل وخوار نہ ہوتے کہ خود اللہ نے فرمایا کہ

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران)

''اگر تم مومن (صادق) ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔''

ہم ذلیل وخوار اس لیے ہیں کہ صحیح معنوں میں مومن نہیں ہیں۔ بہر حال نبی عام اور رسول خاص ہے۔ ہر رسول لازماً نبی ہے' مگر ہر نبی لازماً رسول نہیں ہے۔

تیسری بات بھی تقریباً متفق علیہ ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں جو انبیاء کرامؑ آئے ہیں' اُن کی تعداد سوا لاکھ ہے' اور رسولوں کی تعداد ۳۱۳ ہے۔ عجیب بات ہے کہ حجۃ الوداع میں جو صحابہؓ حضور ﷺ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے وہ سوا لاکھ تھے۔ یہ گویا وہی تعداد ہے جو دنیا میں آنے والے نبیوں کی ہے' اور میدان بدر میں حضور ﷺ کے ساتھ ۳۱۳ صحابہ تھے' اور یہ وہ تعداد ہے کہ جس تعداد میں دنیا میں رسول آئے۔

نبوّت ورسالت میں فرق: اب سوال یہ ہے کہ نبی اور رسول میں فرق کیا ہے۔ اس سلسلہ میں عام طور پر علماء کا کہنا ہے کہ دنیا میں جو پیغمبر کتاب لے کر آتا ہے وہ رسول ہے اور جو بغیر کتاب کے آتا ہے وہ نبی ہے۔ دوسرے یہ کہ جو پیغمبر کوئی شریعت لاتا ہے' وہ رسول ہے اور جو شریعت نہیں لاتا وہ نبی ہے۔ میرے نزدیک نبی اور رسول میں فرق کے حوالے سے یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ اس لیے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو کتاب زبور دی گئی' لیکن وہ نبی ہیں' رسول نہیں ہیں' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نئی شریعت نہیں لائے' لیکن پھر بھی وہ رسول ہیں۔ نبوت و رسالت میں فرق کچھ اور ہے۔

نبوّت مرتبہ' رسالت عہدہ ہے: میں سمجھتا ہوں کہ نبوت ایک مرتبہ اور کیڈر ہے جبکہ رسالت ایک عہدہ اور اپائنٹمنٹ ہے۔ نبی کو جب کسی خاص جگہ پر معین کر کے بھیج دیا جائے تو وہ رسول ہو جاتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جب ایک شخص CSP آفیسر بن جاتا ہے' اس نے ٹریننگ بھی کر لی ہوتی ہے' تو اب اسے کسی بھی اعلیٰ عہدے پر تعینات کیا جا سکتا ہے۔ اسے ڈی سی لگایا جا سکتا ہے' کہیں ڈپٹی سیکرٹری لگایا جا سکتا ہے۔ کہیں کسی محکمے کا چیئرمین بنایا جا سکتا ہے۔ بہر حال اُسے جہاں بھی تعینات کیا جائے گا' وہ اس کا ممکنہ عہدہ ہوگا' البتہ اس کا

کیڈر مرتے دم تک CSP رہے گا۔ یہی کہا جائے گا کہ وہ CSP آفیسر ہے' یا PCS آفیسر ہے۔ پس جدید اصطلاح میں نبوت ایک کیڈر اور ایک مرتبہ اور رسالت ایک عہدہ ہے۔ جب اللہ کسی نبی کو معین طور پر کسی کی طرف بھیجتا ہے تو وہ رسول ہو جاتا ہے' جیسے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا:

﴿اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۲۴﴾﴾ (طٰہٰ)

''تم فرعون کے پاس جاؤ (کہ) وہ سرکش ہو رہا ہے۔''

اگر نبیوں کو اس طرح کی اپائنٹمنٹ نہیں دی جاتی تو ان کی حیثیت وہی ہوتی ہے' جیسے اولیاء اللہ کی ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں۔ اُن کے دل میں ایمان ہوتا ہے' اور ایمان بھی یقین والا۔ البتہ فرق یہ ہوتا ہے کہ انبیاء پر وحی آتی ہے' اولیاء پر وحی نہیں آتی۔ نبیوں کی طرح اولیاء کی ذات سے بھی خیر پھیلتا ہے' بلکہ ہر مومن کی ذات سے خیر پھیلتا ہے بشرطیکہ وہ مومن ہو۔ اگر آگ واقعتاً آگ ہے تو اس سے ماحول میں حرارت لازماً پھیلے گی۔ اگر کسی کے وجود سے نیکی نہیں پھیلتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بندۂ مومن نہیں ہے۔

نبی کے برعکس رسول قتل نہیں ہوسکتا: نبی اور رسول میں دوسرا فرق یہ ہے کہ نبی قتل ہوسکتا ہے جبکہ رسول قتل نہیں ہوسکتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ ایک خاص جگہ میں اللہ کا نمائندہ بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ اس کی توہین اللہ کی توہین ہے۔ اس کو قتل کرنے کی کوشش اللہ کو چیلنج کرنے کے مترادف ہوتی ہے۔ لہٰذا رسول کبھی قتل نہیں ہوسکتے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ اس بات کو واضح کیا گیا ہے۔

سورۃ المجادلۃ میں فرمایا:

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ ؕ﴾ (آیت ۲۱)

''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول لازماً غالب رہیں گے۔''

سورۃ الصافات میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمۡ لَهُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنۡدَنَا لَهُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۱۷۳﴾﴾

''اور اپنے پیغام پہنچانے والے بندوں سے ہمارا وعدہ ہو چکا ہے کہ وہی (مظفر و منصور ہیں۔ اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔''

اسی طرح سورۃ القمر میں حضرت نوح علیہ السلام اللہ سے فریاد کرتے ہیں کہ

﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ ﴿۱۰﴾﴾

''انہوں نے رب سے دعا کی کہ (اے اللہ) میں (اِن کے مقابلے میں) مغلوب ہوا جارہا ہوں' میری مدد کر (اوران سے انتقام لے)۔''

رسول مغلوب نہیں ہوسکتا۔ اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہ آرزو کیوں پوری نہ ہوئی کہ میں اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں۔ آپؐ فرماتے ہیں: میری بڑی خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل ہو جاؤں' پھر زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جائے' پھر زندہ کیا جائے۔ اللہ نے یہ آرزو پوری نہیں کی۔ اس لیے کہ رسول کے حوالے سے اللہ کا فیصلہ ہے کہ:

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾﴾ (الصّٰفّٰت)

''اور اپنے پیغام پہنچانے والے بندوں سے ہمارا وعدہ ہو چکا ہے کہ وہی (مظفر و منصور ہیں' اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔''

رسول کے غلبہ اور قتل سے بچاؤ کی فیصلہ کن اور سب سے نمایاں مثال قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آئی ہے۔ بنی اسرائیل میں ایک ہی وقت میں دو شخصیتیں موجود تھیں۔ ایک حضرت یحییٰ علیہ السلام اور دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ یحییٰ علیہ السلام قتل کر دیئے گئے' مگر عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی سازش کامیاب نہ ہوئی۔ اللہ نے اُنہیں قتل نہیں ہونے دیا' بلکہ زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام جو نبی تھے' جن کے بارے میں قرآن میں سید' حصور اور نبی صالح کے الفاظ آتے ہیں' قتل ہو گئے' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول تھے' انہیں قتل ہونے سے بچا لیا گیا' اور انجیل برنباس کے مطابق ان کی جگہ وہ حواری سولی چڑھ گیا' جس نے انہیں گرفتار کروانے کے لیے غداری کی تھی۔ اللہ نے اس کی شکل حضرت مسیحؑ کی بنادی۔ قرآن نے بنیادی بات بتادی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل نہیں ہوئے' اللہ نے انہیں زندہ اُٹھالیا۔ باقی تفصیل نہ قرآن میں ہے' نہ حدیث میں ہے۔

﴿وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ﴾ (النساء:١٥٧)

''اور یہ کہنے کے سبب کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰؑ مسیح کو جو اللہ کے پیغمبر (کہلاتے) تھے قتل کر دیا ہے۔ (اللہ نے ان کو ملعون کر دیا) اور انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا اور نہ

انہیں سولی پر چڑھایا بلکہ ان کو ان کی سی صورت معلوم ہوئی۔''
یعنی یہودیوں کا یہ کہنا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا' انہونی بات ہے۔ رسول تو قتل ہو ہی نہیں سکتا۔

اس ضمن میں ایک اور سوال یہ ہے کہ قرآن میں جہاں قتل انبیاء کا ذکر آیا ہے' وہاں بعض جگہوں پر قتل رسل کا ذکر بھی آیا ہے' اس سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے مقامات پر رسول کے معنی نبی کے ہیں۔ یہاں وہ اصول لاگو ہوگا جو پیچھے بیان کیا گیا ہے کہ **اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اجْتَمَعَا**۔

آخری بات اہل تصوف کے حوالے سے ہے۔ بعض جاہل صوفیوں کا کہنا یہ ہے کہ ولایت نبوت و رسالت سے افضل ہے۔ یہ نری بکواس ہے۔ اسی لیے میں نے ''جاہل'' صوفیاء کہا ہے۔ یہ خیال سب صوفیاء کا نہیں ہے' جاہل صوفیاء کا ہے۔ عبدیت' ولایت اور نبوت کیڈر ہیں۔ ہر نبی پہلے عبد' پھر ولی اور پھر نبی ہوتا ہے' اور جب اُسے معین کر کے کسی خاص جگہ بھیجا جاتا ہے تو وہ رسول ہو جاتا ہے۔ پس رسالت وہ منصب اور عہدہ ہے کہ جس میں نبوت و رسالت دونوں جمع ہیں۔

**نبوّت کا رخ اللہ' رسالت کا بندوں کی طرف ہے:** نبوّت کا رخ اللہ کی طرف ہے۔ نبی اللہ سے لے رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس رسالت کا رُخ بندگانِ خدا کی طرف ہوتا ہے۔ رسول اللہ کا پیغام لوگوں میں پھیلا رہا ہوتا ہے۔ چونکہ رسالت کا رُخ مخلوق کی طرف ہے جبکہ نبوت کا رُخ اللہ کی طرف ہے' لہٰذا اس اعتبار سے نبوت کو افضل کہا جائے گا۔ مولانا رومؒ کہتے ہیں کہ نبوت مرتبۂ عروج میں ہے اور رسالت مرتبۂ نزول میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تھے کہ اُن سے کہا گیا:

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ (طٰہٰ)

''تم فرعون کے پاس جاؤ (کہ) وہ سرکش ہو رہا ہے۔''

یعنی کوہ طور کی بلندی پر سے اب ذرا نیچے اترو اور فرعون کو دعوت حق پیش کرو جس نے سرکشی کی

ہے۔ جب اللہ کا رسول' اللہ کا نبی رات کو کھڑا ہوتا ہے تو یہ اس کی عبدیت ہے۔ یہ اس کی نبوت ہے' اس کا رخ اللہ کی طرف ہے۔ اور جب وہ دن میں تبلیغ کر رہا ہوتا ہے' اللہ کے پیغام کے ابلاغ کے لیے ادھر اُدھر جاتا ہے' کبھی ایک سے اور کبھی دوسرے سے بات کرتا ہے' تو یہ رسالت ہے۔ چونکہ پیغام الٰہی پہنچانے کے دوران لوگوں سے طرح طرح کی ناروا باتیں سننا پڑتی ہیں' جس سے دل میں کچھ نہ کچھ میل آ جاتا ہے' لہٰذا کہا جاتا ہے کہ رات کو کھڑے ہو کر ذرا اندر کی صفائی کرو' یہ جو تکدر آ گیا تھا' اُسے دھولو۔ مولانا رومؒ نے اس ضمن میں بہت عمدہ مثال دی ہے کہ جب بارش آتی ہے تو وہ فضا کو دھوتی اور اُس کے اندر موجود کثافتوں کو لے کر زمین پر آتی ہے۔ پھر وہ زمین کو دھوتی ہے۔ چنانچہ دریا زمین کی کثافتیں بہالے جاتا ہے۔ پھر یہی پانی سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔ پھر سورج کی تمازت سے وہاں سے بخارات کی شکل میں اُٹھ رہا ہوتا ہے۔ اور تب یہ نہایت صاف وشفاف ہوتا ہے۔ اس میں کوئی کثافت نہیں ہوتی۔ نبی کا یہ رات کا جو معاملہ ہے اُس کا رُخ اللہ کی جانب ہے۔ اور یہ دن کا جو معاملہ ہے' اس کا رخ بندوں کی طرف ہے۔ بہرحال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہستی جو نبی بھی ہو اور رسول بھی' اس کی نبوت اس کی رسالت سے افضل ہے۔ (واللہ اعلم!)

## ☆ انقلابِ نبویؐ میں معجزوں کا عمل دخل نہیں!

اپنے خطبۂ ثانی کے بارے میں مجھے خاصا اطمینان ہے۔ بحمد اللہ' میں نے اپنا مافی الضمیر صحیح طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ختم نبوت کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ پر نبوت و رسالت اختتام کو پہنچ گئی اور دوسرے' آپ ﷺ پر ہدایت کی تکمیل ہو گئی۔ ختم نبوت کے پہلو سے حضور ﷺ کی اصل فضیلت تکمیل نبوت و رسالت میں ہے۔ یعنی آپؐ پر نبوت و رسالت کی تکمیل ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے اس پہلو کو ختم نبوت کی دلیل کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ تکمیل نبوت و رسالت کے دو مظاہر ہیں: الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق (یعنی کامل نظام زندگی)۔ کارِ رسالت کے حوالے سے آپؐ کی ذمہ داری صرف یہی نہیں تھی کہ دین کو پہنچا دیں' بلکہ یہ بھی آپؐ کی ذمہ داری تھی کہ اس دین کو قائم کر کے دکھائیں۔ گویا آپؐ کا مشن ایک انقلابی مشن تھا۔ تیسری چیز جس کا میں آج اضافہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی شخصیت میں نبوت و رسالت کے کامل ہونے کے ساتھ انسانیت بھی اپنی معراج کو پہنچ گئی۔

آپؐ پر بشریت کی بھی تکمیل ہوگئی۔ چنانچہ حضورﷺ نے تاریخ انسانی کا جو عظیم ترین انقلاب برپا کیا وہ محض انسانی محنت' مشقت' ایثار و قربانی' صبر و مصابرت' استقامت و مقاومت کی بنیاد پر برپا کیا۔ اس میں معجزوں کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ بھوک لگی ہو تو اللہ نے من و سلویٰ اتار دیا ہو۔ جب پیاس لگی تو اُس نے ایک چٹان سے بارہ چشمے جاری کر دیے ہوں۔ سمندر سامنے آیا تو باذن الٰہی اُسے ایک عصا کی ضرب سے پھاڑ دیا گیا ہو۔

حضورﷺ نے اسلام کے غلبہ کے لیے جس طور سے عظیم جدوجہد کی اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان میں کیا کچھ رکھا ہوا ہے۔ آپؐ نے ۲۳ سال کے قلیل عرصے میں خالصتاً انسانی بنیادوں پر تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا فرمایا۔ اِس راہ میں آپؐ کو سخت ترین صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ حضورﷺ خود فرماتے ہیں کہ وہ تکلیفیں جو تمام انبیاء و رسل کو اُٹھانی پڑی ہیں' وہ ساری میں نے تنہا اُٹھائیں۔ غور کیجیے' طائف کے دن آپؐ کے ساتھ کیا ہوا؟ شعب ابی طالب میں آپؐ نے کس طور سے بھوک پیاس کے ساتھ تین سال کی قید اور سماجی بائیکاٹ برداشت کیا۔ یہ وہ قید نہیں جو ہمارے ہاں ہوتی ہے۔ ہمیں تو جیل میں قید کے دوران کھانا ملتا ہے' لیکن وہاں تو آپؐ اور آپؐ کے خاندان کو کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ آپؐ کا ٹوٹل سماجی بائیکاٹ کیا گیا تھا۔ آپؐ کے ساتھ میدان احد میں کیا ہوا؟ خندق کی کھدائی کے دوران آپؐ کی یہ حالت تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے پیٹوں پر ایک پتھر باندھ رکھا تھا تو آپؐ نے دو پتھر باندھے ہوئے تھے۔

یہ بات کہ آپؐ کے انقلاب میں معجزوں کا عمل دخل نہیں' بہت سے لوگوں کو اچھی نہیں لگے گی۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لفظ ''معجزہ'' کے معنی ہیں عاجز کر دینے والی شے۔ معجزہ وہ دلیل ہے جس کے بعد انکار کرنا ممکن نہ رہے۔ معجزہ یا تو لوگوں کے مطالبے پر دکھایا جاتا ہے یا پھر اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے اُن سے کہا: اے صالحؑ! اگر تم واقعی اللہ کے رسول ہو تو دُعا کرو کہ ہمارے سامنے یہ جو چٹان ہے' اس میں سے ابھی ایک گابھن اُونٹنی برآمد ہو جائے۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی اور لوگوں کی آنکھوں کے سامنے چٹان سے ایک گابھن اونٹنی برآمد ہوگئی۔ یہ مطالبہ پر معجزہ دکھانے کی مثال ہے۔ رسول کے اپنے دعوے کی صداقت کے طور پر معجزہ پیش کرنے کی ایک مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس آئے تو

اپنی قوم سے کہا کہ میں اللہ کی طرف سے آیات (نشانیاں) لے کر آیا ہوں۔ انہوں نے پوچھا' آپ کیا نشانیاں لائے ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو وہ سانپ بن گیا۔ اسی طرح اپنا ہاتھ بغل میں دے کر نکالا تو وہ سورج کی طرح چمکتا ہوا روشن ہو گیا۔ یہ معجزات گویا اپنے دعویٰ کے ثبوت کے طور پر ہیں۔ ان دونوں معانی میں حضور ﷺ کا کوئی معجزہ نہیں۔ یہاں تک کہ قرآن حکیم میں ایک مقام ایسا بھی ہے جس کو پڑھتے ہوئے میں لرز جاتا ہوں۔ ایک موقع پر حضور ﷺ کے اپنے دل میں خواہش پیدا ہو گئی کہ کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے' تا کہ ان کم بختوں کا منہ بند ہو جائے۔ اس لیے کہ سردارانِ قریش کہہ رہے تھے کہ ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے' یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہر رواں کر دے' یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا اللہ اور فرشتوں کو رودررو ہمارے سامنے لے آئے' یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اُتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ اس پر اللہ کی طرف سے جواب آیا:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴿۵۰﴾﴾ (العنکبوت)

''اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں ہوئیں۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو کھلم کھلا ہدایت کرنے والا ہوں۔''

میں نے تو دعویٰ رسول ہونے کا کیا' خدا ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا۔ یہ معجزات اللہ کے اختیار میں ہیں۔ میں اپنے اختیار سے کوئی چیز نہیں دکھا سکتا۔ اس حوالے سے ایک واقعہ بھی آتا ہے' جس سے کپکپی طاری ہوتی ہے۔ آپؐ کا ایک پھوپھی زاد بھائی تھا' جو آپؐ کے ساتھ رہتا تھا اور آپؐ کی سپورٹ کرتا تھا۔ وہ ایمان تو نہیں لایا تھا لیکن آپؐ کے ساتھ تعاون کرتا تھا' جیسے ابوطالب آپؐ کی حمایت کرتے تھے۔ جس محفل میں کفار نے آپؐ سے معجزہ لانے کا مطالبہ کیا' اُس محفل میں آپؐ کا یہ پھوپھی زاد بھائی بھی موجود تھا۔ اس نے کہا' محمدؐ آج تمہاری قوم نے تم پر حجت قائم کر دی ہے۔ اب اگر آپؐ معجزہ نہیں دکھا سکتے تو آئندہ میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ ان کا مطالبہ معقول ہے۔ آپ خود کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزے ملے ہیں' عیسیٰ علیہ السلام کو وہ

معجزے ملے ہیں' جن کی کوئی حد تو نہیں تو پھر آپ معجزہ کیوں نہیں دکھا دیتے۔ اب ان حالات میں اگر حضور ﷺ کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہو ہی گیا ہو کہ اے اللہ تو کوئی معجزہ دکھا ہی دے' تا کہ ان کے منہ بند ہوں تو یہ بات بالکل فطری تھی لیکن اللہ نے بتا دیا کہ میں نے معجزہ نہیں دکھانا۔ یہ وہ مقام ہے جسے پڑھتے ہوئے میں لرز جاتا ہوں۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣٤﴾ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٣٥﴾﴾ (الانعام)

''اور تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے جاتے رہے تو وہ تکذیب اور ایذاء پر صبر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد پہنچتی رہی۔ اور اللہ کی باتوں کو کوئی بھی بدلنے والا نہیں۔ اور تم کو پیغمبروں (کے احوال) کی خبریں پہنچ چکی ہیں (تو تم بھی صبر سے کام لو) اور اگر ان کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہو تو زمین میں کوئی سُرنگ ڈھونڈھ نکالو یا آسمان میں سیڑھی (تلاش کرو) پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لاؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم ہرگز جذباتی نہ ہونا۔''

اس کا ایک خاص سبب تھا؟ وہ یہ کہ معجزہ دکھانے کے بعد قوم کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔ معجزہ دیکھنے کے بعد بھی جو قوم ایمان نہ لائے وہ ہلاک کر دی جاتی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کو ابھی اس معاملے کو آگے بڑھانا تھا۔ آپ نے اظہارِ دینِ حق کی جو جدوجہد کی' اس میں یقیناً خرقِ عادت قسم کے معاملات بھی ہوئے ہیں' اللہ کی خصوصی مدد بھی آئی ہے اور یہ غیر مرئی اور غیر طبعی طور پر بھی آئی ہے' لیکن دعوے سے اور مطالبے پر نہیں آئی۔ جیسے ایک موقع پر کھانا تھوڑے لوگوں کے لیے تھا' بہت سے لوگوں کے لیے اُس میں برکت پیدا ہو گئی۔ پانی تھوڑا سا تھا' حضور ﷺ نے اپنا لعابِ دہن اُس میں ڈالا ہے تو آپ کی برکت سے یوں چشمہ پھوٹا کہ سب نے پانی پی لیا۔ یہ طبعی قوانین سے ہٹ کر ماورائی انداز میں مدد ہے۔ اسی طرح میدانِ بدر میں نصرت کے لیے فرشتے اترے۔ غارِ ثور میں آپ کی حفاظت کے لیے مکڑی نے جالا و بنا اور کبوتری نے انڈے دیئے اور یوں اللہ نے آپ کو دشمنوں سے بچا لیا۔ تاہم آپ کا اصل معجزہ صرف ایک ہے اور وہ معجزہ قرآن ہے۔ جسے ایمان لانا ہے اس قرآن پر ایمان لائے۔ جسے

ایمان نہیں لانا وہ بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر بھی نہیں لائے گا۔ کیا فرعون معجزہ دیکھ کر ایمان لایا؟ کیا قوم ثمود ایمان لائی؟ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کرتے تھے' مٹی کا پرندہ بنا کر پھونک مارتے ہیں تو وہ اڑتا ہوا پرندہ بن جاتا ہے' مگر کیا ان معجزات کو دیکھ کر یہودیوں نے اُن کی دعوت کو تسلیم کیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو جو معجزہ دیا گیا وہ قرآن ہے اور یہ سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس لیے کہ باقی سارے معجزے خواہ کتنے ہی بڑے نظر آئیں صرف رسول کی زندگی میں تھے' بعد میں نہیں رہے۔ عصائے موسیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص تھا۔ کہا جاتا ہے وہ لاٹھی اب بھی تابوتِ سکینہ میں موجود ہے جو یہودیوں کے بقول مسجد اقصیٰ کے نیچے تہہ خانوں میں دبا ہوا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبان بھی ہے' جس میں یہود کے لیے گندم کی شکل میں ''من'' اترتا تھا۔ لیکن ان چیزوں میں اب اثر نہیں۔ کیونکہ اس طرح کے معجزات رسول کی زندگی کے لیے تھے۔ آپ ﷺ کو جو معجزہ دیا گیا' اُس کی تاثیر تا قیامِ قیامت رہے گی۔ بہر حال حضور ﷺ کے لیے خرقِ عادت مدد بھی آئی۔ راہِ حق میں اللہ کی مدد آتی ہے لیکن یہ اس وقت آتی ہے جب انسان آزمائش پر پورا اُترتا ہے۔ اس سے پہلے مدد نہیں آتی۔ بہر حال آنحضور ﷺ کو ایک انقلابی مشن تفویض کیا گیا۔ یعنی دین کو قائم کرو' جو نظام باطل چلا آتا ہے اسے اکھیڑو' اور اس کی جگہ دین کو قائم و غالب کرو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے تاریخ انسانی کا عظیم ترین' گھمبیر ترین' جامع ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب برپا فرمایا۔ اس ضمن میں ایم این رائے' ایچ جی ویلز' ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کی گواہیاں پیش کی جا چکی ہیں۔ لہٰذا اس سے جو نتیجہ نکلنا ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ واقعتاً یہ جاننا چاہتے ہیں کہ انقلاب کا صحیح طریق کار کیا ہے تو اس کے لیے آپ کو نبی اکرم ﷺ کی سیرت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ افسوس کہ ہم آج بھٹک رہے ہیں ؎

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے

کوئی سمجھتا ہے کہ انقلاب دعوت و تبلیغ سے برپا ہو جائے گا۔ خدا کے بندو! اگر دعوت سے انقلاب برپا ہو سکتا تو کیا (معاذ اللہ) آنحضور ﷺ سے بڑا مبلغ' حضور ﷺ سے بڑا داعی' حضور ﷺ سے بڑا معلم' مربی' مزکی کوئی ہو سکتا ہے؟ پھر آپ ﷺ کو تلوار ہاتھ میں کیوں لینی پڑی؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انتخابات کے راستے سے انقلاب آ جائے گا۔ یہ خیال بھی درست نہیں۔ انتخابات سے اُسی چیز کی عکاسی ہوگی جو معاشرے میں ہے۔ انتخابات سے جاگیر دار' سردار اور سرمایہ دار ہی آگے آئیں گے۔ تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ اِسی طرح محض علمی اور

تعلیمی کام سے بھی کبھی انقلاب نہیں آ سکتا۔ اگر آپ کو انقلاب کا طریق کار درکار ہے' تو اس کے لیے آپ کو پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ انقلابی جدوجہد دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اگر آپ دعوت و تبلیغ کا کام کریں گے آپ کو کوئی جان سے نہیں مارے گا' ہاں برا بھلا کہہ سکتا ہے۔ مشقت تو آپ کو کرنی پڑے گی' محنت کرنی پڑے گی چاہے آپ مشنری ہوں' چاہے تبلیغی جماعت کے بھائی ہوں' مگر آپ کو جان کا خطرہ نہیں ہے۔ انقلابی جدوجہد میں تو جان ہتھیلی پر رکھنی پڑتی ہے۔ کیوں؟ انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ آپ نظام کو بدل دیں' جبکہ نظام کے ساتھ برسر اقتدار مراعات یافتہ طبقات کے مفادات وابستہ ہیں۔ اُن کی سرداریاں' سیادتیں ہیں' چودھراہٹیں قائم ہیں۔ اگر آپ ان سب کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے' اگر یہ سارے آشیانے جس درخت کی شاخوں پر بنے ہوئے ہیں اگر آپ اس درخت کی جڑ کاٹنے لگ گئے' تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اُن کی طرف سے مزاحمت نہ ہو۔ وہ یقیناً اس کی شدید مزاحمت اور مخالفت کریں گے ع نظامِ کہنہ کے پاسبانو یہ معرضِ انقلاب میں ہے۔

اب آیئے' پچھلے خطبہ کی طرف۔ اُس میں خاصے خلا رہ گئے تھے۔

## ☆ انقلاب نبویؐ کا اساسی منہاج: چند وضاحتیں

☆ میں نے انقلاب نبوی کے اساسی منہاج کے ضمن میں بتایا تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے افراد کی تیاری کے لیے تلاوت قرآن' تزکیہ' تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کو ذریعہ بنایا۔ ان اصطلاحات کا ذکر قرآن حکیم میں چار مرتبہ آیا ہے۔

(۱) چنانچہ سب سے پہلے سورۃ البقرہ کے پندرہویں رکوع کے آخر میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دعا میں یہ الفاظ وارد ہوئے:

﴿رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَیُزَکِّیۡہِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۲۹﴾﴾

''اے رب ہمارے ہم دونوں کو بھی اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی اُمت برپا کیجیے جو تیری فرمانبردار ہو۔ اور ہمیں تعلیم فرما ہماری عبادت کے طور طریقے۔ اور قبول فرما ہماری توبہ۔ یقیناً تو توبہ قبول کرنے اور رحم فرمانے والا

ہے۔ اور اے رب ہمارے تو مبعوث فرمائیو ان میں ان ہی میں سے ایک رسول' جو اُن کو سنائے تیری آیتیں اور انہیں تعلیم دے کتاب اور حکمت کی اور تزکیہ کرے اُن کا۔ بے شک تو ہی ہے سب پر غالب اور کامل حکمت والا۔''

(۲) پھر تین ہی رکوعوں کے بعد' اٹھارھویں رکوع کے آخر میں یہ واضح کرتے ہوئے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت دراصل اسی دعائے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْھِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کا ظہور ہے' ان ہی چار اصطلاحات کو دہرایا گیا:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾﴾ (البقرہ)

''چنانچہ بھیج دیا ہے ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے' جو سناتا ہے تمہیں ہماری آیات اور تزکیہ کرتا ہے تمہارا اور تعلیم دیتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت کی اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ان چیزوں کی جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔''

(۳) اگلی سورت یعنی سورۂ آل عمران میں یہ مضمون مزید شان اور آن بان کے ساتھ وارد ہوتا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٦٤﴾﴾ (آل عمران)

''اللہ نے احسانِ عظیم فرمایا ہے اہل ایمان پر کہ اُٹھایا ان میں ایک رسول ان ہی میں کا' جو سناتا ہے اُنہیں اُس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے اُنہیں کتاب اور حکمت کی۔ اور یقیناً وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں!''

(۴) آخری بار یہ مضمون اٹھائیسویں پارے میں سورۃ الجمعہ میں آتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢﴾﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے اُٹھایا اُمیوں میں ایک رسول ان ہی میں سے جو سناتا ہے انہیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب اور حکمت کی۔ یقیناً وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں!''

**حکمت: تعلیم نبوی کا نقطۂ عروج:** یہاں یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ اول الذکر دو مقامات

پر جہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دُعا کے حوالے سے آپ کے اساسی منہاج کا ذکر ہے، وہاں اِس ضمن میں آنے والی چار اصطلاحات میں سب سے آخر میں تزکیہ کا ذکر آیا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں خود اِن چار اصطلاحات کا ذکر فرمایا ہے، اُس میں آخر الذکر شے حکمت بیان ہوئی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا معاذ اللہ پہلی ترتیب جو انبیاء کی ہے نادرست ہے؟ ہرگز نہیں۔ البتہ ہم یہ کہیں گے کہ جو ترتیب اللہ کی طرف سے آئی ہے وہ اہم تر ضرور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوی تعلیم و تربیت کا نقطۂ عروج تعلیم حکمت ہے۔ بعثت نبوی سے پہلے زمانوں میں جب انسان فکری اور ذہنی اعتبار سے اپنے بچپنے کے دور سے گزر رہا تھا، حکمت کا اہل نہیں تھا۔ تب بلند ترین شے تزکیہ یعنی انسان کو پاک کر دینا تھا لیکن اب یہ حکمت ہے۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے خانقاہی نظام میں سارا زور تزکیہ ہی پر رہ گیا۔ افراد کو مانجھے جاؤ، رگڑے جاؤ، پھر جن کا تزکیہ ہوا ہے ان کو بھی اسی کام میں لگا دو کہ اور لوگوں کو مانجھیں رگڑیں، مگر اس بات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی کہ جن کو مانجھا اور رگڑا گیا ہے، ان کو کسی انقلابی عمل میں شریک کرنا ہے۔ یقیناً حضور ﷺ نے تزکیہ کیا، مگر تزکیہ کے بعد پھر افراد کو باطل کے ساتھ ٹکرا دیا۔ تزکیہ نہایت ضروری ہے: تعلیم کتاب سے مراد قانون، شریعت کی تعلیم و تنفیذ ہے، مگر اس سے پہلے ضروری ہے کہ افراد کا تزکیہ ہو۔ اگر تزکیہ نہیں ہوا یعنی آپ کے ارادے اُمنگیں، نیتیں خالص نہیں ہیں، تو آپ کو جو علم حاصل ہوگا وہ آپ کو غلط رُخ پر لے جائے گا۔ آپ اُس کے ذریعے علم اور روحانیت کی دوکانداری کریں گے ؎

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

(اگر علم کو تن پر ڈال دو گے تو یہ تمہارا سانپ ہے جو تمہیں ڈسے گا۔ اور اگر اسے دل پر ڈالو گے تو یہ تمہارا دوست ہے۔)

یہ علمائے سوء کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا تزکیہ نہیں ہوا ہوتا۔ وہ علم کا بہت بڑا خزانہ تو جمع کر لیتے ہیں، لیکن چونکہ نیتوں میں فطور ہوتا ہے، لہٰذا فتویٰ فروشی کرتے اور دینی دوکانداری چمکاتے ہیں۔ یہ بات اتنی یقینی ہے کہ تبع تابعین کے دور ہی میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جو مجاہد، عالم اور محدث تھے، فرماتے تھے:

وما افسد الدین الا الملوك واحبار سوء و رھبانھا

(دین میں جتنا فساد اور فتنہ اُٹھا ہے، وہ یا بادشاہوں نے اُٹھایا یا پھر علمائے سوء اور

صوفیاء نے۔)

اس لیے تو اقبال نے کہا تھا ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

<u>تلاوت آیات کے دو بنیادی مقاصد</u>: اب آیئے' آپ کے اساسی منہج کے حوالے سے جو چار اصطلاحات آئی ہیں' اُن میں سے تلاوت آیات پر کچھ مزید بات ہو جائے۔

''تلاوت آیات'' کا ایک مقصد تو میں نے بیان کر دیا تھا کہ قرآن ایک مقناطیس ہے جو سلیم الفطرت لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ جس شخص کے اندر روح مر نہ گئی ہو' جس کے دل پر حجابات اتنے مضبوط نہ ہو گئے ہوں کہ ایمان کی روشنی اندر داخل ہی نہ ہو سکے' جس کی روح ابھی زندہ ہو' اگرچہ ضعیف' کمزور اور نحیف ہو' قرآن اس کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے بالکل اُسی طرح جیسے مقناطیس لوہے کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ اِس لیے کہ روح اور قرآن دونوں ایک جگہ سے آئے ہیں۔ روح بھی اللہ کے پاس سے آئی ہے۔ یہ زمین کی شے نہیں ہے۔ جیسا کہ ہمارا جسد خاکی زمین کی شے ہے اور قرآن بھی اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ لہٰذا جب قرآن کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو روح اِس کی جانب کھنچتی ہے۔ ع از کجا می آید ایں آواز دوست (یہ میرے دوست کی آواز کہاں سے آتی ہے؟)

تلاوت آیات کا دوسرا مقصد جو بیان ہونے سے رہ گیا تھا' یہ ہے کہ قرآن ہی لوگوں کے اندر یقین والا ایمان پیدا کرتا ہے۔ اس کے لیے نہایت اہم لفظ خود ''آیت'' ہے۔ آیت کے معنی نشانی کے ہیں۔ بہت سادہ سی مثال ہے۔ آپ کے ایک دوست نے کسی وقت آپ کو بہت قیمتی قلم دیا تھا۔ آپ نے اسے استعمال نہیں کیا' اور ٹرنک میں رکھ دیا تا کہ تا دیر خراب نہ ہو۔ سالہا سال بیت گئے' آپ کو نہ دوست یاد آیا اور نہ قلم یاد آیا۔ کبھی یہ خیال ہی نہیں رہا۔ پھر اچانک ایک دن آپ نے وہ ٹرنک کھولا تو آپ کی نظر قلم پر پڑی۔ نظر پڑتے ہی آپ کو دوست یاد آ جائے گا۔ اس میں کسی عقل و شعور کی ضرورت ہے۔ اسی کا نام تذکر ہے۔ آیات قرآنی یاددہانی کراتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں ''ذکر'' کا لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے۔ قرآن خود کو ''الذکر'' قرار دیتا ہے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ ''بے شک ہم ہی نے ''الذکر'' نازل کیا۔'' پھر قرآن میں ذکریٰ' تذکرا ور تذکیر کے الفاظ بھی کئی مرتبہ آئے ہیں۔ پس آیات اللہ کی یاد تازہ کرتی ہیں' اُس کے وجود کی گواہی دیتی ہیں۔ از روئے قرآن

آیات تین قسم کی ہیں۔ آیاتِ آفاقی' آیاتِ انفسی اور آیاتِ قرآنی۔ آیاتِ آفاقی وہ ہیں جو کائنات میں بکھری ہوئی ہیں۔ اہل عقل ان پر غور کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ﴿۱۹۰﴾﴾ (آل عمران)

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

سورۃ البقرہ میں فرمایا:

﴿وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ﴿۱۶۴﴾﴾

''اور مینہ میں جس کو اللہ آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز) کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں عقلمندوں کے لئے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔''

سورۂ حٰم السجدہ' آیت ۵۳ میں فرمایا:

﴿سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ؕ﴾

''ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے۔''

اِس آیت مبارکہ میں علمِ انسانی کے دائرہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور جدید اکتشافات وانکشافات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ آیاتِ آفاقی ہیں۔ فرانسیسی سرجن ڈاکٹر مورس بوکائے نے قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا کہ میرا دل اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے کہ اس قرآن میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے سائنس نے غلط ثابت کیا ہو۔ البتہ اُس دَور میں جبکہ انسان کا اپنا ذہنی ظرف وسیع نہیں ہوا تھا' علومِ انسانی اور معلوماتِ انسانی کا دائرہ محدود تھا' اس وقت سائنسی اشارات کی حامل آیاتِ قرآنیہ کا کیا مفہوم سمجھا گیا' یہ بات اور ہے۔ کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے اصل اہمیت تو قرآن کے الفاظ کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر مورس بوکائے نے قرآن کا تورات کے ساتھ تقابل کیا۔ تورات میں یہ مباحث موجود ہیں کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی' اللہ نے اسے

کیسے بنایا۔ مختلف سائنسی مظاہر (phenomena) قرآن میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر موریس بوکائے نے اس اعتبار سے محسوس کیا کہ تورات میں کئی ایسی چیزیں ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر موریس بوکائے کے علاوہ میں ڈاکٹر کیتھ ایل مور قرآن حکیم میں علم جنین سے متعلق اشارات پا کر بے حد حیران ہوا کہ یہ معلومات چودہ سو برس پہلے کہاں سے آ گئیں! فزیکل سائنسز میں جیسے جیسے انسان ترقی کرتا جائے گا' یہ بات مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی کہ یہ کلام حق ہے۔ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

بہرحال آیات تین طرح کی ہیں۔ آیاتِ آفاقی' آیاتِ انفسی اور آیاتِ قرآنی۔ یہ تینوں مل کر کام کرتی ہیں۔ ان میں آیاتِ قرآنیہ کا کام عمل انگیز (catalytic agent) کا ہے۔ آپ نے کیمسٹری میں پڑھا ہوگا۔ دو سالٹ اگر باہم مل کر تعامل نہیں کرتے تو کوئی تیسری چیز آ کر اُن میں تعامل کرا دے گی۔ یہ تیسری چیز کیٹیلیٹک ایجنٹ کہلاتی ہے۔ قرآن کی آیات کیٹیلیٹک ایجنٹس ہیں' جو آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی کو لے کر انسان کے دل میں خوابیدہ ایمان کو ابھار کر اوپر کی سطح پر لے آتی ہیں۔ یہ ہے ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ سورۃ النور میں فرمایا گیا: ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ یعنی ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔'' نور دو طرح کے ہیں۔ ایک نورِ فطرت ہے جو انسان کے دل میں ہوتا ہے' اور دوسرا نورِ قرآن ہے۔ نورِ فطرت اور نورِ قرآن مل کر نورِ ایمان بنتے ہیں۔

## ☆ تصادم کا آغاز انقلابی کرتے ہیں

ایک اور انتہائی باریک نکتہ یہ ہے کہ تصادم کا آغاز ہمیشہ انقلابی کرتے ہیں۔ دورِ نبویؐ میں بھی تصادم کی ابتدا کفار اور مشرکین نے نہیں کی بلکہ رسول اللہ ﷺ نے کی۔ انقلابی یہ کہتے ہیں کہ تمہارے خیالات غلط ہیں' تمہارے عقائد غلط ہیں' تمہارے نظریات غلط ہیں' تمہارا نظام غلط ہے۔ اس دعوت سے ساکن و جامد معاشرہ میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے' جیسا کہ تالاب کے کھڑے پانی میں پتھر پھینکیں تو لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ استحصالی معاشرہ جامد اور ساکن اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں ظالم اور ڈاکو آپس میں مفاہمت کر لیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے لڑتے نہیں۔ لہٰذا برے سے برا معاشرہ بھی پُر امن ہوتا ہے۔ مکہ کا معاشرہ بھی اس اعتبار سے پُر امن تھا۔ یہ کھڑے ہوئے پانی میں پہلا پتھر کس نے پھینکا؟ کس نے کہا کہ تمہارا نظام غلط ہے۔ تمہارے عقائد غلط ہیں۔ تمہارے الٰہ باطل ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں' کس نے کہا کہ

تمہارے سرمایہ دار غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتے‘ یتیموں کو دھتکار دیتے ہیں۔ یہ سب اللہ کے رسول ﷺ نے کہا ہے۔ کیا مشرکین مکہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس دعوت حق کی زد کن پر پڑ رہی ہے۔ ظاہر ہے‘ مراعات یافتہ استحصالی طبقات ہی دعوت حق کی زد میں آ رہے تھے۔ نظام حق کے بالفعل قیام کے لیے اِن طبقات کی سرکوبی ناگزیر تھی۔ اسی لیے تو آپ کو تصادم کے مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ اِسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے لوہا نازل فرمایا۔ اس بات کا ذکر سورۃ الحدید‘ آیت ۲۵ میں آیا ہے۔

<u>اسلام کے انقلابی فلسفہ کی نہایت واضح آیت</u>: میرے خیال میں سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ قرآن میں اسلام کے انقلابی فلسفے کی عریاں ترین آیت ہے‘ جس میں اللہ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾

’’ہم نے بھیج دیا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری اور میزان بھی (شریعت و قانون بھی‘ عدل کا نظام بھی)‘‘

اللہ نے یہ سب کیوں کیا؟ آگے اس کا جواب بھی دے دیا کہ:

﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾

’’تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔‘‘

یعنی ظلم و استحصال کا خاتمہ ہو‘ ڈپریشن ختم ہو۔ یہ جو کسان پر ظلم ہو رہا ہے‘ مزدور کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے‘ یہ باقی نہ رہے ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب‘ انقلاب‘ اے انقلاب!!

آگے فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾

’’اور ہم نے لوہا پیدا کیا۔ اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطرہ بھی شدید ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے اللہ اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں اللہ ان کو معلوم کر لے۔‘‘

اللہ نے لوہا اُتارا۔ اس میں جنگ کی صلاحیت ہے۔ اس سے تلوار اور ڈھال بنے گی‘

نیزہ بنے گا۔ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وہ وفادار بندے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد کرتے ہیں۔ یعنی لوہے کی طاقت سے دین حق کے مخالف بن کر سامنے آنے والوں کا سر کچلتے ہیں۔

جہاد ایمان کا لازمی تقاضا: غلبۂ دین حق کے لیے جہاد ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ سورۃ الصّف میں جہاں نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت اظہار دین حق کا ذکر ہے' اُس کے فوری بعد اہل ایمان سے یہ بھی فرمادیا کہ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝١٠ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ﴾

''مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے۔ (وہ یہ کہ) اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔''

گویا جہاد کے بغیر آخرت کے دردناک عذاب سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔

آگے اسی سورت میں فرمایا کہ اللہ کے معاون و مددگار بنو:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ﴾

''مومنو! اللہ کے مددگار بن جاؤ جیسے عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا کہ (بھلا) کون ہیں جو اللہ کی طرف (بلانے میں) میرے مددگار ہوں؟''

اللہ کے معاملے میں یہ معاونت کس کام میں درکار ہے۔ یہ معاونت اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد میں مطلوب ہے۔ اللہ کی مدد یہ ہے کہ اللہ کے جھنڈے کو کھڑا کیا جائے' اللہ کے دین کو قائم کیا جائے۔

اسی سورۃ الصّف میں وہ آیت بھی ہے جس میں صفیں باندھ کر قتال کا ذکر کیا گیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝٤﴾ (الصف)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں (ایسے طور) پر پرے جما کر لڑتے ہیں کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں وہ بے شک اللہ کے محبوب ہیں۔''

دین یہ تقاضا نہیں کرتا کہ بس تزکیہ ہو' کرامات کا تذکرہ ہو' ضربیں لگائی جائیں' قصے کہانیاں سنائی جائیں بلکہ وہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اگر فی الواقع مومن ہو تو پھر اللہ کے دین کے

غلبہ کے لیے جہاد وقتال کے مرحلے بھی طے کرو' کہ یہ دین کا حصہ ہے۔

مستشرقین کی کوتاہ نظری: یہاں یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ مستشرقین نے اپنی کوتاہ نظری کے باعث رسول ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مکی اور مدنی دور کے طرزِ عمل کو متضاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ ٹائن بی (Toynbee) نے حضور ﷺ کے بارے میں ایک بڑا زہر بھرا جملہ کہا تھا:

*"Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesman"*

[یعنی (معاذ اللہ) محمد (ﷺ) نبی کی حیثیت سے تو ناکام ہو گئے' لیکن بحیثیت سیاست دان کامیاب ہوئے''۔]

دراصل آپ کی مکی زندگی میں دعوت و تربیت' تزکیہ اور صبر محض کا نقشہ تھا۔ اس کے نزدیک انبیاء کا کام یہی ہوتا ہے۔ یہی کام تین سال تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ محمد (ﷺ) جب مکے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے (معاذ اللہ) مدینہ کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ مستشرقین اپنی گھٹیا ذہنیت اور کوتاہ فہمی کے سبب ہجرت مدینہ کو "Flight to Madina" کہتے ہیں' حالانکہ یہ فرار نہیں تھا' بلکہ ایک متبادل مرکز (Alternate Base) کی طرف منتقلی تھی۔ اس سے پہلے آپ نے متبادل مرکز کی تلاش میں طائف کا سفر اختیار فرمایا تھا' لیکن مشیت ایزدی کچھ اور تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ متبادل مرکز مدینہ کی شکل میں عطا کیا۔ مدینہ کی حیثیت انقلابی جدوجہد میں اقدام کے مرحلے کے آغاز کے لیے ایک Base کی تھی۔

برطانوی پروفیسر منٹگمری واٹ نے بھی' جسے ضیاء الحق مرحوم نے خاص طور پر پاکستان بلایا تھا' سیرت محمدی ﷺ پر دو کتابیں لکھیں:

(۱) Muhammad at Makkah

(۲) Muhammad at Madina

اس نے بھی ان دونوں کتابوں میں یہی بات کہی ہے کہ مکے والا محمد (ﷺ) کچھ اور ہے' مدینے والا کچھ اور۔ مکے والا محمد (ﷺ) تو داعی' مبلغ' مزکی اور درویش ہے اور اس کی سیرت میں واقعتاً نبیوں والا نقشہ نظر آتا ہے جبکہ مدینے والا محمد (ﷺ) تو ایک مدبر' منتظم' سٹیٹس مین' سیاست دان اور سپہ سالار ہے۔ اس کے نزدیک یہ دونوں شخصیتیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ منٹگمری واٹ نے "Muhammad at Madina" میں حضور ﷺ کے لیے مدح اور تعریف کے بہت ہی خوبصورت الفاظ کو جمع کیا ہے۔ آپ کی دور اندیشی' معاملہ فہمی' صورت حال کے صحیح

ادراک اور صحیح اقدام کی صلاحیت‘ آپؐ کی انسان شناسی اور ہر انسان کی ذہنی سطح کا اندازہ کرتے ہوئے اس سے اس کی سطح پر بات کرنے اور اس کی صلاحیت و استعداد کے مطابق کام لینے جیسی تمام خصوصیات کا تذکرہ اس نے کھلے دل کے ساتھ کیا ہے۔ اس نے حضور ﷺ کی موقع شناسی‘ تدبر اور سیاست وغیرہ کے جتنے بھی اعلیٰ ترین اوصاف ہیں ان کا ذکر افعل التفضیل (superlative degree) کے صیغے میں کیا ہے۔ اس سے ایک مسلمان دھوکا کھاتا ہے کہ یہ کتاب حضور ﷺ کی تعریف میں لکھی گئی ہے‘ حالانکہ درحقیقت وہ تضاد (contrast) بیان کر رہا ہے کہ بحیثیت سیاست دان (statesman) تو آپؐ کامیاب ہیں جبکہ بحیثیت نبی (معاذ اللہ) آپؐ ناکام ہو گئے۔

کوتاہ نظری کی وجہ: لوگوں کو یہ تضادات سیرت طیبہ کو صحیح تناظر میں نہ سمجھنے کی وجہ سے نظر آتے ہیں۔ ورنہ اگر گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو جو چیز بظاہر تضاد نظر آتی ہے‘ وہ تضاد نہیں بلکہ انقلابی جدوجہد کے مختلف مراحل کے مختلف تقاضے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۲ سالہ مکی دور میں مسلمانوں کو حکم تھا کہ چاہے تمہارے جسم کے ٹکڑے کر دیے جائیں‘ تم ہاتھ نہیں اُٹھاؤ گے۔ اور پھر مدینہ میں آ کر کہا گیا کہ ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ﴾ (البقرہ: ۱۹۰) ’’اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے لڑو۔‘‘ تلوار ہاتھ میں لو‘ اگر کوئی اینٹ مارے تو اُسے پتھر مارو۔ اسی طرح ایک وقت تھا جب آپؐ دب کر صلح حدیبیہ کر رہے تھے۔ جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت اضطراب کی کیفیت میں تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضبط نہ کر سکے تو آپؐ سے کچھ cross questions بھی کر بیٹھے‘ جس پر بعد میں پچھتاتے رہے‘ مگر پھر اس صلح کے محض ایک سال کے بعد جب مکے کا سردار مدینہ آیا اور سفارشیں کرواتا رہا کہ صلح کا معاہدہ ختم نہ کیجیے‘ تو آپؐ نے اُس کی بات نہ مانی۔ دراصل یہ سب ایک ہی انقلابی عمل کے مختلف مراحل ہیں۔ پراسس ایک ہی ہے‘ لیکن پراسس کے ایک مرحلہ کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے‘ دوسرے مرحلے کا تقاضا کچھ اور۔ آپؐ کے پیش نظر انقلاب تھا‘ نہ لڑائی مقصود تھی نہ صلح مقصود تھی‘ مقصود اللہ کے دین کا غلبہ تھا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے کسی درجے میں سیرت کی خدمت کی یہ توفیق بخشی ہے کہ میں نے اپنی کتاب ’’منہج انقلاب نبویؐ‘‘ میں ان سب اشکالات کا حل بتایا ہے۔

یہ بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ حضور ﷺ کی ذاتی زندگی میں خفیہ دعوت کا کوئی دور نہیں آیا۔

آپؐ نے کوئی بات خفیہ طور پر نہیں کی۔ آپؐ کی کوئی زیرزمین سرگرمیاں نہیں تھیں۔ البتہ Low profile میں ذاتی رابطوں کے ذریعے یہ بات پھیلائی' لیکن پھر جب حکم آ گیا ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ یعنی "(اے محمدؐ!) اب ڈنکے کی چوٹ کہو جس کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔" تو آپؐ کوہِ صفا پر تشریف لے گئے۔ اب تو کوہِ صفا کی بس علامت باقی رہ گئی ہے' حضور ﷺ کے زمانے میں وہ باقاعدہ پہاڑی تھی' ایسی پہاڑی کہ جس کے پیچھے کوئی لشکر بھی چھپ سکتا تھا۔ کوہِ صفا پر چڑھ کر آنحضور ﷺ نے عرب کے مروجہ دستور کے مطابق قوم کو ندا دی۔ یہیں سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دعوت و ابلاغ کے لیے اپنے زمانے میں جو بھی مروجہ طریقے ہوں ان کو اختیار کیا جانا چاہیے۔ البتہ اگر حیا اور شرافت کے منافی کوئی شے ہو تو اس سے احتراز کیا جائے۔ اُس دَور میں غارت گری اور لوٹ مار کے لیے قبائل ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ یہ حملہ عام طور پر رات کو ہوتا' بلکہ رات کے بھی پچھلے پہر small hours of the morning میں' یعنی رات کے دو' تین' چار بجے' جبکہ نیند کا انتہائی غلبہ ہوتا ہے۔ اس وقت سوئے ہوؤں پر آ کر ٹوٹ پڑنا اور قتل و غارت گری اور لوٹ مار کر کے بھاگ جانا' یہ ان کا ایک عام رواج تھا۔ لہٰذا اگر قبیلے کے کسی فرد کو یہ اطلاع مل جاتی کہ کوئی قبیلہ ان پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے تو وہ بلند مقام پر چڑھ کر کپڑے اتار کر مادر زاد برہنہ ہو کر نعرہ لگاتا تھا کہ "وَاصَبَاحَا" (ہائے وہ صبح جو آیا چاہتی ہے) یعنی جس میں غارت گری' لوٹ مار اور کشت و خون ہو گا۔ اب اس میں دونوں صورتیں یعنی سمعی اور بصری جمع ہو جاتیں۔ اس لیے کہ جہاں تک تو اس کی آواز جارہی ہوتی وہاں تک لوگ اس کی آواز کو سنتے اور دوڑے چلے آتے اور جہاں اس کی آواز نہیں جارہی ہوتی تو وہ کھڑا ہوا عریاں نظر آتا۔ اسی لیے اسے "نذیر عریاں" کہا جاتا تھا' یعنی وہ خبردار کرنے والا' متنبہ کرنے والا جو بالکل ننگا ہو گیا ہو۔ حضور ﷺ نے بھی قوم کو آگاہ کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا البتہ برہنگی کے معاملے کی اصلاح کی۔ کیونکہ یہ بات حیا و فطرت کے خلاف ہے اور آپؐ کے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا' لیکن نعرہ وہی لگایا کہ "وَاصَبَاحَا"۔ اب لوگ آ کر جمع ہو گئے اور انہوں نے آپؐ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ آپؐ اونچائی پر کھڑے تھے' آپؐ نے قوم کو اپنی دعوت پیش کی۔ اس پر آپؐ کا چچا ابولہب کہنے لگا "تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟" تمہارے لیے ہلاکت و بربادی ہو' کیا تم نے ہمیں اس کام کے لیے جمع کیا ہے؟" ہم تو سمجھتے تھے کہ تم واقعتاً کوئی خبر دینے والے ہو' کوئی بات بتانے والے ہو۔ حضور ﷺ نے

پہلے فرمایا کہ لوگو! میں اگر تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کا لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات مانو گے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ ضرور' اس لیے کہ آپؐ پہاڑ کی بلندی پر کھڑے ہیں اور پہاڑ کے دونوں جانب دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں' آپؐ تو الصادق اور الامین ہیں۔ آپؐ نے لوگوں سے پہلے یہ گواہی لے کر بات کی ہے کہ میں تمہیں اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں' آخرت کے محاسبے سے خبردار کرتا ہوں۔ جس پر آپؐ کے چچا نے کہا تھا کہ ''تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا؟''۔ بہرحال آپؐ نے ایک دن بھی زیر زمین تحریک نہیں چلائی۔

# باطل سے تصادم کا مرحلۂ اوّل: صبرِ محض

انقلابی جدوجہد کو اگر انتہائی اختصار سے بیان کیا جائے تو اس کے تین مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ جماعت سازی ہے۔ اس پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ دوسرا مرحلہ باطل نظام سے تصادم ہے۔ سیرت طیبہؐ میں تصادم میں مرحلہ اول کیا تھا؟ صبرِ محض۔ صبرِ محض (passive resistance) کا مطلب یہ ہے کہ انقلابی تحریک کے کارکن اپنے موقف پر ڈٹے رہیں' پیچھے نہ ہٹیں' لیکن تشدد و تعذیب کے جواب میں کسی قسم کی جوابی کارروائی نہ کریں۔ اس صبرِ محض کے بھی دو مراحل ہیں۔

## زبانی کلامی تشدد:

صبرِ محض کا پہلا مرحلہ وہ ہے جس میں زبانی کلامی تشدد ہوتا ہے۔ یعنی کوفت پہنچاؤ' ذہنی اذیت پہنچاؤ' لیکن کوئی جسمانی تشدد اور جسمانی تکلیف نہ دو۔ اس مرحلہ پر اصل ہدف اور نشانہ خود داعی بنتا ہے' اس کے ساتھی نہیں بنتے۔ اس لیے کہ ابتدا میں لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص ہے جس کا دماغ خراب ہوا ہے اور یہ ہمارے نوجوانوں کے دماغ خراب کر رہا ہے۔ ان نوجوانوں کو تو انہوں نے reclaim کرنا ہے' انہیں واپس لینا ہے' لہٰذا اُن کے خلاف ابھی ہاتھ نہیں اُٹھائے جائیں گے بلکہ داعی کی شخصیت کو مجروح کرنے (character assassination) کی کوشش ہوگی۔ کہا جائے گا کہ یہ پاگل ہے' fanatic ہے' ساحر ہے' شاعر ہے اور دیوانہ ہے۔ سیرتِ مطہرہ میں یہ ساری ہی باتیں ملتی ہیں' جن کا تذکرہ ابتدائی مکی

سورتوں میں آتا ہے۔ مکی دور کے قریب قریب تیرہ برس کے ابتدائی تین سالوں میں صرف نبی اکرم ﷺ پر تشدد ہوا ہے اور یہ تشدد جسمانی نہیں بلکہ صرف زبانی کلامی تھا کہ ان کو کوفت پہنچاؤ' انہیں ذہنی اذیت دو۔ جیسے کہ سورۃ الحجر میں ان معاندین ومخالفین کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْہِ الذِّکْرُ اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ﴾ اگر عربی زبان سے ذرا سی واقفیت ہو تو اندازہ ہوگا کہ کتنا زہر میں بجھا ہوا یہ جملہ ہے: ''اے فلانے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس پر کوئی ذکر نازل ہو رہا ہے' ہم تو تم کو پاگل سمجھتے ہیں۔'' اب یہ بات بھی محمد رسول اللہ ﷺ نے سنی۔ غور کیجیے' آپ کی طبیعت پر اس کا کس قدر اثر ہوا ہوگا۔ اس کو کہتے ہیں اعصابی جنگ (war of nerves) یعنی کسی طرح سے ان کی قوت ارادی کو ختم کردو' ان کے اندر جو آہنی عزیمت ہے کسی طرح اس کو پگھلا کر رکھ دو۔ اسی سورۃ الحجر کے آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ﴾ ''(اے محمد ﷺ) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس سے آپ کا سینہ بھنچنے لگتا ہے (آپ کو شدید ذہنی اذیت وکوفت ہوتی ہے)''۔

داعی سوچتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو کل تک میرے قدموں تلے آنکھیں بچھاتے تھے' جو مجھے دیکھتے ہی کہا کرتے تھے: جَاءَ الصَّادِقُ' جَاءَ الْاَمِیْنُ ...... ہر جگہ خیر مقدم ہوتا تھا' ہر ایک مجھ سے محبت کرتا تھا' ہر شخص میرا احترام کرتا تھا' لیکن یہی لوگ ہیں جو آج میرا استہزاء وتمسخر کر رہے ہیں' کوئی مجنون ودیوانہ کہہ رہا ہے' کوئی شاعر وساحر کہہ رہا ہے۔ سورۃ الدخان میں فرمایا: ﴿وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴾ ''وہ کہنے لگے (یہ تو معاذ اللہ) پڑھایا ہوا (اور) دیوانہ ہے''۔ یعنی آپ کو کوئی اور سکھاتا پڑھاتا ہے اور یہ آکر ہم سے کہتے ہیں کہ یہ کلام مجھ پر اللہ کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ حضور ﷺ کے قلب مبارک پر کیا گزرتی ہوگی جب یہ باتیں کہی جاتی ہوں گی۔ مزید برآں آپ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان پر کسی آسیب کا سایہ ہوگیا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک روز حضور ﷺ کی خدمت میں عتبہ بن ربیعہ آیا جو قریش کے بڑے سرداروں اور چودھریوں میں سے تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے معاندین ومخالفین میں سے یہ شخص بڑا شریف النفس تھا۔ وہ بڑے ہی مخلصانہ ومشفقانہ اور بڑے ہی مربیانہ وہمدردانہ انداز میں حضور ﷺ سے کہنے لگا کہ ''بھتیجے! اگر واقعی تم پر کسی بدروح کا سایہ ہوگیا ہے تو مجھے بتادو' میرے بہت سے عاملوں اور ماہرفن کاہنوں سے تعلقات ہیں' میں کسی کو بلا کر تمہارا علاج کرادوں گا''۔ غور کا مقام ہے کہ یہ سن کر حضور ﷺ کے قلبِ مبارک پر کیا گزری

ہوگی۔تشدد کا پہلا نشانہ بحیثیتِ داعیٔ اول جناب محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس تھی۔استہزاء وتمسخر بھی بلاشبہ تشدد ہوتا ہے بلکہ ذہنی اور نفسیاتی کوفت سے بڑا تشدد کوئی اور نہیں۔جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ تکلیف انسان کو اُس وقت ہوتی ہے جب اسے ذہنی کوفت پہنچتی ہے۔چنانچہ ابتدائی تین سال تک اعصاب شکنی کی پوری کوشش ہوتی رہی تاکہ آپ کے اعصاب ٹوٹ کر رہ جائیں اور آپؐ میں وہ ہمت باقی نہ رہے کہ کھڑے رہ کر دعوت پیش کرتے رہیں۔

مخالفین کی طرف سے اس کی ایک اور انداز سے بھی کوشش ہوئی تھی۔بعض عامل لوگوں نے بہت سی ریاضتوں کے ذریعہ سے اپنی آنکھوں کے اندر ایک خاص کشش اور چمک پیدا کر لی ہوتی ہے اور قوتِ ارادی کو اپنی آنکھوں میں اس طور سے مرتکز کر لیا ہوتا ہے کہ وہ کسی کو گھور کر دیکھیں تو وہ دہل کر رہ جائے اور اس کی قوت ارادی پاش پاش ہو جائے۔یہ نفسیاتی مشقیں دنیا میں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں اور آج کے دور میں تو اس نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر ایسی کوششیں بھی کی گئیں۔سورۃ القلم میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ۝﴾ ''یہ کفار جب ''الذکر'' یعنی قرآن سنتے ہیں تو یہ آپؐ کو ایسی نگاہوں سے گھور کر دیکھتے ہیں گویا آپؐ کے قدم اکھاڑ دیں گے (آپؐ کی آہنی قوت ارادی کو پاش پاش کر دیں گے) اور یہ کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) یہ ضرور مجنون و دیوانہ ہے۔'' استہزاء و تمسخر کے یہ الفاظ آپؐ کے قلبِ مبارک پر تیر کی طرح جا کر لگ رہے ہیں۔بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے عاملین کی باقاعدہ خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ اپنی نگاہوں سے جناب محمد ﷺ کی قوت ارادی کو پاش پاش کر کے رکھ دیں۔مولانا اصلاحی صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ اس کا ایک خاص طریقہ ہے۔رات کو عین تہجد کے وقت سفید لباس پہنو سفید چادر بچھاؤ اس کے اوپر سفید کاغذ پر ایک نکتہ لگاؤ اور پھر اُس پر اپنی نگاہ جماؤ دیکھتے رہو۔پلک جھپکنے نہ پائے۔اس سے آنکھوں میں ایک خاص قوت جمع ہو جائے گی۔اب آپ کسی کو دیکھیں گے تو وہ آپ کی نگاہ سے نگاہ نہیں ملا سکے گا۔پس یہ ہے تشدد کا پہلا دور یعنی داعیٔ اول کو ذہنی کوفت پہنچانے کی ہر امکانی سعی و کوشش۔چنانچہ پہلے تین سال میں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور صاحبِ ایمان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا ہو۔اس لیے کہ ان کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے اصل مسئلہ تو داعیٔ اول ہی تھا جو یہ دعوت لے کر کھڑا ہوا۔لہٰذا وہ کہتے تھے کہ کسی

طریقہ سے اس کو دعوتِ حق سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جائیں تو مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ ہمارے کچھ جوشیلے اور سر پھرے نوجوان ہیں اور ہمارے شرفاء میں سے بھی کچھ لوگ اس کی باتوں میں آ گئے ہیں' لیکن اگر ہم نفسیاتی و ذہنی حملوں کے ذریعہ سے اس داعیٔ اول کو بددل (disheart) کر دیں اور اس کی قوت ارادی کو ختم کر دیں تو یہ سب سے کامیاب حربہ ہے۔ پھر کامیابی ہی کامیابی ہے۔

## جسمانی تشدد:

صبر محض کے دوسرے مرحلہ میں جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس پہلے تین سال تو جناب محمد رسول اللہ ﷺ اس بدترین ذہنی و اعصابی تشدد کا نشانہ بنے رہے۔ آغازِ وحی کے بعد چوتھے سال سردارانِ قریش دارالندوہ میں باقاعدہ مشاورت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اب تک ہم نے جو تدبیریں کی ہیں وہ سب ناکام ہو چکی ہیں اور یہ دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہے۔ گویا ع ''نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے''۔ اور اب تو یہ آگ ہمارے بارود خانوں تک پہنچ گئی ہے اور ہمارے غلاموں کے طبقہ کے لوگ محمد (ﷺ) کی دعوت کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں۔ ان کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اب کیا ہو گا؟ کیونکہ غلاموں کا طبقہ اس معاشرے کے لیے بڑی افرادی قوت (human potential) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نظام میں غلام اپنی قسمت پر قانع تھے اور حالات سے سمجھوتا کر چکے تھے کہ ٹھیک ہے' ہمارے نصیب میں یہی کچھ ہے۔ لیکن اگر کہیں ان کے اندر ان کی عزتِ نفس بیدار کر دی گئی' اور ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ہم بھی انسان ہیں اور ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں تو کیا ہو گا؟ پھر تو ہمارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ یہ طاقت اگر کہیں ہمارے خلاف کھڑی ہو گئی تو اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کی اس تشویش میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا کہ جناب محمد (رسول اللہ ﷺ) کی دعوت ہمارے نوجوانوں میں نفوذ کر رہی ہے جو ایک بڑے خطرہ کی علامت ہے۔ آپ اندازہ کیجیے کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ خاندانِ بنو اُمیہ کے ایک صالح نوجوان۔ مصعب بن عمیر' سعد بن ابی وقاص' حذیفہ بن عتبہ اور عبداللہ بن مسعود کون ہیں؟ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ یہ اونچے گھرانوں کے نوجوان ہیں۔ یہ اور متعدد دوسرے نوجوان محمد (ﷺ) کے قدموں میں پہنچ گئے۔ لہٰذا کفارِ مکہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب تک ہماری جو حکمت عملی تھی وہ کامیاب اور مؤثر ثابت نہیں ہوئی۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ اب ان پر

جسمانی تشدد کرو تا کہ اُن کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ ہم میں سے جس کو بھی کسی پر کوئی اختیار اور کوئی اقتدار حاصل ہے وہ اسے اُس پر استعمال کرے اور اُس کو جور و تعدی اور ظلم و ستم کا نشانہ بنائے' تا کہ وہ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ آئے۔ چنانچہ آغازِ وحی کے چوتھے سال اہل ایمان کے لیے جسمانی تشدد کا دور شروع ہوا۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ابتدائی تین سال تک تو ذہنی تشدد اور اذیت کا ہدف خاص طور پر حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس رہی۔ لیکن اب قریباً تمام اہل ایمان شدید قسم کی تعذیب' تعدّی اور بہیمانہ ظلم و ستم کا ہدف بنے۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں' وہ غلام نہیں ہیں' کوئی آقا تو ان کو نہیں مار سکتا۔ لیکن وہاں کے معاشرے کے اصول و رواج کے مطابق آنجنابؓ کا چچا موجود ہے جو بمنزلہ باپ ہے اور اسے اپنے بھتیجے پر اختیار حاصل ہے۔ اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مارا بھی اور بالآخر ایک چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھونی دے دی۔ اب دم گھٹ رہا ہے اور مرنے کے قریب ہیں۔ آخر کوئی وجہ تھی کہ جب نبوت کے پانچویں سال میں حضور ﷺ نے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہجرت حبشہ کی اجازت دی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور آپؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا جو رسول اللہ ﷺ کی لختِ جگر ہیں' یہ دونوں ان میں شامل تھے۔ جعفر رضی اللہ عنہ بن ابوطالب بھی ان مہاجرین میں شامل تھے جو بنو ہاشم کے سردار کے بیٹے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں۔ یہ لوگ غلام تو نہیں تھے۔ لیکن وہاں بزرگوں کو خود اِن پر ایک اختیار حاصل تھا' لہٰذا یہ نوجوان اہل ایمان اپنے گھر والے مشرکین کے تشدد اور مظالم کا نشانہ بن رہے تھے۔

لیکن غلاموں کے ساتھ اس سے بھی بہت آگے بڑھ کر جور و ستم کا معاملہ ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ظلم و تشدد کی چکی میں سب سے زیادہ پسنے والے یہی لوگ تھے۔ ان کے تو کوئی حقوق تھے ہی نہیں' کیونکہ وہ اپنے آقاؤں کے مملوک تھے۔ ان کے آقا اگر انہیں ذبح کر دیں تو ان سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے کسی کی بکری ہو تو وہ جب چاہے اسے ذبح کر دے' کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ غلاموں کے ساتھ وہاں جو کچھ ہوا اس کو سن کر سخت سے سخت دل شخص کو بھی جھرجھری آ جاتی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ اُمیہ بن خلف نے جو کچھ کیا وہ آپ کے علم میں ہے۔ لیکن کوئی نہیں تھا جو اس سے پوچھ سکے کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ ایک گوشت پوست کے زندہ انسان کے ساتھ وہ بہیمانہ سلوک کیا جا رہا تھا جو اگر کسی مُردہ جانور کے ساتھ بھی کیا جائے تو طبیعت میں ناگواری کا احساس پیدا ہو جائے' لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

مکہ میں ان کے علاوہ ایک اور طبقہ تھا جو حلیفوں کا طبقہ کہلاتا تھا' جو نہ قرشی تھے' نہ غلام تھے' بین بین کی ایک حیثیت کے حامل تھے۔ دراصل مکہ صرف ایک قبیلے کا شہر تھا' اس میں صرف قریش آباد تھے' اور کوئی دوسرا قبیلہ آباد نہیں تھا ــــ اس تفاوت کو پیش نظر رکھئے کہ تمدنی اعتبار سے مدینہ منورہ زیادہ ارتقائی مرحلے پر تھا۔ اس میں پانچ قبیلے آباد تھے' عربوں کے دو قبائل اوس اور خزرج اور یہودیوں کے تین قبائل بنو نضیر' بنو قینقاع اور بنو قریظہ ــــ جبکہ مکہ تمدنی اعتبار سے بھی ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا اور صرف ایک قبیلے کا شہر تھا۔ اب اس میں یا تو قریش آباد تھے یا اُن کے غلام جو اُن کے نزدیک بھیڑ بکریوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک تیسری کیٹیگری وہ تھی کہ کوئی شخص باہر کا آ کر اگر خود کو قریش کی کسی بڑی شخصیت کی حمایت میں دے دے' اس کا حلیف بن جائے تو گویا وہ اس بڑے شخص کے زیر حفاظت مکہ میں رہ سکتا ہے۔ اس طرح اس قرشی کو اس پر پورا اختیار حاصل ہو جائے گا۔ اس کی حیثیت اگرچہ غلام کی نہیں ہے' لیکن وہ پوری طرح آزاد بھی نہیں۔ وہ گویا آزادوں اور غلاموں کے بین بین ایک تیسری مخلوق ہو گئی۔

حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہی تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یمن کے رہنے والے ایک باعزت انسان تھے۔ انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا' جس میں ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت ہوئی تھی۔ اسی کے پیش نظر وہ مکہ کے ایک شریف النفس شخص کی پناہ میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے۔ اسی شخص کی ایک کنیز حضرت سمیہ (رضی اللہ عنہا) سے آقا کی اجازت سے ان کا نکاح ہو گیا اور اس طرح یہ ایک خاندان بن گیا۔ وہ قرشی لاولد مر گیا اور جو شخص اس کا وارث اور جانشین بنا وہ ابوجہل تھا۔ چنانچہ اب وہی حیثیت آلِ یاسر پر ابوجہل کو حاصل ہو گئی۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ غلام تو نہیں تھے لیکن ابوجہل کے حلیف اور اس کی پناہ میں تھے۔ اس لیے کوئی اور ابوجہل سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ تم اس خاندان کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مسلسل اور بدترین تشدد کا نشانہ بننے والے یہ دو میاں بیوی اور ایک ان کے بیٹے حضرت عمارؓ ہیں۔ یہ تینوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے۔ ان پر ابوجہل نے شدید ترین مظالم کیے۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو شوہر اور بیٹے کی نگاہوں کے سامنے انتہائی بہیمانہ طور پر شہید کیا۔ یہ ایک مؤمنہ کا پہلا خون تھا جس سے مکہ کی سرزمین لالہ زار ہوئی۔ پھر حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پاؤں چار سرکش اونٹوں کے ساتھ باندھ کر انہیں چار سمتوں میں ہانک دیا گیا جس سے انؓ کے جسم کے پرخچے اُڑ گئے۔

## ہاتھ بندھے رکھو!

صحابہ کرام ؓ کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہو رہا تھا کہ ہمیں باطل کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا چاہیے' اس سے پنجہ آزمائی کرنی چاہیے۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیت ۷۷ کی تفسیر میں امام رازیؒ نے امام طبریؒ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں متعدد صحابہ کرام ؓ مثلاً عبدالرحمٰن بن عوف' سعد بن ابی وقاص اور بعض دوسرے صحابہ کرام (ؓ) کے نام مذکور ہیں' کہ یہ وہ حضرات تھے جو بار بار حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ اب ہمیں قتال کی اجازت ملنی چاہیے' ہم کب تک برداشت کریں گے! تصور کیجیے کہ جب مکہ میں حضرت سمیہ ؓ پر ظلم کیا جا رہا تھا جو صنفِ نازک میں سے تھیں' پھر بوڑھی بھی' تو کم از کم چالیس مسلمان موجود تھے۔ کیا ان کا خون کھولتا نہیں ہوگا؟ کیا وہ جوش میں نہیں آتے ہوں گے؟ اور حضور ﷺ سے عرض نہ کرتے ہوں گے کہ یا رسول اللہ! آپ کی نام لیوا ایک بوڑھی خاتون کو اس طرح ستایا جا رہا ہے اور بے عزت کیا جا رہا ہے' تو کیا ہم میں مردانگی کا جوہر نہیں ہے؟ ہمیں اس بربریت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا چاہیے۔ لیکن اس وقت حکم یہی تھا کہ نہیں' کُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ' اپنے ہاتھ بندھے رکھو' ابھی اپنے اس جوش و جذبہ کو تھام کر رکھو۔ جلد ہی وقت آئے گا' تب اپنا یہ جوش نکال لینا۔ کیونکہ انقلابی عمل کے اعتبار سے حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ جوش کو تھامو اور روکو۔ صبر کرو اور جھیلو۔ مدافعت میں ہاتھ مت اُٹھاؤ۔ چنانچہ حضور ﷺ جب حضرت یاسر ؓ کے خاندان کے پاس سے گزرتے تو انہیں صبر کی تلقین فرماتے: ((اِصْبِرُوْا يَا آلَ يَاسِرَ فَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ))(۱) ''اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو! اس لیے کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے۔'' حضرت عثمان ؓ کو اُن کے چچا نے مارا اور بالآخر ایک چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھونی دے دی۔ حضرت بلال ؓ کی گردن میں رسی ڈال کر اُن کا آقا چھوکروں کے ہاتھ میں تھما دیتا کہ اسے کھینچو۔ جیسے کچھ عرصہ پہلے عراق کی ابوغریب جیل میں قیدیوں پر تشدد کی تصویریں شائع ہوئیں کہ قیدیوں کو برہنہ کر کے گلے میں رسی ڈال کر انہیں زمین پر گھسیٹا جا رہا ہے۔ حضرت بلال ؓ کے ساتھ یہ معاملہ مکہ کی گلیوں میں ہوا۔ انہیں نوکیلے پتھروں والی زمین پر اس طرح گھسیٹا جاتا جیسے مردہ جانور کی لاش گھسیٹی جاتی ہے۔ حضرت خباب بن ارت ؓ جو پیشے کے اعتبار سے لوہار تھے' بڑے نیک نوجوان تھے۔ حضور ﷺ کے دامن سے وابستہ ہو کر اُن کا

(۱) مسند احمد' مرویات حضرت عثمان غنیؓ ۔

کردار مزید بلند ہوگیا۔ ایمان لانے کی پاداش میں اُن کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیا جاتا' جس سے وہ بجھ جاتے تھے۔ اس صورتحال میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہو رہا تھا کہ ہمیں باطل کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا چاہیے۔ اُس ظلم و ناانصافی کا قلع قمع کرنا چاہیے۔
متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کرتے تھے کہ اب ہمیں قتال کی اجازت ملنی چاہیے کہ ہم کب تک یہ ظلم و زیادتی برداشت کریں گے۔ اس سلسلے میں ایک روایت بھی آتی ہے۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ کعبہ کے سائے میں ایک چادر کو تکیہ بنائے تشریف فرما تھے۔ اس وقت ہم مشرکین کے ہاتھوں سختی سے دوچار تھے۔ میں نے کہا: کیوں نہ آپؐ اللہ سے دُعا فرمائیں۔ یہ سن کر آپؐ اُٹھ بیٹھے۔ آپؐ کا چہرہ مبارک سرخ ہوگیا۔ اور آپؐ نے فرمایا''جو لوگ تم سے پہلے تھے' ان کی ہڈیوں تک گوشت اور اعصاب میں لوہے کی کنگھیاں کر دی جاتی تھیں۔ لیکن یہ سختی بھی انہیں دین سے باز نہ رکھتی تھی''۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''اللہ اس امر کو یعنی دین کو مکمل کر کے رہے گا' یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضرموت تک جائے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ البتہ بکری پر بھیڑیے کا خوف ہوگا''۔ ایک روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ ــــ ''لیکن تم لوگ جلدی کر رہے ہو''(۱)
اسی پر سورۃ العنکبوت کی آیتیں اتریں ہیں جن میں وہی اظہار ناراضی ہے' جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

﴿الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ۝﴾

''الم۔ کیا لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ (صرف) یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے' چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی؟ اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں' ہم نے ان کو بھی آزمایا تھا (اور ان کو بھی آزمائیں گے) سو اللہ ان کو ضرور معلوم کرے گا جو (اپنے ایمان میں) سچے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ ہم نے پہلے بھی جو لوگ اس میدان میں آئے ہیں' ان کو آزمایا ہے۔ ٹھوک بجا کر دیکھا ہے۔ ان کے خلوص کا امتحان لیا ہے۔ ان کے صبر اور استقامت کو جانچا ہے۔ ہمارا

(۱) صحیح البخاری' کتاب الانبیاء' باب علامات النبوۃ۔

قاعدہ تو یہ ہے۔ لہٰذا جو بھی اس راستے پر آئے وہ سوچ سمجھ کر آئے۔ دعوت حق پھولوں کی سیج نہیں ہے' کانٹوں بھرا بستر ہے۔ جنت لینی ہے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔ یہی بات سورۃ البقرہ میں فرمائی گئی:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾﴾

''اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے۔ تو صبر کرنے والوں کو (اللہ کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو۔''

مکی دور میں اہل ایمان کو یہ حکم تھا کہ کسی تشدد' ظلم اور زیادتی کے جواب میں ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ سورۃ النساء کی مندرجہ ذیل آیت مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے اور وہ بھی مدنی دور کے پانچویں یا چھٹے سال' جس کے الفاظ ہیں: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ﴾ (النساء:۷۷) ''کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کی طرف جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔'' یہ حکم مکی دور کی کسی سورت میں نہیں ملے گا۔ اس وقت حکم یہ تھا کہ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرتے رہو ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

ابھی ''بر سلطنتِ جم زن'' کا حکم نہیں آیا تھا بلکہ تربیت اور تیاری کا مرحلہ تھا۔ اللہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ لو لگاؤ۔ اللہ کی محبت دلوں میں مزید جماؤ۔ اپنے عزم و ارادہ کو اور زیادہ تقویت دو۔ اللہ کی راہ میں مصائب و تکالیف جھیلنے کا خود کو زیادہ سے زیادہ عادی اور خوگر بناؤ۔ بقول اقبال ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

بہرحال یہ تعذیب کا دور چلا ہے۔ اسی کے ذریعے سے نظم کی پابندی کی ٹریننگ ہوئی ہے۔ اس ضمن میں ایک اور واقعہ بھی بتا دوں جو اگرچہ مجھے کسی کتاب میں تو نہیں ملا' تاہم ۱۹۷۹ء میں میں نے جدہ میں ایک ٹی وی سیریل ''فرسان اللہ'' دیکھی تھی' اُس میں یہ واقعہ دکھایا گیا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ابوجہل نے کسی بات پر تھپڑ دے مارا۔ جواب میں انہوں نے بھی ابوجہل کو تھپڑ رسید کر دیا۔ کیونکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو بہرحال شرفاء

میں سے تھے‘ غلام نہیں تھے۔ اُن کے جوابی تھپڑ رسید کرنے پر حضورﷺ نے پندرہ دن کے لیے انہیں مکہ بدر کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر تم صبر نہیں کر سکتے تو کچھ روز کے لیے مکہ سے باہر چلے جاؤ۔

## صبر محض کی حکمت:

اس صبر محض (passive resistance) کے مرحلہ کی حکمت یہ ہے کہ ابتدا میں چند باہمت اور سلیم الفطرت لوگ اس انقلابی نظریہ کے قائل اور حامی ہوتے ہیں۔ اگر وہ لوگ Violent ہو جائیں‘ یعنی تشدد کا جواب تشدد سے دینے لگیں تو اس غلط نظام کے علمبرداروں کو پورا اخلاقی جواز مل جائے گا کہ انقلاب کے حامیوں کو کچل کر رکھ دیں۔ جب تک انہوں نے ہاتھ نہیں اُٹھایا تو ان مخالفین و معاندین کے چودھریوں اور سرداروں کے پاس کوئی اخلاقی جواز نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس حال میں اگر وہ تشدد کر رہے ہوں تو وہ بلا جواز ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رفتہ رفتہ عامۃ الناس کی ہمدردیاں انقلابی جماعت کے ساتھ ہونی شروع ہو جاتی ہیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان لوگوں کو آخر کیوں مارا اور ستایا جا رہا ہے‘ جبکہ یہ ہمارے معاشرے کے شریف‘ بے ضرر اور بہتر افراد میں سے ہیں‘ اور یہ لوگ خاموشی سے کیوں ماریں کھا رہے ہیں! اب ذرا چشم تصور سے دیکھئے‘ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مکہ کی سنگلاخ اور تپتی زمین پر گردن میں رسی باندھ کر اس طرح گھسیٹا جا رہا ہے جیسے کسی مردہ جانور کی لاش کو گھسیٹا جاتا ہے۔ آخر دیکھنے والے بھی انسان تھے۔ ان کے اندر بھی احساسات تھے!۔ اگرچہ ان میں جرأت اور ہمت نہیں کہ اس بہیمانہ ظلم پر صدائے احتجاج بلند کریں۔ ایسے لوگوں کو اصطلاح میں خاموش اکثریت (silent majority) کہا جاتا ہے۔ یہ خاموش اکثریت اندھی اور بہری نہیں ہوتی۔ دیکھتی بھی ہے اور سنتی بھی ہے۔ خاموش تو ہے‘ بولتی نہیں ہے‘ لیکن وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی رہتی ہے کہ یہ کیسا ظلم ہو رہا ہے؟ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ جیسے محنتی اور فرض شناس غلام کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیوں ہو رہا ہے؟ خباب بن ارت رضی اللہ عنہ جیسے شریف النفس شخص کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر کیوں لٹایا جا رہا ہے؟ مکہ کے اندر یہ ظلم اہل مکہ دیکھ تو رہے تھے۔ مگر ظلم کرنے والے ابوجہل‘ ولید بن مغیرہ‘ اُمیہ بن خلف‘ عقبہ بن ابی معیط اور عتبہ بن ربیعہ وغیرہ بڑے بڑے چودھری اور سردار تھے۔ ان کے خلاف آواز اُٹھانا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ تو عوام کا ان کے خلاف کھڑے ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا‘ لیکن اندر ہی اندر ہمدردی کے احساسات پیدا ہو رہے تھے‘ بقول شاعر کیفیت یہ ہو رہی تھی کہ

ع ''جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ''۔ چنانچہ دل اندر ہی اندر فتح ہو رہے تھے۔ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان مظلوموں نے کوئی جرم نہیں کیا' کسی کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی' بس ایک بات کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ بس یہی ان کا ''قصور'' ہے۔ کسی پر انہوں نے آج تک ہاتھ نہیں اُٹھایا' کسی کو انہوں نے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا' پھر ان کے ساتھ یہ ظلم اور تشدد کیوں ہو رہا ہے؟

اصل میں صبرِ محض کے مرحلے کی حکمت اور اس کا فلسفہ یہی ہے۔ کسی انقلابی جماعت کو اس ''صبرِ محض'' (passive resistance) کے دور میں تین ابتدائی کاموں کو کرنے کی مہلت ملتی ہے۔ یعنی دعوت زیادہ سے زیادہ پھیلانا' دعوت قبول کرنے والوں کو منظم کرنا اور پھر اس مرحلے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان کی تربیت کرنا۔ اس لیے کہ اگلے تمام مراحل کی کامیابی کا دار و مدار انہی تمہیدی و ابتدائی مراحل کی پختگی پر ہے۔ اگر ان مراحل کے تقاضوں کو کماحقہ' ادا کیا گیا ہے اور انقلابی کارکنوں کی سیرت و کردار میں پختگی اور مضبوطی آ گئی ہے تب تو آگے چل کر کامیابی ہوگی' ورنہ وہی بات ہوگی کہ ریت کا گولہ بنا کر شیشے پر ماریں گے تو شیشہ کھڑا رہے گا اور وہ ریت بکھر جائے گی ـــ پھر ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ ماریں کھا کر لیکن ہاتھ نہ اُٹھا کر ایک طرف ان کارکنوں میں قوت برداشت اور قوتِ ارادی پروان چڑھتی ہے' اپنے نظریہ سے ان کی وفاداری مضبوط ہوتی ہے اور اس پر انہیں استقامت حاصل ہوتی ہے' جیسے خام سونا کٹھالی میں تپ کر کندن بنتا ہے اسی طرح ان انقلابی کارکنوں میں مظالم و مصائب کی بھٹیوں سے گزر کر ایک آہنی عزم اور پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں ایثار و قربانی کا جذبہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ اور دوسری طرف جور و تعدی' تشدد اور ظلم و ستم جھیل کر یہ لوگ معاشرہ کی خاموش اکثریت کے دل جیتتے چلے جاتے ہیں۔

یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت اگرچہ دے دی گئی تھی کہ اگر یہ تعذیب و تشدد تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے' تم اگر یہاں رہ کر نہیں کر سکتے تو اس ملک کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میری زمین بہت وسیع ہے۔ چنانچہ بعض مسلمانوں نے حبشہ کو ہجرت بھی کی ہے۔ لیکن ظاہر ہے' یہ ہجرت فرض نہیں تھی۔ اس تعذیب کا کلائمکس ۳ سال کی شعب ابی طالب کی قید ہے' جو سات نبویؐ سے ۱۰ نبویؐ تک رہی۔ بنو ہاشم گھروں سے نکال کر شعب ابی طالب میں محصور کر دیئے گئے' اور یہ طے کر دیا گیا کہ گھاٹی کے اندر کھانے پینے کی

کوئی چیز نہ جانے دی جائے گی۔ کچھ لوگ جیسے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ جو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے رشتہ دار تھے' رات کی تاریکی میں کبھی کبھار ایک پہاڑ کی چوٹی سے اتر کر کھانے کو کچھ دے آتے۔ ورنہ وہ وقت بھی آیا ہے کہ بنو ہاشم کے پھول جیسے چھوٹے چھوٹے بچے بھوک سے چلا رہے ہیں' اور سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ سوکھا چمڑا اُبال کر اس کا پانی ان کے حلق میں ٹپکا دیا جائے۔

تین سالہ سوشل بائیکاٹ سے چھٹکارا ہوا ہے تو یوں ہوا ہے کہ قریش کے چوٹی کے لوگوں نے ایک عہد نامہ پر دستخط کر کے جس پر لکھا تھا کہ اب بنو ہاشم کا بائیکاٹ ہے' کوئی بھی ان سے کوئی شے نہ خریدے گا اور نہ بیچے گا' اُسے خانہ کعبہ میں لٹکا دیا تھا۔ جب اسے دیمک کھا گئی' تو کسی نیک دل نے کہا کہ بھئی وہ تمہارا عہد نامہ تو ختم ہو گیا۔ اب خدا کے لیے اُسے تم بھی ختم کر دو۔ تب وہ ختم ہوا۔ لیکن اسی سال ۱۰ نبوی کو جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عام الحزن کہا ہے' حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ باہر کفار کی باتیں سن کر آپ دل و دماغ پر بوجھ لے کر آتے تھے۔ اپنے گھر میں تو ایک دلجوئی کرنے والی رفیقہ حیات تھی وہ بھی نہیں رہی۔ پھر اسی سال آپ کے چچا ابو طالب کا بھی انتقال ہو گیا۔ اگرچہ وہ ایمان نہیں لائے تھے مگر انہوں نے بنی ہاشم کے سردار کی حیثیت سے آپ کو تحفظ دیا۔ وہ قبائلی زندگی تھی۔ حضرت ابو طالب کے بنو ہاشم قبیلہ کے سردار ہونے کی وجہ سے پورا بنو ہاشم کا خاندان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی اقدام نہیں ہو سکا۔ اگر آپ کے خلاف اقدام ہوتا تو اس سے خانہ جنگی کا اندیشہ تھا۔ لیکن ابو طالب کے انتقال کے بعد وہ سہارا نہ رہا۔ لہٰذا کفار نے طے کر لیا کہ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مزید رعایت نہیں دی جائے گی۔ وہ آپ کی جان کے درپے ہو گئے۔ اس پر جو اگلی باتیں ہیں' ان شاء اللہ آئندہ تقریر میں ہوں گی۔ اصل سیرت کا مضمون تو گویا اب شروع ہوا ہے۔ اس سے پہلے تو ہم نے فلسفۂ سیرت پڑھا ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

۞۞۞

خطبۂ پنجم

# سیرت النبی ﷺ میں

# باطل سے تصادم کے تکمیلی مراحل

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیاتِ قرآنی☆' احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد!
معزز حضرات و محترم خواتین!

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول میں آپ کو پہلے بھی سنا چکا ہوں کہ ''میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے ربّ کو پہچانا۔'' آدمی ایک ارادہ کرتا ہے کہ مجھے یہ کام یوں کرنا ہے' مگر وہ اُس طور سے نہیں ہو پاتا۔ معلوم ہوا کہ کوئی بالاتر طاقت ہے جس کے ہاتھ میں کل اختیار ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ چار خطبات میں سیرت کا بیان مکمل کروں گا' مگر اپنے ارادہ کے مطابق میں ان کی تکمیل نہ کر سکا اور اب مزید پانچواں خطاب ہو رہا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ آج کسی حد تک اِس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔ اللہ مجھے اس کی توفیق دے۔ (آمین)

حضرات! چوتھے خطبے میں تصادم کے مرحلۂ اوّل صبرِ محض اور اُس کی حکمت پر بات ہو رہی تھی۔ اُسے مکمل کرنے کے بعد ہم تصادم کے تکمیلی مراحل کو بیان کریں گے۔

## تصادم کا مرحلہ اوّل : صبرِ محض

حضور اکرم ﷺ کے چچا ابوطالب اور آپؐ کی زوجہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ چنانچہ ان ظاہری سہاروں کے ہٹ جانے کی وجہ سے مخالفت کا طوفان اور زیادہ چڑھاؤ پر آ گیا۔ مشرکین قریش کی جسارتیں اس قدر بڑھ گئیں کہ وہ کھل کر آپؐ کو اذیت اور تکلیفیں پہنچانے لگے۔ آپؐ کے پیچھے لونڈوں کے غول لگا دیئے جاتے' جو شور مچاتے' حضور ﷺ نماز پڑھتے تو وہ تالیاں پیٹتے۔ راستہ چلتے ہوئے آپؐ پر غلاظت پھینک دی جاتی۔ دروازے کے سامنے کانٹے بچھائے جاتے۔ کبھی گلا گھونٹ دیا جاتا۔ کبھی دست تعدی دراز کیا جاتا۔ آپؐ پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ غلیظ گالیاں دی جاتیں۔ آپؐ کے چہرۂ انور پر خاک پھینکی جاتی۔ ابوطالب کی سپورٹ نہ رہنے کی وجہ سے کفارِ قریش نے آپؐ پر اذیت رسانی کی حد کر دی۔ آپؐ کی جان کے درپے ہو گئے' اور آپؐ کے قتل کے منصوبے بنانے لگے۔ اس صورت حال نے آپؐ کے رنج و غم میں اور اضافہ کر دیا۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ جب ابوطالب انتقال کر گئے تو قریش نے رسول اللہ ﷺ کو ایسی اذیت پہنچائی کہ

☆ سورۃ الحدید' آیت ۲۵' سورۃ الصف' آیات: ۴' ۱۴۔

ابوطالب کی زندگی میں کبھی اس کی آرزو بھی نہ کر سکے تھے۔ انہیں غم انگیز حالات کی وجہ سے یہ سال غم کے سال کے نام سے موسوم ہوا۔ الغرض جب مکہ کی کھیتی دعوتِ حق کے لیے بالکل بنجر ہو گئی' اور اسے جو کچھ فصل دینی تھی' وہ دے چکی تو آپ نے فیصلہ کیا کہ اب مکہ سے باہر نکل کر حق کا پیغام پہنچایا جائے۔

## حضور اکرم ﷺ کی اہل طائف کو دعوتِ اسلام

مکہ کی سرزمین تنگ ہوتی دیکھ کر آپ نے ۱۰ نبوی کو طائف کا سفر اختیار کیا کہ شاید وہاں کوئی امیر یا کوئی سردار ایمان لے آئے تو میں اپنا مرکز وہاں شفٹ کر دوں۔ طائف مکے سے تقریباً ساٹھ میل دور واقع ہے۔ مکہ اور طائف جڑواں شہر (twin cities) ہیں جیسے اسلام آباد اور راولپنڈی ہیں یا جیسے دریائے سندھ کے کنارے روہڑی اور سکھر کے جڑواں شہر آباد ہیں۔ طائف ایک بڑا سرسبز قطعہ اور نسبتاً ٹھنڈا مقام تھا اور قریش کا گرمیاں گزارنے کا مسکن تھا۔ وہاں ان کے باغات اور بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔ آپ اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ وہاں گئے۔ راستے میں جس قبیلے سے گزر ہوتا' آپ اسے اسلام کی دعوت دیتے' لیکن کسی نے بھی یہ دعوت قبول نہ کی۔ جب طائف پہنچے تو قبیلہ ثقیف کے تین سرداروں کے پاس تشریف لے گئے جو آپس میں بھائی تھے اور جن کے نام یہ تھے: عَبد یالیل' مسعود اور حبیب۔ ان کے والد کا نام عمر بن عمیر ثقفی تھا۔ آپ نے ان کے پاس بیٹھنے کے بعد انہیں اللہ کی اطاعت اور اسلام کی مدد کی دعوت دی۔ جواب میں ایک نے کہا: ''میں کعبے کا پردہ پھاڑوں اگر اللہ نے تمہیں رسول بنایا ہو۔'' دوسرے نے کہا: ''کیا اللہ کو تمہارے علاوہ کوئی اور نہ ملا؟'' تیسرے نے کہا: ''میں تم سے ہرگز بات نہ کروں گا۔ اگر تم واقعی پیغمبر ہو تو تمہاری بات رد کرنا میرے لیے انتہائی خطرناک ہے اور اگر تم نے اللہ پر جھوٹ گھڑ رکھا ہے تو پھر مجھے تم سے بات کرنی ہی نہیں چاہیے۔'' یہ جواب سن کر آپ وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے' اور صرف اتنا فرمایا: تم لوگوں نے جو کچھ کیا' بہرحال اسے پس پردہ ہی رکھنا۔ (۱)

**اہل طائف کی شقاوتِ قلبی:** رسول اللہ ﷺ نے طائف میں دس دن قیام فرمایا۔ اس دوران آپ ان کے ایک ایک سردار کے پاس تشریف لے گئے اور ہر ایک سے گفتگو کی۔ لیکن سب کا ایک ہی جواب تھا کہ تم ہمارے شہر سے نکل جاؤ۔ بلکہ انہوں نے اپنے اوباشوں کو شہ

---

(۱) تخریج الاحیاء' للعراقی' الراوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

دے دی۔ چنانچہ جب آپؐ نے واپسی کا قصد فرمایا تو یہ اوباش گالیاں دیتے' تالیاں پیٹتے اور شور مچاتے آپؐ کے پیچھے لگ گئے' اور دیکھتے دیکھتے اتنی بھیڑ جمع ہو گئی کہ آپؐ کے راستے کے دونوں جانب لائن لگ گئی۔ پھر گالیاں اور بدزبانیوں کے ساتھ ساتھ آپؐ پر پتھراؤ کیا۔ شدید ترین تشدد کا نشانہ بنایا' جس سے جسم اطہر لہولہان ہو گیا۔ ادھر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ڈھال بن کر چلتے ہوئے پتھروں کو روک رہے تھے' جس سے ان کے سر میں کئی جگہ چوٹ آئی۔ بدمعاشوں نے یہ سلسلہ برابر جاری رکھا' یہاں تک کہ آپؐ کو ربیعہ کے بیٹوں عُتبہ اور شَیبہ کے ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ جب آپؐ نے یہاں پناہ لی تو بھیڑ واپس چلی گئی' اور آپؐ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر انگور کی بیل کے سائے میں بیٹھ گئے۔ قدرے اطمینان ہوا تو دعا فرمائی جو ''دعائے مستضعفین'' کے نام سے مشہور ہے۔ آپؐ کے قلب کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اُس دعا کو نقل کرتے ہوئے بھی کلیجہ شق ہوتا ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ' اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَجْھَمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَ اَمْرِیْ؟ اِنْ لَمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ' اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ اِنْ لَمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ)) (۱)

''اے اللہ! کہاں جاؤں' کہاں فریاد کروں' تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں' اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کی اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے' اس کی۔ اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟ پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں' مجھے اس تشدد کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اے ربّ! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات منور ہو جاتے ہیں۔ پروردگار! اگر تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں!''

اس سے گہری کوئی فریاد ہو سکتی ہے؟ لیکن دیکھئے' حضور ﷺ کی دو نسبتیں ہیں' مقامِ عبدیت اور مقامِ رسالت۔ (وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ) یہاں وہ نسبتِ عبدیت غالب آ رہی ہے: (اِنْ لَمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ) ''پروردگارا اگر تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں!'' سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!!

(۱) الجامع الصغیر للسیوطی ح: ۱۴۸۳۔ الراوی عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب۔

ادھر آپ کو ابنائے ربیعہ نے اس حالتِ زار میں دیکھا تو ان کے جذبۂ قرابت میں حرکت پیدا ہوئی اور انہوں نے اپنے ایک عیسائی غلام کو جس کا نام عَداس تھا' بلا کر کہا کہ اس انگور سے ایک گچھا لو اور اس شخص کو دے آؤ۔ جب اس نے انگور آپ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے ''بسم اللہ'' کہہ کر ہاتھ بڑھایا اور کھانا شروع کیا۔ عَداس نے کہا' یہ جملہ تو اس علاقے کے لوگ نہیں بولتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور تمہارا دین کیا ہے؟'' اس نے کہا میں عیسائی ہوں اور نینویٰ کا باشندہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا! تم مردِ صالح یونس بن متی کی بستی کے رہنے والے ہو۔'' اُس نے کہا: آپ یونس بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ میرے بھائی تھے۔ وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔'' یہ سن کر عَداس رسول اللہ ﷺ پر جھک پڑا اور آپ کے سر اور ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا۔

یہ دیکھ کر ربیعہ کے دونوں بیٹوں نے آپس میں کہا کہ اب اس شخص نے ہمارے غلام کو بگاڑ دیا۔ اس کے بعد جب عَداس واپس گیا تو دونوں نے اس سے کہا! یہ کیا معاملہ تھا؟ اُس نے کہا' میرے آقا! رُوئے زمین پر اس شخص سے بہتر کوئی اور نہیں۔ اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جسے نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان دونوں نے کہا! دیکھو عَداس' کہیں یہ شخص تمہیں تمہارے دین سے پھیر نہ دے۔ کیونکہ تمہارا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔

قدرے ٹھہر کر رسول اللہ ﷺ باغ سے نکلے تو مکے کی راہ پر چل پڑے۔ غم والم کی شِدّت سے طبیعت نڈھال اور دل پاش پاش تھا۔ کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ ان کے ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ بھی تھا۔ اُس نے آپ سے یہ گزارش کی کہ آپ حکم دیں تو وہ اہلِ طائف کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس ڈالے۔

خصوصی پروٹیکشن حاصل ہوگئی! اہلِ طائف نے آپ کے ساتھ جس شقاوتِ قلبی اور سنگدلی کا مظاہرہ کیا' وہ بدسلوکی کی انتہا تھی۔ اسی لیے پھر اللہ کی طرف سے آپ کو سپیشل پروٹیکشن حاصل ہوگئی۔ اس سے پہلے آپ کو یہ پروٹیکشن حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل نے آپ کے گلے میں رسی ڈال دی' جس سے آپ کی آنکھیں ابھر آئیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ خانہ کعبہ میں نماز کے دوران ابوجہل کے کہنے پر عقبہ بن ابی معیط نے آپ پر اونٹ کی اوجھڑی لاکر رکھ دی۔ بھاری اوجھڑی کی وجہ سے آپ سر نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ جب آپ کے گھر میں اس کی خبر گئی تو حضرت فاطمۃ الزہرہ روتے ہوئے آئیں اور اوجھڑی کو ہٹایا۔

حیاتِ نبوی کا سخت ترین دن اور آپؐ کی شانِ رحمت: طائف کا دن آپؐ پر بہت سخت تھا۔ یہ بات آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے بھی فرمائی تھی۔ اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک روز رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا آپؐ پر کوئی ایسا دن بھی آیا ہے جو اُحد کے دن سے زیادہ سنگین رہا ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! تمہاری قوم سے مجھے جن جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا' ان میں سب سے سنگین مصیبت وہ تھی جس سے میں گھاٹی کے دن دوچار ہوا' جب میں نے اپنے آپ کو عبد یالیل بن عبدکلال کے صاحبزادے پر پیش کیا۔ مگر اس نے میری بات منظور نہ کی' تو میں غم والم سے نڈھال اپنے رُخ پر چل پڑا' اور مجھے قرن ثعالب پہنچ کر ہی افاقہ ہوا۔ وہاں میں نے سر اُٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بادل کا ایک ٹکڑا مجھ پر سایہ فگن ہے۔ میں نے بغور دیکھا تو اس میں حضرت جبریل علیہ السلام تھے۔ انہوں نے مجھے پکار کر کہا آپؐ کی قوم نے آپؐ سے جو بات کہی! اللہ نے اُسے سن لیا ہے۔ اب اس نے آپؐ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے' تاکہ آپؐ ان کے بارے میں اسے جو حکم چاہیں دیں۔ اس کے بعد پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے آواز دی' اور سلام کرنے کے بعد کہا: اے محمد (ﷺ)! بات یہی ہے۔ اب آپؐ جو چاہیں...... اگر چاہیں کہ میں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان کچل دوں...... تو ایسا ہی ہوگا...... نبی ﷺ نے فرمایا! (نہیں) بلکہ مجھے اُمید ہے کہ اللہ عزوجل ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی' اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے گی۔ (۱)

رسول اللہ ﷺ کے اس جواب میں آپؐ کی رحمۃ للعالمینی کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملک الجبال کا بھیجا جانا آپؐ کی نصرت خصوصی تھی' جس سے آپؐ کا دل مطمئن ہوگیا۔ آپؐ نے مکہ کی جانب پیش قدمی فرمائی اور جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام فرمایا۔ آپؐ یہاں چند دن قیام پذیر رہے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے پاس جنوں کی ایک جماعت بھیجی۔ اس کا ذکر قرآن حکیم میں دو مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ الاحقاف میں فرمایا:

﴿وَإِذْ صَرَفْنَآ إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا أَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ إِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا أُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ إِلَى الْحَقِّ وَإِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٣٠﴾ يٰقَوْمَنَآ أَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ ﴿٣١﴾﴾

(۱) صحیح البخاری' ح: ۳۲۳۱ ۔ راوی اُم المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا۔

''اور جب ہم نے جنوں میں سے کئی شخص تمہاری طرف متوجہ کیے کہ قرآن سنیں تو جب وہ اس کے پاس آئے تو (آپس میں) کہنے لگے کہ خاموش رہو۔ جب (پڑھنا) تمام ہوا تو اپنی برادری کے لوگوں میں واپس گئے کہ (ان کو) نصیحت کریں۔ کہنے لگے کہ اے قوم ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ جو (کتابیں) اس سے پہلے (نازل ہوئی) ہیں ان کی تصدیق کرتی ہے (اور) سچا (دین) اور سیدھا راستہ بتاتی ہیں۔ اے قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات قبول کرو۔ اور اس پر ایمان لاؤ اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں دکھ دینے والے عذاب سے پناہ میں رکھے گا۔''

سورۃ الجن میں فرمایا:

﴿قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ① يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ②﴾

''(اے پیغمبرؐ لوگوں سے) کہہ دو کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے (اس کتاب کو) سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا' جو بھلائی کا راستہ بتاتا ہے۔ سو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔''

## رسول اللہ ﷺ کی مکہ واپسی

آپؐ طائف سے مکہ واپس آنے لگے' مگر مسئلہ یہ تھا کہ مکہ میں کفار آپؐ کے قتل کے درپے تھے۔ اب جائیں تو کہاں جائیں؟ کس طرف جائیں' کدھر دیکھیں' کسے آواز دیں۔ مکہ تو جا سکتے نہیں تھے' مگر پھر بھی یہ عالم اسباب ہے۔ یہاں تدبیریں تو کرنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے اخنس بن شریق کو پیغام بھیجا کہ وہ آپؐ کو پناہ دے دے۔ مگر اخنس نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ میں حلیف ہوں اور حلیف پناہ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس کے بعد آپؐ نے سہیل بن عمرو کے پاس یہی پیغام بھیجا۔ مگر اس نے بھی یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ بنی عامر کی دی ہوئی پناہ بنو کعب پر لاگو نہیں ہوتی۔ اس کے بعد آپؐ نے مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا۔ مطعم نے کہا: ہاں' میں آپ کو پناہ دیتا ہوں اور پھر ہتھیار پہن کر اپنے بیٹوں اور قوم کے لوگوں کو بلایا اور کہا تم لوگ ہتھیار باندھ کر خانہ کعبہ کے گوشوں پہ جمع ہو جاؤ۔ کیونکہ میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دے دی ہے۔ اس کے بعد مطعم نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ

مکے کے اندر آ جائیں۔ آپؐ پیغام پانے کے بعد حضرت زیدؓ بن حارثہ کو ہمراہ لے کر مکہ تشریف لائے' اور مسجد حرام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد مطعم بن عدی نے اپنی سواری پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ قریش کے لوگو! میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دے دی ہے۔ اب اُنہیں کوئی اذیت نہ دے۔ ادھر رسول اللہ ﷺ سیدھے حجر اسود کے پاس پہنچے' اسے چوما' پھر دو رکعت نماز پڑھی' اور اپنے گھر کو پلٹ آئے۔ اس دوران مطعم بن عدی اور ان کے لڑکوں نے ہتھیار بند ہو کر آپؐ کے اردگرد حلقہ باندھے رکھا' تا آنکہ آپؐ اپنے مکان کے اندر تشریف لے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر ابوجہل نے مطعم سے پوچھا تھا کہ تم نے پناہ دی ہے یا پیروکار (مسلمان) بن گئے ہو؟ مطعم نے جواب دیا تھا کہ پناہ دی ہے۔ اس جواب کو سن کر ابوجہل نے کہا تھا کہ جسے تم نے پناہ دی اسے ہم نے بھی پناہ دی۔

رسول اللہ ﷺ نے مطعم بن عدی کے اس حسن سلوک کو کبھی فراموش نہ فرمایا۔ چنانچہ بدر میں جب کفارِ مکہ کی ایک بڑی تعداد قید ہو کر آئی اور بعض قیدیوں کی رہائی کے لیے حضرت جبیر بن مطعم آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

((لو کان المطعم بن عدی حیا ثم کلمنی فی ھؤلآءِ النتنی لترکتھم له))[1]

''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا' پھر مجھ سے ان بدبودار لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا تو میں اس کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیتا۔''

اِسی دور کا' جس میں حضور ﷺ کو پروٹیکشن حاصل ہو گئی تھی واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل اپنے حواریوں کے ساتھ خانہ کعبہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں حضور ﷺ تشریف لائے اور آپؐ نے نماز پڑھنی شروع کی۔ آپؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر دشمن اسلام آپؐ کو ایذا پہنچانے کی نیت سے آپؐ کی طرف بڑھا۔ ابھی آپؐ کے قریب نہ پہنچا تھا کہ اچانک خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور اُس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ابوجہل کے ساتھیوں نے یہ منظر دیکھا تو اُس سے کہنے لگے: ابوالحکم کیا بات ہوئی؟ کہنے لگا' مجھے میرے اور محمد (ﷺ) کے درمیان آگ کی ایک کھائی نظر آئی' جس میں ایک پروں والی مخلوق تھی۔ چنانچہ میں گھبرا کر پلٹ آیا۔ حضور ﷺ فرماتے تھے کہ اگر وہ (ملعون) آگے بڑھتا تو فرشتے اُس کی بوٹی بوٹی جدا کر دیتے۔ بہرحال یوم طائف جو آپؐ کی ذاتی پراسیکیوشن کی انتہا ہے کے بعد آپؐ کی معجزانہ انداز میں حفاظت ہوئی۔ یہ گویا اللہ کی نصرت خصوصی ہے۔ یہ نصرت کب حاصل ہوتی ہے؟ اللہ کی مدد کا قاعدہ کیا ہے؟ یہ بھی جان

(١) صحیح البخاری' ح:٤٠٢٤۔ الراوی جبیر بن مطعمؓ۔

لیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے پیغمبروں کو بھیج کر حق و باطل کا معرکہ برپا کرایا ہے۔ اُس کی سنت یہ ہے کہ باطل جب آخری حد تک پورا زور دکھا چکتا ہے اور بندگانِ خدا ایک ایک کر کے تمام مراحل استبداد سے صبر جمیل کے ساتھ گزرتے ہوئے اپنے تمام وسائل راہ خدا میں جھونک دیتے اور مقدور بھر تکالیف جھیل لیتے ہیں تو پھر نصرت الٰہی کی صبح طلوع ہو جاتی ہے۔ طائف کے تجربے کے بعد گویا حضورﷺ اس آخری امتحان سے گزر گئے۔ قانونِ الٰہی کے تحت ضروری تھا کہ اب نصرت الٰہی کے دروازے کھل جائیں' لہٰذا آپؐ کو خصوصی پروٹیکشن حاصل ہوگئی۔ اس سے پہلے آپؐ کو یہ پروٹیکشن حاصل نہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں طائف کے واقعہ کے بعد حضورﷺ کی ذاتی طور پر معجزانہ انداز میں حفاظت ہوئی۔

## اسلام کی کرنیں مدینہ منورہ میں

مطعم بن عدی کی پناہ میں آنے کے بعد آپؐ نے یہاں افراد اور قبائل کو پھر سے اسلام کی دعوت دینی شروع کی۔ اب آپؐ آزادانہ طور پر تبلیغ کرتے تھے۔ موسم حج قریب تھا۔ چنانچہ آپؐ ایام حج میں حسب معمول منیٰ تشریف لائے' تاکہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ آپؐ جمرۂ عقبہ کے پاس پہنچے تو آپؐ کو مدینہ سے آئے ہوئے قبیلہ خزرج کے کچھ لوگ نظر آئے۔ آپؐ نے اُن سے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے عرض کیا: ہم قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپؐ نے اُن کو اللہ کے دین کی دعوت دی اور قرآن مجید کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ مدینہ میں بالعموم لوگ یہودیوں کو دبا کر رکھتے تھے۔ جب باہم جھگڑا ہوتا تھا تو یہودی اُن کو دھمکی دیتے تھے کہ آخری نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔ جب وہ آئیں گے تو ہم اُن کے ساتھ مل کر تمہیں عاد و ارم کی طرح قتل کریں گے۔ چنانچہ رسول اللہﷺ کی دعوت جب خزرج کے لوگوں نے سنی تو وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے' اللہ کی قسم یوں لگتا ہے یہی وہ نبی کریم ہیں جن کے بارے میں یہودی تمہیں دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ کہیں وہ تم سے آپؐ کی پیروی میں سبقت نہ لے جائیں۔ اس لیے انہوں نے آپؐ کی دعوت قبول کر لی اور اسلام لے آئے۔ آپؐ پر ایمان لانے کے بعد یہ لوگ آپؐ سے رخصت ہو کر مدینہ چلے گئے۔

## مدینۃ النبی کا تاریخی پس منظر

اب یہاں تھوڑا سا مدینہ کا تاریخی پس منظر بھی بتا دیا جائے۔ مدینہ کا پرانا نام یثرب تھا۔ اسے بنیادی طور پر چند یہودی قبائل نے آباد کیا تھا' جو "Lost tribes of the Jews"

(بنی اسرائیل کے کھوئے ہوئے قبیلے) کہلاتے ہیں۔ پہلے پہل یہود کے تین قبیلے' بنوقینقاع' بنونضیر' بنوقریظہ یہاں آباد ہوئے۔ اُن کے یہاں آباد ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کے پاس یہ پیشین گوئی تھی کہ کھجوروں کی اس سرزمین میں آخری نبی کا ظہور ہونے والا ہے' اس لئے وہ آخری نبی پر ایمان لانے کے لیے فلسطین سے آ کر یہاں آباد ہوئے۔ پھر جوں جوں یہودیوں کی نسل پھیلتی گئی' مدینہ کے آس پاس اُن کی نئی بستیاں قائم ہوتی گئیں۔ مدینہ کی آبادی کا دوسرا عنصر انصار تھے۔ ان کا اصل وطن یمن تھا' اور یہ قحطان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس زمانے میں سیل العرم نامی خوفناک سیلاب نے تباہی مچائی اور یمن کا مشہور ڈیم سدّ مآرب ٹوٹا' اُس زمانے میں بچے کھچے لوگ ادھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ بہت سے قبائل عراق میں جا کر آباد ہو گئے۔ اُسی زمانے میں قحطان قبیلے میں سے دو بھائی اوس اور خزرج یثرب آ پہنچے اور یہود سے اجازت لے کر یہاں آباد ہو گئے۔ اس طرح یثرب پانچ قبیلوں کا شہر تھا۔ دو عرب قبائل تھے اوس اور خزرج اور تین یہودی قبائل بنوقینقاع' بنونضیر اور بنوقریظہ۔

مدینہ کے مخصوص ماحول میں یہودی اور عرب قبائل کے درمیان مناقشت چلی آتی تھی اور باہمی تعلقات میں حریفانہ جذبات کام کر رہے تھے۔ یہودی اپنی سازشوں سے جنگ وفساد کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔ وہ اتنی مہارت سے ہمسایہ قبائل میں دشمنی کے بیج بوتے اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے کہ اِن قبائل کو احساس ہی نہ ہوتا۔ اس کے بعد اِن قبائل میں جنگ مسلسل جاری رہتی اور یہ اُن کا تماشا دیکھتے۔ البتہ بھاری بھرکم سودی قرض دیتے رہتے تاکہ سرمایہ کی کمی سے لڑائی بند نہ ہو جائے۔ اوس اور خزرج میں جنگ ہوتی رہتی تھی۔ بعض لڑائیاں نسل در نسل چلتی رہتی تھیں جیسے ہمارے ہاں قتل در قتل کا لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ادھر یہودی کسی نہ کسی عرب قبیلے کے حلیف بن گئے تھے۔ پھر جب کبھی عرب اور یہودی قبائل میں جھگڑا اور جدال ہوتا' یہودی اکثر مار کھاتے تھے۔ یہ بنیے ٹائپ لوگ تھے' جیسے ہمارے ہاں بنیا کسی گاؤں کے اندر جا کر کوئی چھوٹی سی دکان کھول لیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا محل بنا ہوتا تھا اور باقی لوگوں کی زمینیں اس کے پاس رہن ہوتی تھیں۔ لیکن اگر کہیں جھگڑا ہوتا تھا' وہی مار کھاتا تھا۔ اس لیے کہ وہ لڑنے کے قابل نہیں ہوتا تھا۔ یہی معاملہ ان یہودیوں کا تھا۔ انہیں بھی اکثر مار پڑتی رہتی تھی۔ یہودیوں کو جب بھی مار پڑتی تو وہ دھمکی آمیز انداز میں کہتے تھے کہ دیکھو' آخری نبی کے ظہور کا وقت قریب ہے۔ جب وہ نبی آئے گا تو ہم اس کے ساتھ ہو کر تم سے جنگ کریں گے' پھر تم ہمیں کبھی شکست نہیں دے سکو گے۔ یہودی یہ

پیشین گوئیاں اس لئے کرتے تھے کہ ان کے پاس سرمایۂ اعتقاد تھا۔ وہ پڑھے لکھے لوگ تھے' صاحب کتاب تھے۔ ان کے پاس کتاب تورات اور شریعت تھی۔ ان میں علماء' مفتی اور قاضی تھے۔ ان کی عدالتیں تھیں۔ یہود کے برعکس اوس اور خزرج اجڈ اور گنوار لوگ تھے۔ ان کے پاس کوئی کتاب تھی' نہ تعلیم۔ لہٰذا ان پر یہودیوں کا ایک رعب تھا۔ یہود کی آخری نبی کی پیشین گوئی نے اوس وخزرج قبائل کو بھی آخری پیغمبر موعود کا منتظر بنا دیا تھا۔ اوس اور خزرج یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اگر آپس میں لڑتے مرتے رہے' تو ختم ہو جائیں گے۔ لہٰذا کوئی ثالث (orbitrator) ہونا چاہیے' جو ہمارے معاملات کو کنٹرول کرے' لہٰذا طے کرلیا گیا تھا کہ خزرج جو بڑا قبیلہ تھا' اس کے سردار عبداللہ بن ابی کو بادشاہ بنالو۔ اس کے لئے ایک سونے کا تاج تیار کرلیا گیا تھا۔ تاج پوشی کی نوبت ابھی نہیں آئی کہ حضور ﷺ یثرب تشریف لے گئے' یعنی بے تاج بادشاہ بن کر وہاں آ گئے۔ اِس اجمال سے معلوم ہوا کہ مدینہ کی فضا آپ کی یثرب آمد کے لئے پہلے سے ہموار تھی۔

<u>بیعت عقبہ اولیٰ</u>: جمرۂ عقبہ میں اسلام قبول کرنے والے لوگوں نے مدینہ واپس آ کر اپنی قوم کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا تذکرہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ سال ۱۱ نبوی کے موسم حج میں انصار کے بارہ آدمی جمرۂ عقبہ کے پاس آپ سے ملے اور آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ یہ پہلی بیعت تھی۔ اِسے بیعت عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے۔ اِس میں آپ نے اِن لوگوں سے شرک' چوری' زنا' بچوں کے قتل' جھوٹے الزام اور اپنی اطاعت کی بیعت لی۔ اِس پہلی بیعت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اِن اسلام لانے والوں کی درخواست پر اُن کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا' تا کہ وہ اہل مدینہ کو قرآن سکھائیں۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام کیا۔ اُن کی تبلیغی مساعی اور بہترین اندازِ تعلیم سے اسلام کا نور پھیلنے لگا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو اپنے قبیلے کے سردار تھے' مسلمان ہو گئے' پھر اور لوگ بھی اسلام قبول کرتے گئے۔

<u>بیعت عقبہ ثانیہ</u>: اگلے سال ۱۲ نبوی کے موسم حج میں مدینہ سے ستر افراد آئے اور آپ سے عقبہ کی گھاٹی میں ملاقات کا پروگرام طے کیا۔ اِن لوگوں نے آپ کو بایں الفاظ مدینہ تشریف آوری کی دعوت دی: یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ سے کن شرائط پر آپ کی مدینہ تشریف آوری کا معاہدہ کریں۔ آپ نے فرمایا: یہ معاہدہ اس بات پر ہوگا کہ تم ہر پسند و ناپسند میں میری اطاعت پر کاربند ہو گے۔ نیکی کا حکم دو گے' برائی سے روکو گے' اللہ کی بات کرو گے' اللہ کے مقابلے میں

کسی ملامت گر کی ملامت کی پروانہ کرو گے اور جب میں تمہارے ہاں آ جاؤں تم میری مدد کرو گے اور اپنے جان و مال اور بیوی بچوں کی طرح میری حفاظت کرو گے۔ اس کے نتیجے میں تمہیں جنت ملے گی۔ اِس پر سب انصار اُٹھے اور آپؐ کی بیعت کر لی۔ اس بیعت کے حوالے سے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ملاحظہ کیجیے جو بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں:

(بَایَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَ الْيُسْرِ وَ الْمَنْشَطِ وَ الْمَكْرَهِ، وَ عَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَ عَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَه، وَ عَلٰى اَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ) (۱)

''ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی کہ ہم (آپؐ کا) حکم سنیں گے اور مانیں گے، خواہ مشکل ہو خواہ آسان، خواہ ہماری طبیعت کو خوش گوار لگے خواہ ناگوار ہو، خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے۔ اور جس کو بھی ہم پر امیر بنا دیا جائے گا ہم اس سے جھگڑیں گے نہیں، اور ہم حق بات کہتے رہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں اور اللہ کے معاملہ میں (حق کہنے سے) کسی ملامت گر کی ملامت سے ہرگز نہیں ڈریں گے۔''

بیعت کر لینے کے بعد حاضرین میں سے حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے آپؐ کا دست مبارک پکڑا اور عرض کی، قسم ہے اُس ذات کی، جس نے آپؐ کو نبیٔ برحق بنا کر بھیجا، ہم اپنی ذات سے بڑھ کر آپؐ کی حفاظت کریں گے۔ اللہ کی قسم ہم نسل در نسل جنگجو لوگ رہے ہیں اور اسلحہ کا استعمال خوب جانتے ہیں۔ اس کے بعد انصار نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے ساتھ آپؐ کو غلبہ نصیب ہو جائے تو کہیں آپؐ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کے پاس واپس نہ آ جائیں۔ اِس پر آپؐ نے فرمایا: ''ہرگز نہیں، اب تو زندگی اور موت تمہارے ساتھ ہے۔ میں اور تم ایک ہوں گے، جس سے تمہاری جنگ ہوگی اس سے میری بھی جنگ ہوگی اور جس سے تمہاری صلح ہوگی اس سے میری صلح ہوگی۔''

عقبہ میں ہونے والی پہلی اور دوسری بیعت کے الفاظ مختلف ہیں۔ پہلی بیعت دراصل توحید اور اخلاقی تعلیمات کے حوالے سے تھی کہ ہم شرک نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، چوری نہیں کریں گے وغیرہ۔ دوسری بیعت اسلامی نظم جماعت کی بنیاد ہے۔ اس کی بنیاد پر مسلمانوں کا نظم قائم ہوتا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء۔

## رسول اللہ ﷺ کی مدینہ ہجرت

۱۴ نبوی میں آپؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ اس سے پہلے آپؐ نے ایک متبادل مرکز کی حیثیت سے طائف کا انتخاب کیا تھا لیکن طائف والوں کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت اور خوش بختی یثرب کے لیے رکھی تھی۔ چنانچہ اہل یثرب چل کر آپؐ کے پاس گئے اور آپؐ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دے آئے بلکہ اس کی منظوری لے آئے۔ اب حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُس گھڑی کی اجازت ملنے کا انتظار تھا جس گھڑی ہجرت کرنا تھی۔ یہ گھڑی اُس وقت آئی جب مشرکین نے اسلامی دعوت کا چراغ گل کرنے کے لیے آپؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ جب مشرکین نے دیکھا کہ یثرب میں اسلامی دعوت جڑ پکڑنے لگی ہے اور یہ ہمارے لیے نہایت خطرناک ہوگی تو انہوں نے مکہ کی پارلیمنٹ دارالندوہ میں تاریخ کا سب سے خطرناک اجتماع منعقد کیا' جس میں قریش کے تمام قبائل کے نمائندوں نے شرکت کی۔ موضوع بحث یہ تھا کہ (نعوذ باللہ) اسلامی دعوت کے علمبردار محمد رسول اللہ ﷺ کا قصہ بہ عملیت تمام پاک کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں مختلف تجاویز پیش کی گئیں' مگر پارلیمنٹ نے رد کر دیں۔ بالآخر ابوجہل نے ایک انتہائی مجرمانہ تجویز پیش کی' جس سے تمام ممبران نے اتفاق کیا۔ اُس نے کہا: اس شخص کے بارے میں میری ایک رائے ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب تک تم لوگ اس پر نہیں پہنچے۔ لوگوں نے کہا: ابوالحکم وہ کیا ہے؟ ابوجہل نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ ہم ہر ہر قبیلے سے ایک مضبوط' صاحبِ نسب اور بانکا جوان منتخب کر لیں۔ پھر ہر ایک کو ایک تیز تلوار دیں۔ اس کے بعد سب کے سب اس شخص کا رُخ کریں اور اس طرح یکبارگی تلوار مار کر قتل کر دیں' جیسے ایک ہی آدمی نے تلوار ماری ہو۔ یوں ہمیں اس شخص سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اور اس طرح قتل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شخص کا خون سارے قبائل میں بکھر جائے گا' اور بنو عبد مناف سارے قبیلوں سے جنگ نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا دیت (خون بہا) لینے پر راضی ہو جائیں گے۔ اور ہم دیت ادا کریں گے۔ شیخ نجدی نے کہا: بات یہ رہی جو اس جوان نے کہی۔ اگر کوئی تجویز اور رائے ہو سکتی ہے تو یہی ہے۔ باقی ہیچ ہے۔ اس کے بعد پارلیمان مکہ نے اس مجرمانہ قرارداد پر اتفاق کر لیا' اور ممبران اس عزم مصمم کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس گئے کہ اس قرارداد کی فوری تنفیذ کرنی ہے۔

جب نبی ﷺ کے قتل کی مجرمانہ قرارداد طے ہو چکی تو حضرت جبریل علیہ السلام اپنے

رب تبارک وتعالیٰ کی وحی لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آپؐ کو قریش کی سازش سے آگاہ کرتے ہوئے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہاں سے روانگی کی اجازت دے دی ہے۔ جوں ہی اجازت آئی' حضور ﷺ عازم ہجرت ہوئے اور سوئے یثرب کوچ فرمایا۔

# تصادم کا مرحلہ ثانی: اقدام

مدینہ میں آپؐ کی حیات دنیوی کا ایک نیا ورق شروع ہوتا ہے۔ یہاں اسلامی تحریک تصادم کے مرحلہ اول صبر محض سے نکل کر راست اقدام اور مسلح تصادم کے مراحل میں داخل ہوگئی۔ اقدام تصادم کا دوسرا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں قدم رکھنے کا فیصلہ نہایت نازک ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے معاملے میں اس مرحلے میں داخل ہونے کا فیصلہ اللہ کی طرف سے تھا۔ لہٰذا غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ لیکن آئندہ جو بھی تحریک ہوگی اس کی قیادت یہ فیصلہ کرے گی اور اس میں غلطی کا امکان موجود رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ غلطی کی صورت میں بھی دنیا میں ناکامی کے باوجود آخرت کی کامیابی یقینی ہے۔

**ابتدائی اقدامات:** اگرچہ آپؐ نے ہجرت کے بعد اقدام (active resistance) کا فیصلہ کیا۔ لیکن چھ مہینے میں آپؐ نے اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کی خاطر تین کام کئے۔ اولاً مسجد نبویؐ تعمیر فرمائی' جو عبادت گاہ بھی تھی' خانقاہ اور درس گاہ بھی تھی' پارلیمنٹ اور مشاورت کی جگہ بھی تھی۔ یہی گورنمنٹ ہاؤس کا مقام بھی رکھتی تھی۔ یہیں پر وفود بھی آرہے تھے۔ گویا مسلمانوں کا ایک مرکز وجود میں آ گیا۔

دوسرے آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے مابین ''مواخات'' قائم فرمادی اور ہر مہاجر کو کسی ایک انصاری کا بھائی قرار دے دیا۔ چنانچہ انصارِ مدینہ نے اپنے ان مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں اور دکانوں میں سے حصے دیئے اور اپنے ذرائع معاش میں ان کو شریک کیا۔ اس مواخات میں ایسی ایسی مثالیں بھی سامنے آئیں کہ انصاری بھائیوں نے اپنے مکانوں اور دکانوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر کے انہیں نصف نصف تقسیم کر کے مہاجر بھائیوں کو دے دیا۔ یہاں تک کہ ایک انصاری کی دو بیویاں تھیں۔ اُس وقت پردے کے احکام ابھی نہیں آئے تھے' وہ تو کہیں پانچ چھ سال بعد آئے۔ وہ انصاری اپنے مہاجر بھائی کو اپنے گھر لے گئے' اور کہا کہ یہ میری دو بیویاں ہیں' ان میں سے جو تمہیں پسند ہو اشارہ کرو' میں اسے طلاق دے

دوں گا' تم اس سے شادی کر لینا۔ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں میرا بھائی قرار دیا ہے اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ تمہارا گھر آباد نہ ہو اور میرے گھر میں دو دو بیویاں ہوں۔ یہ مواخات کا وہ عظیم درس تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

رسول اللہ ﷺ نے تیسرا اہم کام یہ کیا کہ مدینہ میں آباد یہودی قبائل کے ساتھ مشترکہ دفاع کے معاہدے کر لئے۔ آپؐ کے اس اقدام کی منٹگمری واٹ اور ٹائن بی نے بہت زیادہ تعریف کی ہے اور اسے آپؐ کے حسن تدبر اور statesmanship کا عظیم مظہر قرار دیا ہے۔ مدینہ میں آباد یہودی قبائل بنوقینقاع' بنونضیر اور بنوقریظہ بڑی strategic پوزیشن میں تھے۔ مدینے کے باہر ان کی گڑھیاں اور قلعے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ''میثاقِ مدینہ'' کے نام سے ان تینوں قبائل سے مشترکہ دفاع کا معاہدہ کر لیا۔ آج بعض لوگ احمقانہ طور پر میثاقِ مدینہ کو اسلامی ریاست کے دستور کا نام دیتے ہیں' حالانکہ یہ مشترکہ دفاع کا ایک معاہدہ (joint defence pact) تھا کہ اگر مدینے پر حملہ ہوا تو مسلمان اور یہودی مل کر حملہ آور کا مقابلہ کریں گے۔ اس معاہدے سے رسول اللہ ﷺ کی پوزیشن بہت مضبوط ہو گئی۔

## چھاپہ مار مہمات اور ان کے مقاصد

مدینہ میں اپنی پوزیشن مستحکم بنانے کے بعد آپؐ نے active resistance کے طور پر چھوٹے چھوٹے چھاپہ مار قسم کے گروپ بھیجنے شروع کر دیئے۔ غزوۂ بدر سے پہلے پہلے آپؐ نے ایسی آٹھ مہمات روانہ کیں' جن میں سے چار میں حضور ﷺ خود بھی شریک ہوئے اور چار میں آپؐ شریک نہیں ہوئے۔ لہٰذا ان میں سے چار غزوات اور چار سرایا کہلاتی ہیں۔ اس عرصے میں مکہ والوں کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ یعنی اب جو initiative لیا گیا وہ حضور ﷺ کی طرف سے لیا گیا۔ افسوس کہ اس بات کو چھپانے کے لئے ہمارے ہاں سیرتِ نبویؐ میں تحریف کی گئی ہے۔ اس لئے کہ جس طرح آج کل مغربی میڈیا پروپیگنڈا کرتا ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے' اسلام تو خونی مذہب ہے' اسلام دہشت گردی کا درس دیتا ہے' اسی طرح جب یورپ کی استعماری طاقتیں عالم اسلام پر قابض ہوئیں تو مستشرقین نے اسلام کے خلاف اسی طرح کا زہریلا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس پر ہمارے مصنفین نے معذرت خواہانہ (apologetic) انداز اختیار کیا کہ نہیں نہیں' حضور ﷺ نے کوئی جنگ خود شروع نہیں کی تھی' یہ تو حضور ﷺ نے اپنے دفاع میں جنگیں کی تھیں۔ حالانکہ یہ بات سو فیصد جھوٹ ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ باطل مشرکانہ نظام کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مکہ کے پرسکون تالاب میں ہلچل حضور ﷺ نے پیدا کی تھی ۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؑ
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

ورنہ وہاں کے لوگ سب کے سب اپنی قسمت پر صابر و شاکر رہ رہے تھے۔ اسی طرح ہجرت کے بعد مکہ والوں کے خلاف راست اقدام (active resistance) اور بالآخر مسلح تصادم (armed conflict) کا آغاز بھی محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

اب یہاں فلسفۂ انقلاب اور فلسفۂ سیرت کے حوالے سے ایک نقطہ پر غور کیجیے۔ آپؐ نے یہ آٹھ مہمات کیوں بھیجیں؟ غرض و غایت کیا تھی؟ آپؐ کے پیش نظر کیا مقصد تھا؟ نبی اکرم ﷺ نے جو مہمات بھیجیں اور مکہ کے خلاف جو اقدام کیا اس کے دو مقاصد دکھائی دیتے ہیں۔ آپؐ کا پہلا مقصد مکہ کی معاشی ناکہ بندی (economic blockade) تھا۔ اہل مکہ اور قریش کی معاشی زندگی کا دارومدار تجارت پر تھا۔ مکہ کا اپنا حال بالفاظ قرآن "بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ" تھا۔ وہاں کسی نوع کی پیداوار نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو کھانے پینے کی چیزوں کے لیے باہر کی منڈیوں کے محتاج تھے۔ وہاں ایک دانہ تک نہیں اُگتا تھا۔ البتہ ان کے ہاں بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے' جن کا دودھ اور گوشت انہیں حاصل تھا۔ لہٰذا ان کی معیشت کا سارا دارومدار تجارت پر تھا' اور اُس دور کے مشرقی اور مغربی ملکوں کے مابین تجارت میں قریش کو ایک اہم کڑی اور واسطہ (link) کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ مشرق و مغرب کی تجارت حضور ﷺ کی بعثت کے دور میں عرب کے راستہ سے ہوتی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ ہندوستان' انڈونیشیا' ملائیشیا اور دوسرے مشرقی ممالک کا سارا سامانِ تجارت بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے یمن کے ساحل تک پہنچتا تھا۔ اُدھر مغرب کے ممالک یعنی یونان' اٹلی اور بلقان کی ریاستوں کا سارا سامانِ تجارت شام کے ساحلوں پر اتر جاتا تھا۔ اس طرح یورپ کے ممالک کا سامانِ تجارت بحیرۂ روم سے ہوکر اِدھر پہنچتا تھا اور اِدھر بحیرۂ عرب اور بحیرۂ ہند سے ہوکر مشرقی ممالک و جزائر کا سامان تجارت یمن پہنچ جاتا تھا' اب اُن کے مابین کاروبار کی جو ساری نقل و حرکت (transfer and transport) تھی وہ صرف قریش کے ہاتھ میں تھی' جس کا قرآن مجید میں سورۃ القریش میں بڑے اہتمام سے ذکر فرمایا گیا ہے: ﴿لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ① اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ②﴾ —— ان کے قافلے سردیوں میں یمن کی طرف جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال

یعنی شام کے ساحلوں کی طرف سفر کرتے تھے۔ ایک بڑا تجارتی سفر سردیوں میں اور ایک بڑا تجارتی سفر گرمیوں میں ان کے معمولات میں شامل تھا اور انہیں ان دونوں اَسفار میں مکمل امن حاصل رہتا تھا۔ جبکہ عرب کے دوسرے قبائل کو یہ امن میسر نہ تھا' بلکہ ان کے قافلے اکثر لوٹ لیے جاتے تھے' کیونکہ عرب کے اکثر قبائل کا پیشہ ہی لوٹ مار' رہزنی اور غارت گری تھا۔ تو کسی اور قبیلہ کا قافلہ شاذ ہی لوٹ مار سے بچ کر نکلتا تھا' سوائے قریش کے۔ ان کے قافلہ کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ قریش کعبہ کے متولّی تھے' جسے تمام عرب اللہ کا گھر تسلیم کرتے تھے۔ ظاہر ہے کعبہ میں رکھے تین سو ساٹھ بُت سارے کے سارے قریش کے تو نہیں تھے بلکہ صورت یہ تھی کہ تمام عرب قبائل کے ''خدا'' قریش کے پاس بطور ''یرغمالی'' رکھے ہوئے تھے۔ اگر ان کے قافلہ پر کوئی قبیلہ ہاتھ ڈالے تو قریش اس قبیلہ کے ''خدا'' کی گردن مروڑ سکتے تھے۔ یہ وہ اصل سبب تھا کہ قریش کے قافلوں کو تحفظ حاصل تھا۔ ان کے قافلوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ لیکن اب حضور ﷺ نے ان پر ہاتھ ڈالنا شروع کیا۔ اور آپؐ نے اب ایک قوت ہونے کے اعتبار سے اپنی موجودگی ثابت فرمادی۔ حضور ﷺ نے درحقیقت قریش کی رگِ جان (lifeline) پر ہاتھ ڈالا اور ان کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنادیا۔ اس طرح ان کی معاش کے لیے ایک خطرہ پیدا فرمادیا۔

قریش کی معاشی ناکہ بندی کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کا دوسرا مقصد قریش کی سیاسی ناکہ بندی (isolation or political containment) تھا۔ قریش کے اِس علاقے میں آباد دوسرے قبائل سے معاہدے تھے اور وہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ حضور ﷺ نے اس علاقے میں متعدد سفر کیے' جن میں اپنی قوت کا مظاہرہ بھی فرمایا اور دعوت و تبلیغ کا کام بھی کیا۔ دونوں کام ساتھ ساتھ ہو رہے تھے۔ بقول اقبال ؏ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد —— تو تبلیغ و دعوت کے ساتھ طاقت بھی شامل ہو جائے تو گویا سونے پر سہاگہ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں ہجرت کا ذکر آ رہا ہے' وہاں حضور ﷺ کو یہ دعا تلقین کی گئی تھی: ﴿وَقُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا۝﴾ ''اے اللہ! جہاں تو مجھے داخل کرنے والا ہے' وہاں میرا داخلہ سچائی کے ساتھ کرا اور جہاں سے مجھے نکالنا چاہتا ہے راست بازی کے ساتھ نکال' اور اپنے خاص خزانۂ فضل سے قوت و طاقت کے ساتھ میری مدد فرما۔'' یہ ہے وہ قوت اور طاقت جو حضور ﷺ کو مدینہ میں تشریف لانے کے بعد حاصل ہو گئی تھی —— تو اب حضور ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ نکلتے تھے۔ کسی قبیلہ میں جا کر

آپؐ نے دس بیس دن قیام فرمایا' ان کے ساتھ معاہدے کئے' اول تو ان کو اپنا حلیف بنالیا ورنہ کم از کم انہیں غیر جانب دار ضرور بنالیا کہ اگر تمہارا قریش کے ساتھ معاہدہ ہے تو ہمارے ساتھ بھی کرو' ہمارے خلاف ان کی مدد نہ کرو اور ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرو' بالکل غیر جانب دار ہو جاؤ۔ یہ ہیں حضور ﷺ کے وہ اقدامات جن کو جدید اصطلاحات کے حوالے سے قریش کی معاشی اور سیاسی ناکہ بندی کہا جا سکتا ہے۔

## کفر و اسلام کا پہلا معرکہ: غزوۂ بدر

ہر قوم میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں انہیں عقابی مزاج کے لوگ (Hawks) اور فاختائی مزاج کے لوگ (Doves) کہا جاتا ہے۔ مکہ میں بھی ہر دو طرح کے لوگ موجود تھے۔ جوشیلے اور مشتعل مزاج لوگوں میں ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط بہت نمایاں تھے' جبکہ ٹھنڈے مزاج اور بردبار طبیعت کے حامل لوگوں میں عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام نمایاں تھے۔ اول الذکر لوگوں کا کہنا تھا کہ چلو اب مدینے پر حملہ کرو اور محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کا قلع قمع کر دو۔ جبکہ مؤخر الذکر اس طرح کے اقدام کے حق میں نہیں تھے۔ عتبہ بن ربیعہ بہت زیرک انسان تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد قریش سے کہا تھا کہ دیکھو محمدؐ اور اس کے ساتھی یہاں سے چلے گئے' اب مدینہ جا کر بھی محمد (ﷺ) آرام سے تو نہیں بیٹھے گا بلکہ اپنے دین کی تبلیغ کرے گا۔ اس سے عرب اس کے خلاف ہوں گے اور بقیہ عربوں سے اس کی کشمکش ہوگی۔ تو اگر باقی عرب کو محمد (ﷺ) نے فتح کر لیا تو ہمارا کیا نقصان ہے۔ وہ ہمارا قرشی بھائی ہے۔ اس کی جیت ہماری جیت ہے۔ اس کی فتح سے عرب پر ہماری حکومت قائم ہو جائے گی' اور اگر عربوں نے محمد (ﷺ) کو ہلاک کر دیا تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا بغیر اس کے کہ تم اپنے بھائیوں کے خون سے اپنی تلواریں آلودہ کرو۔ آخر ابوبکر کون ہے؟ ہمارا بھائی نہیں ہے کیا؟ عمر کون ہے؟ اور یہ عثمان کون ہے؟ بنوامیہ میں سے ہے۔ حمزہ کون ہے؟ عبدالمطلب کا بیٹا ہے۔ اور محمد (ﷺ) کون ہے؟ عبدالمطلب کا پوتا ہے۔ تم اپنی تلواروں سے ان کی گردنیں اڑاؤ گے؟ تم محمد (ﷺ) کو اور عربوں کو آپس میں نمٹنے دو۔ اگر محمد (ﷺ) جیت گیا تو ہمارا راج پورے عرب پر ہو جائے۔ یہ وہ بات تھی جو فی الحقیقت ہو کر رہی۔ خلافت راشدہ کے بعد دورِ ملوکیت میں پھر وہی عرب تھے جن کی حکومتیں قائم ہوئیں' چاہے بنواُمیہ تھے' چاہے بنوعباس تھے۔ اس قدر گہری بات اُس شخص نے کہی جس نے اہل مکہ کو متاثر بھی کیا۔

جنگ کے فوری دو اسباب: ان فاختائی مزاج لوگوں (Doves) کا مکہ میں خاصا اثر و رسوخ تھا' لیکن دو واقعات ایسے وقوع پذیر ہو گئے کہ جنگجو اور مشتعل مزاج لوگوں (Hawks) کا پلڑا بھاری ہو گیا اور یہ Doves بالکل خاموش ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ ابوسفیان کا وہ قافلہ جس کا حضور ﷺ نے پیچھا کیا تھا اور وہ بچ کر نکل گیا تھا' اب مالِ تجارت سے لدا پھندا شام سے واپس آ رہا تھا۔ ابوسفیان نے قریش کو SOS کال بھیج دی کہ مجھے خطرہ ہے کہ محمد (ﷺ) کے آدمی قافلے پر حملہ کریں گے اور ہمیں لوٹ لیں گے' لہٰذا فوری طور پر مدد بھیجی جائے۔ ابوسفیان کا پیغام لے کر ایک آدمی چیختا چلاتا ہوا مکہ پہنچا کہ تمہارا قبیلہ' تمہارا خاندان اور تمہارا مال خطرے میں ہے' لہٰذا فوراً مدد کو پہنچو۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ حضور ﷺ نے بارہ افراد کا ایک چھوٹا سا دستہ نخلہ بھیجا تھا جو طائف اور مکہ کے درمیان ایک مقام ہے اور انہیں ہدایت کی تھی کہ وہاں قیام کرو اور ہمیں وہاں سے مکہ کے لوگوں کی نقل و حرکت سے مطلع کرتے رہو۔ وہاں ایسی صورت حال پیش آئی کہ مکہ والوں کے ایک قافلے کے ساتھ ان کی مڈبھیڑ ہو گئی' جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک مارا گیا' دو کو وہ گرفتار کر کے لے آئے اور ایک بھاگ گیا۔ مسلمان کئی اونٹوں پر لدا ہوا مال بطور غنیمت لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس پر حضور ﷺ ناراض ہوئے کہ میں نے تمہیں جنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ لیکن اب جو ہونا تھا' ہو چکا تھا۔ جو مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں بچ کر بھاگا تھا وہ کپڑے پھاڑ کر چیختا چلاتا ہوا مکہ پہنچا کہ لوگو دیکھو محمد (ﷺ) کے آدمیوں نے ہمارا آدمی مار دیا۔ یہ دو خبریں بیک وقت مکہ پہنچیں' ایک شمال سے اور دوسری جنوب سے۔

لشکر کفار کی روانگی: یہ دو اسباب تھے جن کی وجہ سے مکہ میں مسلمانوں کے خلاف طبل جنگ بجا دیا گیا۔ ایک عام چیخ و پکار شروع ہو گئی کہ قتل کا بدلہ قتل' خون کا بدلہ خون۔ مکہ میں جو آگ لگی ہوئی تھی' اُس کا اندازہ اُس وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ کسی قبائلی معاشرے میں یہ معاملہ کس قدر جذباتی اور اہم ہوتا ہے۔ ان دونوں باتوں کی بنا پر مکہ میں وہ لوگ جو جنگجو' مشتعل مزاج اور جوشیلے تھے' وہ قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ اُن کے ہاتھ ایک دلیل آ گئی تھی۔ مکہ کے ٹھنڈے مزاج' بردبار طبیعت کے حامل اور شریف النفس لوگ نہیں چاہتے تھے کہ خانہ جنگی ہو۔ ان میں نمایاں شخصیتیں عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام کی تھیں۔ آخر الذکر بعد میں ایمان لے آئے۔ ابوجہل جو Hawks کا سرخیل تھا' چاہتا تھا کہ فوری اقدام کیا جائے۔ عمر بن عبداللہ الحضرمی کے قتل سے جوشیلے اور جنگ پسند لوگوں کو تقویت حاصل ہو گئی کہ ہمارا آدمی مارا گیا ہے اور

دوسری طرف ہمارے تجارتی قافلے کو شدید خطرہ درپیش ہے۔ لہٰذا ان بہانوں سے ایک ہزار جنگجوؤں کا کیل کانٹے سے لیس لشکر ایک ہزار اونٹوں اور سو گھوڑوں کے ساتھ مکہ سے مدینہ روانہ ہوا' جس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر ہوا۔

ابوسفیان کی عدم موجودگی میں قریش کی سرداری عتبہ بن ربیعہ کے پاس تھی۔ لہٰذا اس لشکر کا سپہ سالار بھی وہی تھا۔ ابوجہل امیہ بن خلف' نضر بن حارث' عقبہ بن ابی معیط' شیبہ بن عتبہ اور بہت سے وہ لوگ جو اہل حق کے خون کے پیاسے تھے' سب کے سب نکلے۔ سردارانِ قریش میں سوائے ابولہب کے کوئی پیچھے نہ رہا۔ وہ بزدل انسان تھا۔ اُس نے اپنی جگہ ایک کرائے کا فوجی بھیج دیا۔ ابوجہل نے کہہ دیا تھا کہ یہ یوم الفرقان ہوگا اور ثابت ہوجائے گا کہ حق کس کے ساتھ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا صحابہؓ سے مشورہ: صحیح اور معتبر روایات کے مطابق مدینہ میں حضور ﷺ نے کسی جنگ کا اعلان کیا' نہ تیاری فرمائی بلکہ پیشِ نظر صرف یہ تھا کہ جو قافلہ آرہا ہے اسے روکنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ بغیر کسی خاص اہتمام اور تیاری کے نکل کھڑے ہوئے۔ یاد رہے کہ غزوۂ ذوالعشیرہ میں شامل ڈیڑھ سو افراد تمام مہاجرین ہی تھے' جبکہ غزوۂ بدر میں صرف ساٹھ یا تراسی مہاجرین ساتھ تھے۔ تعداد کے متعلق دونوں روایات موجود ہیں۔ اگر حضور ﷺ کے پیش نظر جنگ کا پروگرام ہوتا تو آپؐ خصوصی انتظام فرماتے اور تعداد زیادہ ہوتی۔ پھر یہ پہلی بار ہوا کہ انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ساتھ نکلے' بلکہ تعداد میں وہ زیادہ تھے۔ حضور ﷺ نے مدینہ میں بھی مشورہ کیا تھا اور پھر مدینہ کے باہر بھی ایک مجلس مشاورت منعقد فرمائی' لیکن مدینہ کی مشاورت میں جنگ کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا' لہٰذا آپؐ نے کسی سے تاکیداً نہیں فرمایا کہ ساتھ چلو۔ انصارؓ بھی خود اپنی مرضی سے ساتھ ہو گئے تھے۔ حضور ﷺ کی طرف سے کوئی خصوصی ترغیب نہیں تھی۔

آپؐ جب مدینہ سے کچھ دور پہنچے تو آپؐ کو معلوم ہوا کہ مکہ سے ایک ہزار افراد پر مشتمل کیل کانٹے سے لیس لشکر مدینہ کی طرف نکل پڑا ہے اور منزل پر منزل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اب صورت یہ ہوگئی کہ شام کی طرف سے قافلہ آرہا ہے اور جنوب سے لشکر چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اب یہاں مدینہ سے باہر مشاورت ہوئی جو اہم ترین مشاورت ہے۔ قرآن مجید ایسے معاملات کو عموماً اختصار سے بیان کرتا ہے' لہٰذا سورۃ الانفال کی آیات کے بین السطور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حضور ﷺ نے ازراہِ مشورہ ہی یہ بات پیش کی ہوگی کہ مسلمانو! ایک قافلہ شمال سے آرہا ہے جس کے ساتھ صرف تیس یا پچاس محافظ ہیں' مال تجارت بہت ہے' اور ایک لشکر جنوب سے آرہا ہے جو کیل کانٹے سے لیس ہے' اور اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک پر فتح کا

وعدہ کرلیا ہے' بتاؤ کدھر چلیں؟ ان حالات میں کچھ لوگوں نے اپنی مخلصانہ سوچ کے مطابق تجویز کیا کہ حضورﷺ قافلہ کی طرف چلیے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ تجویز پیش کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ قافلہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پچاس کی نفری ہے' وہ آسانی سے قابو میں آجائیں گے' ساز وسامانِ تجارت بھی بہت ہاتھ لگے گا اور اسلحہ بھی' جو آئندہ جنگ میں کام آئے گا۔ لیکن حضورﷺ جیسے کچھ منتظر سے تھے۔ تب لوگوں نے اندازہ کیا کہ منشائے مبارک کچھ اور ہے' حضورﷺ کا اپنا رجحان طبع کچھ اور ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر مہاجرین نے تقریریں شروع کیں کہ حضورﷺ! آپؐ ہم سے کیا پوچھتے ہیں' جو آپؐ کا ارادہ ہو' بسم اللہ کیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے تقریر کی' لیکن حضورﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے بھی تقریر کی' لیکن حضورﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے حضورﷺ کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔ حضرت مقداد بن اسودؓ بھی مہاجرین میں سے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہوکر یہ الفاظ کہے کہ ''حضورﷺ جو آپؐ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجئے' ہمیں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجیے جنہوں نے اپنے نبی (موسیٰ علیہ السلام) سے یہ کہہ دیا تھا کہ ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝﴾ (پس آپ اور آپ کا رب دونوں جائیں اور جنگ کریں' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں) آپؐ بسم اللہ کیجئے' ہم آپؐ کے ساتھ لڑیں گے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہمارے ذریعہ آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔'' لیکن حضورﷺ پھر بھی کچھ انتظار کی کیفیت میں تھے۔ اب حضرت سعد بن معاذؓ کو خیال آیا کہ رسول اللہﷺ کا روئے سخن دراصل انصار کی جانب ہے۔ انہوں نے کھڑے ہوکر تقریر کی کہ ''حضورﷺ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے......'' اس خیال کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ حضورﷺ نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر مدینہ (یثرب) تشریف لانے کی جو دعوت قبول کی تھی اس میں یہ طے ہوا تھا کہ ''اگر قریش مدینہ پر حملہ کریں گے تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں''۔ گویا انصار اس معاہدہ کی رُو سے اس کے پابند نہیں تھے کہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کریں۔ قافلہ کا راستہ روکنا اور بات ہے اور باقاعدہ ایک لشکر جرار سے جاٹکرانا یہ بالکل دوسری بات ہے۔ حضرت سعد بن معاذؓ کو فوراً خیال آ گیا کہ ہو نہ ہو حضورﷺ ہماری تائید کے منتظر ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر انہوں نے اپنی تقریر میں کہا: ''اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ'' یعنی ''حضورﷺ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے۔'' ہم نے آپؐ کو اللہ کا رسول مانا ہے۔ (اُس وقت معاہدے میں

کیا طے ہوا تھا' کیا نہیں ہوا تھا اِس وقت وہ بات غیر متعلق ہے) آپ جو بھی حکم دیں گے سرآنکھوں پر' سِرْبِنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ...... ''اے اللہ کے رسول (ﷺ) لے چلیے ہم کو جہاں بھی لے جانا ہو۔ خدا کی قسم اگر آپؐ ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم برک الغماد (یمن) تک جا پہنچیں گے اور اس کے لیے ہم اپنی سواریوں کو دبلا کر دیں گے۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک کِھل اُٹھا۔(۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس جماعت میں حضور ﷺ کی بیعت ثانوی چیز تھی۔ اس کی اصل بنیاد تو یہ تھی کہ جو آپؐ پر ایمان لائے اور آپؐ کی تصدیق کرے وہ اس جماعت شامل ہے۔ جس نے بھی آپؐ کو اللہ کا رسول مانا ہے' اُس پر آپؐ کی اطاعت لازم ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝۶۵﴾ (النساء) ''سو تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلافات میں تجھے منصف نہ مان لیں' پھر تیرے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کریں''۔ ایمان کہاں رہ جائے گا اگر حضور ﷺ کا حکم نہ مانیں؟

**اسلامی لشکر کا بدر میں پڑاؤ:** اِس مشاورت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے پیش قدمی فرمائی اور پھر بدر پہنچ کر جب معلوم ہو گیا کہ قریش کا لشکر وادی کے دوسرے سرے تک پہنچ چکا ہے تو وہاں آپؐ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کے لیے فرمایا۔ وہاں کا ایک واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض تجربہ کار حضرات نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر یہاں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ وحی کی بنا پر ہے تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' لیکن اگر یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے تو ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ جنگی مہارت اور حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اِس مقام کی بجائے دوسرے مقام پر کیمپ ہونا چاہیے۔ حضور ﷺ نے ان حضرات کی رائے کو قبول فرمایا۔

**کفار کے صلح جُو لوگوں کی جنگ سے بچاؤ کی کوشش:** جس روز جنگ ہوئی اُس سے ایک رات قبل خبر پہنچ گئی کہ ابوسفیان کا قافلہ بچ کر نکل گیا ہے۔ اب کفار قریش کے ہاں چہ میگوئی شروع ہوئی کہ اب جنگ کا کیا فائدہ ہے؟ ہم تو اپنے قافلہ کی حفاظت کے لیے آئے تھے۔ اس

(۱) البدایہ والنہایہ لابن کثیر' ج۳'ص ۲۶۱' الراوی محمد بن اسحاق۔

صورت حال سے مشتعل مزاج لوگوں (hawks) کے مقابلہ میں صلح جو (doves) کے ہاتھ میں ایک مرتبہ پھر ایک دلیل آ گئی کہ ہمارا مقصد تو قافلہ کی حفاظت تھا' قافلہ بچ کر نکل گیا' پھر جنگ کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ قریش کے دو گھرانے بنوزہرہ اور بنوعدی یہ کہہ کر لشکر کو چھوڑ کر چلے گئے کہ اب ہمیں جنگ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس موقع پر حکیم بن حزام عتبہ کے پاس گئے جو اس لشکر کا سپہ سالار تھا اور اس سے کہا: عتبہ! تم اس وقت نیکی کا ایک ایسا کام کر سکتے ہو کہ تاریخ میں تمہارا نام لکھا جائے کہ تم نے بہت بڑا کام کیا۔ عتبہ کے استفسار پر انہوں نے وہی تجویز رکھی کہ ہمارا قافلہ بچ کر نکل چکا ہے' اب اس ہونے والی خونریزی کو تم روک سکتے ہو۔ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کا باپ عبداللہ حرب بن اُمیہ کا حلیف تھا۔ اگر تم اس کی دیت یا خون بہا ادا کر دو تو وہ مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ قافلہ بچ کر نکل ہی چکا ہے۔ اس طرح جنگ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ عتبہ بن ربیعہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ بہت مناسب تجویز ہے۔ وہ خود اسی مزاج کا آدمی تھا۔ لیکن اصل میں hawks کے سرغنہ ابوجہل کو سمجھانا مقصود تھا۔ چنانچہ دونوں اس کے پاس گئے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ عتبہ نے کہا کہ دیکھو خونریزی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا قافلہ بچ کر چلا گیا ہے' عمرو کا خون بہا میں ادا کر دیتا ہوں۔ مگر جنگ کو ٹالنے کی کوئی بھی تجویز ابوجہل گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اُس نے چالاکی سے ایک تو عتبہ کو بزدلی کا طعنہ دیا کہ تم اپنے بیٹے کو سامنے دیکھ کر گھبرا گئے ہو (یاد رہے کہ عتبہ کے بڑے بیٹے حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے' جو سابقون الاولون میں سے تھے' جبکہ عتبہ کا دوسرا بیٹا اس کے ساتھ تھا)۔ ابوجہل نے مزید نمک پاشی کرتے ہوئے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ محبتِ پدری تمہیں بزدل بنا رہی ہے کہ بیٹا مدمقابل ہے' اسی لیے تم جنگ ٹالنا چاہتے ہو۔ عتبہ اس طعنہ کو برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے کہا کل کا دن بتا دے گا کہ بزدل کون ہے!

دوسری جانب ابوجہل نے عمرو بن عبداللہ الحضرمی کے بھائی کو بلایا اور اس سے کہا کہ دیکھو ہم تمہارے بھائی کے خون کا بدلہ کل لے سکتے ہیں' لیکن یہ صلح پسند لوگ آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جنگ نہ ہو۔ یہ سن کر اُس شخص نے عرب جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنے کپڑے پھاڑے' بالکل عریاں ہو گیا اور شور مچا دیا: وَاعَمرواہ ' وَاعَمرواہ۔ اسے قبائلی زندگی میں خونی پکار کہتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ مشتعل کرنے والا نعرہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے لشکر میں آگ سی لگ گئی اور جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ یوں صلح جو لوگوں (doves) کی جانب

سے جنگ کو ٹالنے کی آخری کوشش بھی ناکام ہوگئی۔

لشکر اسلام اور لشکر کفار آمنے سامنے: اگلی صبح جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو لے کر نکلا اور مبارزت طلب کی۔ اہل ایمان کے لشکر سے تین انصاری صحابی رضی اللہ عنہم مقابلہ کے لیے نکلے۔ عتبہ نے چیخ کر پوچھا: ''مَنْ اَنْتُمْ؟ مَنِ الْقَوْمُ؟'' ـــــ انہوں نے اپنے نام بتائے۔ عتبہ نے کہا کہ تم ہمارے برابر کے نہیں ہو، ہم تم سے لڑنے نہیں آئے۔ پھر چیخ کر پکارا: محمد (ﷺ) ہماری توہین نہ کرو، ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ ہمارے مقابلے کے لیے انہیں بھیجو جو ہمارے برابر کے ہیں، جو ہمارے مدمقابل ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر باپ کے مقابلہ میں بیٹا یعنی عتبہ کے مقابلے میں حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے نکلنا چاہا، لیکن نبی اکرم ﷺ نے انہیں روک دیا۔ پھر تین صحابی حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم مقابلہ کے لیے نکلے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شیبہ کو جلد ہی واصل جہنم کر دیا، لیکن حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا ولید بن عتبہ سے شدید مقابلہ ہوا۔ دونوں کا بیک وقت ایک دوسرے پر کاری وار ہوا۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کی ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ گر پڑے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے، ولید کو ختم کیا اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو جو جاں بلب تھے اُٹھا کر لے آئے۔ انہوںؓ نے کہا مجھے نبی اکرم ﷺ کے قدموں میں لے چلو۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میرے متعلق فرمائیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تمہیں یقیناً جنت ملے گی'' تو ان کے چہرہ پر بشاشت آئی اور ان کی زبان سے نکلا'' کاش! آج ابوطالب زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے ان کی بات سچ کر دکھائی ہے کہ اپنی جان حضور ﷺ پر نچھاور کر دی ہے''۔ بات یہ تھی کہ جب مشرکین مکہ کا ابوطالب پر شدید دباؤ پڑتا تھا کہ تم اور بنو ہاشم محمد (ﷺ) کی حمایت سے دست کش ہو جاؤ، تاکہ ہم ان سے نمٹ لیں یعنی (نعوذ باللہ) آپ کو قتل کر دیں تو عام طور پر ابوطالب اُس وقت ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ: ''تم محمد (ﷺ) پر اُس وقت تک قابو نہیں پا سکو گے جب تک انؓ کی حفاظت میں ہمارا بچہ بچہ کٹ نہ مرے گا۔''

حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا انتقال میدانِ بدر میں نہیں ہوا بلکہ فتح کے بعد جب اسلامی لشکر مدینہ منورہ واپس جا رہا تھا تو راستہ میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ ان کی قبر میدانِ بدر سے آگے

مدینہ منورہ کے راستے میں ہے۔

جنگ کا نتیجہ : بہرحال ۱۷ رمضان المبارک ۲ ہجری میں میدانِ بدر میں باقاعدہ اور دُو بدو جنگ کی صورت میں اندرونِ عرب انقلابِ محمدی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں تصادم کے آخری مرحلہ یعنی مسلح کشمکش (armed conflict) کا آغاز ہوگیا۔ اس غزوہ میں قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے ابوسفیان اور ابولہب کے علاوہ باقی قریباً تمام ہی کھپ رہے۔ واضح رہے کہ ابوسفیان چونکہ تجارتی قافلے کے ہمراہ تھے‘ لہٰذا وہ اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ابولہب بھی جنگ میں شریک نہیں تھا اور اُس نے اپنی جگہ کرائے کا فوجی بھیج دیا تھا۔ قریش کے کل ستر سربرآوردہ لوگ قتل ہوئے۔ ابوجہل جہنم واصل ہوگیا۔ عتبہ بن ربیعہ‘ اس کا بھائی اور بیٹا قتل ہوئے۔ اسی طرح نضر بن حارث‘ اُمیہ بن خلف‘ عقبہ بن ابی معیط جیسے مشرکین جو نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے خون کے پیاسے تھے‘ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیئے گئے۔ مزید یہ کہ ستر مشرکین کو اہل ایمان نے قید بھی کر لیا۔ مسلمانوں کی جماعت میں سے میدان بدر میں تیرہ حضرات نے جام شہادت نوش کیا اور حضرت عبیدہؓ جو زخمی تھے‘ واپسی کے سفر کے دوران راستے میں انتقال فرما گئے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے چودہ افراد نے اپنے رب کے حضور جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ ابوجہل نے کہہ دیا تھا کہ یہ یوم الفرقان ہوگا۔ اللہ نے فی الواقع اُسے یوم الفرقان بنا دیا۔ ۳۱۳ نہتے اہل ایمان کو ۱۰۰۰ کے مسلح لشکر پر فتح عطا فرمائی۔

غزوۂ بدر تصادم کے آخری مرحلہ مسلح کشمکش کا آغاز تھا۔ یہاں سے پھر وہ جنگی سلسلہ شروع ہوا جو چھ سال کو محیط ہے۔ اس میں حق و باطل کے درمیان کئی معرکے ہوئے۔

## غزوۂ احد

غزوۂ بدر ۲ ہجری میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ اِس کے اگلے ہی سال شوال ۳ ہجری میں غزوۂ احد ہوا۔ مشرکین مکہ کے ایک لشکر جرار نے مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ دراصل مکہ والوں نے غزوۂ بدر کے بعد ایک دن بھی چین اور آرام سے نہیں گزارا۔ اُن میں انتقامی جذبات لاوے کی طرح کھول رہے تھے۔ ابوسفیان نے قسم کھالی تھی کہ جب تک مقتولینِ بدر کا انتقام نہیں لیا جائے گا‘ نہ خوشبو لگاؤں گا‘ نہ چارپائی پر سوؤں گا۔ اِسی طرح اِس ایک سال کے دوران ہندہ کا جو حال رہا‘ وہ بھی ناقابل تصور ہے‘ کہ اِس جنگ میں جس کا باپ مارا گیا‘ چچا مارا گیا‘

بھائی قتل ہوا۔ ہندہ ابوسفیان کی بیوی' عتبہ کی بیٹی اور حضرت ابوحذیفہؓ جو سابقون الاولون میں سے ہیں کی بہن تھیں اور فتح مکہ کے موقع پر ایمان لے آئی تھیں۔ چنانچہ معرکہ بدر کے بعد ہی اہل مکہ نے یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں سے ایک بھرپور جنگ لڑ کر اپنی شکست اور اشراف کے قتل کا بدلہ لیں اور اپنے غیظ و غضب کو تسکین دیں۔ اس کے ساتھ اِس طرح کی معرکہ آرائی کے لیے تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ اس معاملے میں عکرمہ بن ابی جہل' صفوان بن اُمیہ' ابوسفیان بن حرب جیسے سرداران قریش آگے آگے تھے۔ اِن لوگوں نے اِس سلسلہ میں پہلا کام یہ کیا کہ ابوسفیان کا وہ قافلہ جو غزوۂ بدر کا باعث بنا تھا' اور جسے ابوسفیان بچا کر نکال لائے تھے' اُس کا سارا مال جنگی اخراجات کے لیے روک لیا' اور یہ جن لوگوں کا مال تھا اُن سے کہا کہ اے قریش کے لوگو تمہیں محمدؐ نے سخت دھچکا لگایا ہے اور تمہارے سرداروں کو قتل کر ڈالا ہے۔ لہٰذا اپنے اس مال کے ذریعے ان سے جنگ میں ہماری مدد کرو' ممکن ہے ہم بدلہ چکا لیں۔ لوگوں نے پھر بات مان لی۔ چنانچہ یہ سارا مال جس کی مقدار ایک ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار تھی جنگ کی تیاری کے لیے فروخت کر دیا گیا۔ جنگی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد کفار کے تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل لشکر نے مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ قریش اپنی اور اپنے حلیفوں کی جو ممکنہ قوت اور طاقت جمع کر کے لا سکتے تھے وہ لے کر میدان میں آ گئے۔

<u>رسول اللہ ﷺ کی صحابہؓ سے مشاورت:</u> اس موقع پر بھی نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک مشاورت منعقد فرمائی کہ اندریں حالات کیا حکمت عملی اختیار کیا جائے' جبکہ تین ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کرنے آ رہا ہے۔ حضور ﷺ کی ذاتی رائے تھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عجیب اتفاق ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی رائے بھی یہی تھی۔ لیکن ایک تو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض حضرات کھلے میدان میں جنگ کرنے کے حامی تھے' جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا بھی نام شامل ہے۔ دوسرے یہ کہ نوجوانوں کی طرف سے بھی یہی مطالبہ تھا' خاص طور پر ان حضرات کی طرف سے جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے' کیونکہ غزوۂ بدر کے موقع پر نفیر عام نہیں تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کی اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے فیصلہ فرما دیا کہ کھلے میدان میں جنگ ہو گی۔ اس کے بعد ایک غیر معمولی واقعہ یہ ہوا کہ نبی اکرم ﷺ اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے۔ جب آپؐ باہر تشریف لائے تو آپؐ نے زرہ زیب تن فرمائی ہوئی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کا ماتھا ٹھنکا... قبل ازیں حضور ﷺ نے خواب بھی دیکھا تھا کہ ایک گائے ذبح ہوئی ہے' اور بھی چند باتیں خواب میں ایسی دیکھی تھیں' جن کی بنا پر حضور ﷺ کو اندازہ تھا کہ میدانِ اُحد میں چند غیر معمولی اور ناخوشگوار واقعات ظہور پذیر ہوں گے۔ حضور ﷺ کو زرہ پہنے دیکھ کر لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں' آپ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کیجئے اور اقدام فرمائیے۔ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں' یہ فیصلہ برقرار رہے گا۔ نبی کو یہ زیبا نہیں ہے کہ ہتھیار باندھنے کے بعد بغیر جنگ کئے انہیں اتار دے۔

اسلامی لشکر کی جبل احد کی جانب روانگی: نبی اکرم ﷺ نے ایک ہزار کی نفری لے کر مدینہ سے جبل اُحد کی جانب کوچ فرمایا' لیکن راستے ہی میں عبداللہ بن اُبی تین سو افراد کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ واپس لے کر چلا گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا اور ہماری بات نہیں مانی جاتی تو ہم ساتھ کیوں دیں اور اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالیں؟ اب آپ اندازہ کیجئے کہ مدنی دَور کے قریباً اڑھائی سال کے اندر اندر جنگ کے قابل مسلمانوں کی کل نفری کا لگ بھگ ایک تہائی حصہ منافقین پر مشتمل ہو چکا تھا۔ معاملہ کی نزاکت کا اندازہ کیجئے کہ جو تین سو واپس چلے گئے ان کے منافق ہونے میں تو کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ یہ جو سات سو افراد باقی رہ گئے تھے' ان میں کمزور اور ضعیف ایمان والے بھی تھے۔ لیکن وہ تھے بہرحال اصحابِ ایمان! جب ہی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سنبھال لیا۔ لیکن جو محمد رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر راستہ ہی سے عبداللہ بن اُبی کے ساتھ واپس مدینہ چلے گئے' ظاہر ہے ان کے نفاق میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ گویا ایک ہزار میں سے تین سو کی نفری منافقین پر مشتمل تھی۔ کہاں وہ تین ہزار کا لشکر اور کہاں یہ سات سو افراد! قریش کے ساتھ سواری اور بار برداری کے لیے تین ہزار اونٹ دو سو گھوڑوں کا رسالہ بھی تھا۔ عرب کے اس دور کے حالات کے اعتبار سے یہ بہت بڑی بات تھی۔ دو سو گھڑ سواروں کا دستہ اوران پر خالد بن ولید بن مغیرہ سپہ سالار تھے۔

مسلمانوں کی صف بندی: نبی اکرم ﷺ نے اُحد پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھا اور اس کے دامن میں صفیں بنوائیں۔ سامنے مشرکین تھے۔ جبل اُحد کے ساتھ ایک دَرہ ایسا تھا کہ اُحد کے پیچھے سے چکر لگا کر اس دَرہ سے گزر کر مسلمانوں کے لشکر پر حملہ ہوسکتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں اِدھر سے حملہ نہ ہو جائے' اس دَرہ پر پچاس تیر اندازوں کو حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں تعینات فرمایا۔ حضور ﷺ نے نہایت تاکیدی اسلوب سے فرمایا کہ تم لوگ یہاں سے نہیں ہلنا۔ اگر ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم یہ دیکھو کہ پرندے

ہماری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم لوگ یہاں سے نہ ہٹنا۔ آپ اس تاکید اور شدت کا اندازہ کیجئے جو اس حکم میں نظر آتی ہے۔ جنگ شروع ہوئی تو پہلے ہی ہلے میں اللہ کی مدد و نصرت آئی اور بالکل بدر کا سا نقشہ سامنے آ گیا۔ مشرکین کے قدم اکھڑ گئے اور مسلمانوں نے ان کا پیچھا شروع کیا۔ کچھ مسلمان کفار کا تعاقب کر رہے تھے اور اکثر مال غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے تھے۔

**ڈسپلن کی خلاف ورزی کا نتیجہ:** ادھر جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم درہ پر تعینات تھے ان میں اختلاف رائے ہو گیا۔ ان پچاس تیراندازوں میں سے اکثر نے کہا کہ چلو، ہم بھی چلیں، مال غنیمت جمع کریں، اب تو فتح ہو گئی ہے۔ ان کے کمانڈر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہرگز نہیں، حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہاں سے نہ ہلنا، لہٰذا میں کسی کو اجازت نہیں دیتا"۔ لیکن ہوا یہ کہ اکثر نے اپنے کمانڈر کی بات نہ مانی اور اس درے کو چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فتح شکست میں بدل گئی۔ انہوں نے آپؐ کے حکم کی یہ تاویل کی کہ حضور ﷺ نے تو شکست کی صورت میں اتنا زور دیا تھا کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے مت ہٹنا۔ اب تو فتح ہو گئی ہے، لہٰذا اب یہاں سے ہلنے میں کیا حرج ہے۔ درّہ چھوڑ کر چلے جانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے مقامی امیر کی حکم عدولی کی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ جو اس دستہ کا امیر ہے وہ تو اجازت نہیں دے رہا۔ چلئے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے حکم کی تاویل کر لی۔ لیکن یہاں ان کے اور حضور ﷺ کے مابین ایک لوکل کمانڈر موجود ہے جس کو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے امیر مقرر فرمایا ہے۔ اس امیر کی تو نافرمانی ہو گئی! ڈسپلن تو بہر حال ٹوٹ گیا! نظم کی اہمیت کے بارے میں بیعت عقبہ ثانیہ کے وہ الفاظ یاد کیجئے جو حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم اپنی اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ سند کے اعتبار سے حدیث کے صحیح ہونے کا اس سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے۔ حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَ الْيُسْرِ وَ الْمَنْشَطِ وَ الْمَكْرَهِ، وَ عَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَ عَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهُ، وَ عَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ)) (۱)

"ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی کہ ہم (آپؐ کا) حکم سنیں گے اور مانیں گے، خواہ مشکل ہو خواہ آسان، خواہ ہماری طبیعت کو خوش گوار لگے خواہ ناگوار ہو، خواہ دوسروں

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء

کو ہم پر ترجیح دی جائے۔ اور جس کو بھی ہم پر امیر بنا دیا جائے گا ہم اس سے جھگڑیں
گے نہیں' اور ہم حق بات کہتے رہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں اور اللہ کے معاملہ میں
(حق کہنے سے) کسی ملامت گر کی ملامت سے ہرگز نہیں ڈریں گے۔''

درّے پر متعین تیر اندزوں نے اپنے مقامی امیر کی جو حکم عدولی کی تھی تو یہ اصل میں محمد رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی تھی' کیونکہ عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کے دستہ پر امیر اور کمانڈر مقرر کیا تھا۔ لہٰذا نظم کے اعتبار سے کمانڈر کی نافرمانی خود حضور ﷺ کی نافرمانی ہو گئی۔ بہر حال نظم کی خلاف ورزی اور موجود الوقت امیر کی نافرمانی کی سزا کیا ملی! یہ کہ خالد بن ولید نے جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے' درہ خالی دیکھ کر اُحد کی پشت کا چکر کاٹا اور دو سو گھڑ سواروں کا دستہ لے کر اس درہ سے مسلمانوں کی پیٹھ سے اُن پر حملہ آور ہو گئے جس سے یکلخت جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ حالانکہ اِس سے پہلے کفار کی فوج مار کھا چکی تھی' اور اُسے شکست ہو گئی تھی۔ درہ پر صرف پندرہ تیر انداز رہ گئے تھے' لہٰذا ان کے لئے دو سو گھڑ سواروں کو اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے یا تلواروں سے روکنا ممکن نہیں تھا۔ پچاس کی نفری برقرار رہتی تو خالد بن ولید کا اپنے دستہ کے ساتھ درہ کو پار کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہاں پندرہ کے پندرہ اصحاب رسولؐ نے جام شہادت نوش فرمایا رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم۔ خالد بن ولید کے اس عقبی حملہ نے مسلمانوں کو سراسیمہ کر دیا۔ ان کی صفیں تو پہلے ہی درہم برہم تھیں' کچھ لوگ کفار کا پیچھا کر رہے تھے اور اکثر مال غنیمت اکٹھا کر رہے تھے۔ بھاگنے والے کفار نے جب خالد بن ولید اور اس کے دستہ کے لوگوں کے نعرے سنے تو انہوں نے پلٹ کر زور دار حملہ کر دیا۔ اب مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گئے اور فتح شکست سے بدل گئی۔ سورۃ آل عمران میں اس صورت حال کے بارے میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾﴾

''(مسلمانو! تم اپنی شکست کا اللہ کو کوئی الزام نہیں دے سکتے) اللہ نے تو (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ پورا کر دکھایا تھا' جبکہ (ابتدا میں) تم اس کے حکم سے

اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ مگر جب تم ڈھیلے پڑے (تم نے کمزوری دکھائی) اور تم نے معاملہ میں اختلاف کیا' اور تم اپنے امیر کی حکم عدولی کر بیٹھے' بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی یعنی فتح جو تمہیں محبوب تھی اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا' تا کہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا' کیونکہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔''

''مَا تُحِبُّوْنَ'' سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے ''مَا تُحِبُّوْنَ'' سے مراد مالِ غنیمت کی چاہت لی ہے اور بعض نے سورۃ الصف کی آیت ۱۳ کے اس حصہ سے کہ: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ استدلال کرتے ہوئے وہ فتح مراد لی ہے جو پہلے ہلے میں اہل ایمان کے لشکر کو حاصل ہو گئی تھی۔ میں اس آخر الذکر رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ لہٰذا یہ بات کہ وہ مالِ غنیمت پر جھپٹے تھے' یہ بالکل غلط ہے۔ مالِ غنیمت کا معاملہ بدر میں طے ہو چکا تھا۔ عربوں کے ہاں دستور تھا کہ جنگ میں جو مال جس کے ہاتھ آیا وہ اُسی کا ہو گا۔ اس لئے کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مال سمیٹا جائے۔ مگر غزوۂ بدر کے بعد قانون آ گیا کہ جو مالِ غنیمت ہے وہ خود اللہ کا ہے۔ اور باقی سب میں برابر تقسیم ہو جائے گا۔ یہ نہیں کہ جو کسی کے ہاتھ لگے وہ اس کا ہے۔ جب یہ قانون آ چکا تھا تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تو اس کے لئے بھاگ دوڑ کرنے کا کہ کہیں ہم محروم نہ رہ جائے کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے اس کی یہ تعبیر کی جس کی دہلی کے ایک رسالے میں بہت تحسین ہوئی۔ اور ایک رسالے نے اس پر تنقید بھی کی کہ یہ شخص خواہ مخواہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے اتنی معذرت کر رہا ہے' اور ان کی کمی اور کمزوری کو چھپا رہا ہے۔ میں نے کہا' یہ بات نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ﴾ (الصف: ۱۳) ''ایک اور شے جو تمہیں بہت پسند ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے مدد آ جائے اور فتح قریب ہو۔'' تو فتح کی محبت کی وجہ سے ان کے اندر ایک ڈھیل پیدا ہوئی' مالِ غنیمت کی وجہ سے انہوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ جب مقابلہ جاری رہتا ہے تو اعصاب tense ہوتے ہیں مگر جب فتح ہو جاتی ہے تو اعصاب ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ یہی ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہوا۔ اصل بات کیا ہے؟ یہ کہ بندہ مومن کے لئے فتح و شکست کی کوئی حیثیت نہیں' اصل چیز اپنے فرض کی ادائی ہے۔ اگر اُس نے فرض ادا کر دیا' جان دے دی' تو وہ

کامیاب ہو گیا' خواہ ظاہری اور دنیوی اعتبار سے نتائج نہ بھی نکلے ہوں۔ کیا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ناکام ہو گئے؟ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ناکام ہو گئے؟ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حارث رضی اللہ عنہ ناکام ہو گئے؟ کہ ان کو تو اسلام کا غلبہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ہرگز نہیں' وہ شہید ہیں' سیدھے جنت میں جائیں گے۔ انہیں میدان قیامت کے حساب کتاب سے بھی نہیں گزرنا پڑے گا۔

فتح شکست میں کیوں تبدیل ہوئی؟ غزوۂ اُحد کی فتح کا شکست میں بدلنا درحقیقت فشل' تنازع فی الامر اور معصیت امیر کی پاداش میں اللہ کی طرف سے سزا تھی۔ اندازہ کیجئے کہ سزا کتنی کڑی تھی کہ سات سو میں سے ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے' یعنی دس فیصد نفری شہید ہو گئی' حالانکہ خطاء صرف پانچ فی صد کی تھی۔ پھر شہداء میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسے کیسے جاں نثار اور کیسے کیسے ہیرے اور موتی تھے جو کیسی کیسی محنت سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کئے تھے۔ ان ہی میں "اَسَدُ اللّٰہِ وَ اَسَدُ رَسُوْلِہٖ" حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان ہی میں المُقرِی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں کہ جن کی دعوت وتبلیغ اور تعلیم قرآنی سے مدینہ منورہ میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا اور اوس وخزرج کے قبیلوں کے اکثر لوگ دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔ حضرت حمزہ اور حضرت مصعب بن عمیر کے علاوہ مہاجرین و انصار میں سے اڑسٹھ (٦٨) دوسرے مجاہدین اور جان نثاران محمد صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جامِ شہادت نوش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی مجروح ہوئے۔ آپؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے۔ خود کی دو کڑیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک میں اس طور سے گھس گئیں کہ نکالنے کے لئے زور لگایا تو نہیں نکلیں۔ پھر دوسرے اصحابؓ نے بمشکل ان کو نکالا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی بھی طاری ہوئی۔ کفار نے ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نرغے میں لے لیا اور تیروں کی بارش برسائی۔ جاں نثاروں نے اپنے جسموں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بنایا کہ جو تیر آئیں وہ ہمارے سینوں میں تراز ہوں' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک تک نہ پہنچیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بڑے ماہر تیرانداز تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تیر دیتے اور فرماتے جاتے "سعد" تم پر میرے ماں باپ قربان' تیر چلاتے جاؤ" صرف حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہی وہ خوش بخت صحابی ہیں جن کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محبت بھرا کلمہ ارشاد فرمایا۔

غزوۂ اُحد کے بعد کے دو سال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کے لئے نہایت پریشان کن اور تکلیف دہ رہے ہیں۔ اس لئے کہ اہل عرب پر مسلمانوں کے رعب' ہیبت اور دھاک کی جو

فضا بن گئی تھی وہ بہت حد تک ختم ہوگئی۔ اب عین مدینہ کے قریب آ کر قریش جو اتنا بڑا چرکہ لگا گئے تو اس سے ایک تو مسلمانوں کے دل زخمی تھے۔ ان کا حوصلہ اب اتنا اونچا نہیں رہا جتنا غزوۂ بدر کے بعد ہوگیا تھا۔ دوسرے گردوپیش کے مشرکین کے قبائل پر مسلمانوں کی جو دھاک بیٹھ گئی تھی وہ باقی نہیں رہی' بلکہ وہ اسلامی انقلاب کی دعوت وتحریک کے مقابلہ میں دلیر ہوگئے اوران کی طرف سے مخالفت ومزاحمت کے اندیشے پیدا ہوگئے۔

## غزوۂ احزاب

ذیقعدہ ۵ ھ میں یعنی غزوۂ احد کے دوسال اور ایک ماہ بعد قریش اور دیگر قبائل جن میں یہود بھی شامل تھے' متحد ہوکر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ عرب میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا لشکر جمع نہیں ہوا تھا۔ بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لئے جمع ہوگیا۔ جنوب سے قریش آ گئے۔ مشرقی جانب سے کئی قبائل آ گئے جن میں بنوفرازہ اور بنوغطفان بھی تھے' جونجد کے علاقے کے بڑے جنگجو اور خونخوار قبیلے تھے۔ شمال سے وہ یہودی قبائل حملہ آور ہوگئے جو خیبر میں آباد تھے۔ اس طرح اِن قبائل نے ایک مقررہ وقت کے تحت مدینے کا رُخ کیا۔ چنانچہ مدینہ کے پاس دس ہزار کا ایک زبردست لشکر جمع ہوگیا۔ اگر یہ لشکر کفار مدینہ کی چار دیواری تک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کے لئے سخت خطرناک ثابت ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے ان کا صفایا ہوجاتا۔

<u>رسول اللہ ﷺ کی صحابہؓ سے مشاورت:</u> محمد رسول اللہ ﷺ کفار کے عزائم' ارادوں اور سازشی ذہنیت سے آگاہ تھے۔ چنانچہ کفار کا یہ لشکر جیسے ہی اپنی جگہ سے حرکت میں آیا' مدینہ کے مخبرین نے آپؐ کو اس کی اطلاع دے دی۔ اس پر رسول کریم ﷺ نے مجلس شوریٰ منعقد کی اور دفاعی منصوبے پر صلاح مشورہ کیا۔ اس موقع پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر مدینہ سے باہر خندق کھودنے کی تجویز پیش کی ''اے اللہ کے رسول ﷺ فارس میں جب ہمارا محاصرہ کیا جاتا تھا تو ہم اپنے اردگرد خندق کھود دیتے تھے۔'' آپؐ نے اس تجویز کو پسند کیا اور فوراً اس پر عمل درآمد شروع فرمایا۔ ہر دس آدمیوں کو چالیس ہاتھ خندق کھودنے کا کام سونپ دیا۔ مسلمانوں نے بڑی دلچسپی سے خندق کی کھدائی شروع کر دی۔ آپؐ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی ترغیب بھی دیتے تھے اور عملاً اس کام میں پوری طرح شریک بھی رہتے تھے۔ حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خندق میں تھے۔ لوگ کھود رہے تھے' اور ہم کندھوں پر مٹی ڈھو رہے تھے کہ اس دوران میں رسول اللہ ﷺ فرماتے:

اَللّٰھُمَّ لَاعَیْشَ اِلَّاعَیْشُ الْاٰخِرَۃِ
فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ

(اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ پس مہاجرین اور انصار کو بخش دے۔)

اس کے جواب میں جس شعر کا تذکرہ روایات میں آتا ہے وہ نظم جماعت کی اساس کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ صحابہؓ فرماتے تھے:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا (۱)

(ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ سے جہاد کی بیعت کی ہے۔ اب یہ اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک جان میں جان ہے۔)

<u>منافقین اور مؤمنین کی کیفیات</u>: غزوۂ احزاب کا نقشہ سورۃ الاحزاب میں کھینچا گیا ہے' اور یہ دوسرے اور تیسرے پورے دو رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے۔ کفار و مشرکین کی ہمہ جہت یلغار کے بیان میں فرمایا:

﴿اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ﴾

''یاد کرو جب لشکر آ گئے تھے تم پر تمہارے اوپر سے بھی اور تمہارے نیچے سے بھی''

چونکہ مدینہ سے مشرق کی طرف اونچائی ہوتی چلی جاتی ہے' اسی لئے اس علاقہ کو نجد کہتے ہیں' جس کے معنی ہیں اونچائی والا علاقہ۔ لہٰذا جو دشمنانِ اسلام مشرق سے آئے ان کے لئے ''مِنْ فَوْقِکُمْ'' کے الفاظ آئے اور مغربی ساحل کی طرف ڈھلان اور اترائی ہے۔ چنانچہ قریش اور ان کے حلیف مغرب یعنی نیچائی اور اتار کے راستہ سے آئے۔ لہٰذا ان کے لئے ''مِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ'' فرمایا گیا۔ مزید برآں مدینہ کے شمال مغرب کی جانب سے یہودی قبائل بھی جمع ہو کر آ گئے تھے۔

اس کٹھن موقع پر منافقین اور کمزور ایمان والوں کی کیفیت اسی آیت میں آگے ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

﴿وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰﴾

''اور یاد کرو جب آنکھیں (وحشت و حیرت سے) پھرنے لگیں اور (خوف و ہراس سے) دلوں کا یہ حال تھا کہ وہ گویا گلوں میں آ اٹکے ہیں اور تم اللہ کے بارے میں طرح

(۱) صحیح مسلم' کتاب الجھاد والسیر' باب غزوۃ الاحزاب وھی الخندق

طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔''

یہ تبصرہ ہے اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے اس امتحان پر جو غزوۂ احزاب کی صورت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ امتحان یقیناً شدید تھا۔

منافقین کے دلوں میں جو خبث' نجاست اور گندگی تھی' وہ اس ابتلاء و آزمائش کو دیکھ کر ان کی زبانوں پر آ گئی' جس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ⑫﴾ (الاحزاب)

''اور جب کہنے لگے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سب فریب تھا۔''

انہوں نے (نعوذ باللہ) کہا کہ ہمیں تو دھوکا دے کر مروا دیا گیا۔ ہم سے تو کہا گیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی' جبکہ اس وقت حالات یہ ہیں کہ ہم رفع حاجت کے لئے بھی باہر نہیں جا سکتے۔ کھانے کو کچھ نہیں۔ ہمارے باغات حملہ آوروں نے اجاڑ دیئے۔ چاروں طرف سے محاصرہ ہے' اندر کوئی چیز نہیں ہے۔ منافقین کی یہ باتیں ان کے دلوں سے اچھل کر زبانوں پر آ گئیں۔ ان باتوں کا تذکرہ سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور کتب احادیث میں ملتا ہے۔

ادھر مؤمنین صادقین کی کیفیت کیا تھی' اس بارے میں آیت ۲۲ فرمایا:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾

''اور حقیقی مؤمنین کا اُس وقت حال یہ تھا کہ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اُٹھے کہ یہی تو وہ بات ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے ہم سے وعدہ کیا تھا' اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات بالکل سچی تھی۔''

یہ کون سا وعدہ ہے جس کی طرف یہ صادق القول مؤمنین اشارہ کر رہے ہیں؟ یہ ابتلا و آزمائش کا وہ وعدہ ہے جس کا قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ العنکبوت میں فرمایا:

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ② وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ③﴾

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان

سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں!''

چنانچہ غزوۂ احزاب کے مصائب کو دیکھ کر مؤمنین صادقین کے ذہن ان پیشگی تنبیہات کی طرف منتقل ہو گئے اور ان کی زبانوں پر فی الفور آ گیا:

﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾

غزوۂ احزاب میں کفار و مشرکین کے لشکروں کا محاصرہ خاصا طول پکڑ گیا اور اس دوران اہل مدینہ پر بڑے ہی سخت قسم کے حالات پیش آئے۔ جب خندق کھودی جا رہی تھی تو نبی اکرم ﷺ بھی اس کام میں بنفس نفیس شریک تھے اور پتھر اُٹھا اُٹھا کر خندق سے باہر پھینک رہے تھے۔

چونکہ ان دنوں شدید قحط کا عالم تھا' لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے پیٹوں پر چادروں کے ساتھ کس کر پتھر باندھ رکھے تھے' تاکہ کمریں دوہری نہ ہو جائیں۔ اس لئے کہ شدید بھوک کی وجہ سے معدہ تشنج میں آتا ہے۔ دراصل یہ معدے کو بہلانے کی ایک شکل ہے کہ اگر اس پر بھاری بوجھ باندھ دیا جائے تو اس کو وہ بھوک کا تشنج (hunger pain) نہیں ہوگا۔ اس موقع پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کُرتے اٹھا کر اپنے پیٹ دکھائے اور عرض کیا کہ حضور ﷺ اب فاقہ ناقابل برداشت ہو رہا ہے' ہم نے اسی لئے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے اپنا کرتہ اُٹھا کر دکھایا تو وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

<u>نصرتِ الٰہی کا ظہور</u>: کفار کے متحدہ لشکر کا یہ محاصرہ بیس دن جاری رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد اور نصرت و تائید سے اہل ایمان کو کفار کے اس نرغہ اور محاصرہ سے نجات دلائی۔ ہوا یوں کہ ایک شب بہت زبردست آندھی آئی' جس سے کفار و مشرکین کے لشکر تلپٹ ہو گئے۔ اکثر خیمے اکھڑ کر آندھی کے ساتھ تتر بتر ہو گئے۔ بڑے بڑے چولہوں پر چڑھی ہوئی بڑی بڑی دیگیں اُلٹ گئیں۔ ان چولہوں کی وجہ سے ان کے خیموں میں آگ لگ گئی۔ یہ گویا ایک غیبی تدبیر تھی' جس سے ان کے حوصلے اس درجہ پست ہو گئے کہ صبح تک تمام لشکر منتشر ہو چکا تھا۔ تمام قبائل اپنے اپنے علاقوں کی طرف کوچ کر گئے...... اسی کا ذکر ہے سورۃ الاحزاب کی آیت ۹ میں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا۝﴾

''اے اہل ایمان! اللہ کا احسان یاد کرو جو تم پر ہوا' جب چڑھ آئیں تم پر فوجیں' پھر ہم نے ان پر بھیج دی ہوا (آندھی) اور (فرشتوں کی) وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں۔

اور اللہ تمہارے تمام اعمال کو دیکھنے والا ہے۔"

اہل ایمان آزمائش میں سرخرو ہو گئے: نبی اکرم ﷺ نے چند اور تدابیر بھی اختیار فرمائی تھیں، لیکن ان کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس غزوۂ احزاب کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان کا امتحان لینا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دینا مقصود تھا' تاکہ نظر آ جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے! سب جان لیں کہ کون ان میں سے منافق ہیں اور کون وہ ہیں جو کڑی سے کڑی آزمائش اور سخت سے سخت امتحان میں بھی ثابت قدم رہ سکتے ہیں!! ...... جب یہ امتحان ہو گیا تو مدمقابل دشمنوں کے لئے ایک آندھی اور فرشتوں کا ایک لشکر کافی تھا۔ کفار و مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر اللہ کی قدرت کے مقابلہ میں تو پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ بارہ ہزار کیا بارہ لاکھ کا لشکر بھی ہوتا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایک آندھی نے معاملہ تلپٹ اور تتر بتر کر دیا اور کفار و مشرکین جو ایک زبردست جمعیت کی شکل میں بڑے ناپاک عزائم اور بڑی تیاریوں کے ساتھ دور دراز کا سفر کر کے ہدایت کے چراغ کو بجھانے آئے تھے' ایک ہی رات میں منتشر ہو گئے۔ معاملہ ختم ہو گیا اور صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح ہوئی تو مسلمانوں نے دیکھا تو میدان خالی تھا۔ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ نے جو تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے' ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو کتنی دور رس نگاہ اور کتنی بصیرت و فراست عطا فرمائی تھی۔ فرمایا:

((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَ لٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) (۱)

"اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکتے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔"

میرے نزدیک سورۃ الصّف بھی اسی موقع پر نازل ہوئی ہے جس میں یہ آیت مبارکہ موجود ہے:

﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾﴾

"اور (اے مسلمانو!) ایک دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے' یعنی اللہ کی مدد' تو وہ آیا ہی چاہتی ہے اور اب فتح دور نہیں ہے (تمہارے قدموں کو چومنے والی ہے) اور اے نبیؐ! اہل ایمان کو بشارت سنا دیجئے"

راقم کے نزدیک نبی اکرم ﷺ نے جو یہ الفاظ فرمائے کہ: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَ لٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) سورۃ الصّف کے اس حکم ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کے امتثال امر میں فرمائے تھے۔ (واللہ اعلم!)

(۱) تفسیر القرآن' لابن کثیر' ج۶' ص ۳۹۶۔ راوی محمد بن اسحاق

## رسول اللہ ﷺ کی عمرہ کے لیے مکہ روانگی

غزوۂ احزاب کے اگلے ہی سال ۶ ھ میں رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے' لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیبی اشارہ اور حکم سمجھ کر اعلان عام کرا دیا کہ ہم عمرہ کے لیے جائیں گے' جو ہمارے ساتھ جانا چاہیں وہ چلیں۔ چنانچہ چودہ سو یا اٹھارہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم بھی آپؐ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ ہدی کے جانور بھی ساتھ لیے۔ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اُس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جانے کا قصد کیا وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ گویا موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ عمرہ کے لیے جانے کا مطلب ہی یہ تھا کہ شیر کی کچھار میں جانا ہے۔ اس لیے کہ وہ اگرچہ عمرہ کی نیت سے جا رہے تھے' لیکن قریش کے نزدیک تو یہ ایک نوع کی چڑھائی تھی۔ وہ اہل ایمان کو عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہونے دیں تو گویا یہ ان کے لیے اپنی رہی سہی ساکھ اور بچا کھچا وقار بھی ہمیشہ کے لیے خود اپنے ہاتھوں خاک میں ملانے کے مترادف تھا۔ یہ تو ان کے لیے ایک نوع کی شکست تھی کہ وہ مسلمانوں کو عمرہ ادا کرنے دیتے۔ اس کے بعد تو عرب میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔

ذوالحلیفہ کا مقام جو مدینہ سے تقریباً سات آٹھ میل باہر ہے' اور یہاں سے عمرہ یا حج کے لیے احرام باندھنے کی حد شروع ہو جاتی ہے' حضور ﷺ اور آپؐ کے تمام ساتھیوں رضی اللہ عنہم نے عمرہ کا احرام باندھا اور ہدی (قربانی) کے جو جانور ساتھ تھے' ان کے گلوں میں پٹے ڈال دیئے گئے' جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ جانور قربانی کے ہیں۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر آپؐ نے مکہ کی طرف سفر جاری رکھا' حتیٰ کہ حدیبیہ کے مقام پر جا کر پڑاؤ کیا۔

اُدھر جب قریش کو علم ہوا کہ حضور ﷺ عمرہ کے ارادہ سے تشریف لائے ہیں تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو کسی صورت بھی مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے' بلکہ انہوں نے اپنے تمام حلیفوں کو پیغام بھیج دیا کہ وہ سب آ کر قریش کی مدد کریں' تاکہ سب مجتمع ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ محمد (ﷺ) کا راستہ روک سکیں۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی یہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ بدیل بن ورقہ خزاعی قبیلہ بنوخزاعہ سے تعلق رکھتے تھے' جو مکہ اور مدینہ کے مابین آباد تھا۔ اس قبیلہ کا کچھ دوستانہ تعلق قریش کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بھی تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بدیل بن ورقہ کو اس کام کے لیے مامور کیا

کہ وہ مکہ والوں کی خبر لا کر دیں کہ صورت حال کیا ہے۔ انہوں نے آ کر خبر دی کہ قریش نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے اور ان کا عزمِ مصمم ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی آپؐ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم مکہ جا کر ہماری طرف سے قریش سے کہو کہ ہمارا جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے' ہم محض عمرہ کے لیے آنا چاہتے ہیں' اور قریش کو سمجھاؤ کہ انہیں پہلے بھی ان جنگوں کے سلسلہ نے بہت نقصان پہنچایا ہے' اب بہتر یہی ہے کہ ہمارے اور ان کے مابین کچھ عرصہ کے لیے صلح ہو جائے اور قریش ہمیں عرب کے دوسرے قبائل سے نمٹنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں' تا کہ ہم بقیہ عرب کے ساتھ اپنے معاملات طے کر لیں۔ اسی میں خیر ہے' اسی میں ہماری اور ان کی بہتری ہے۔ چنانچہ وہ مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیں اور ہمیں پُر امن طور پر عمرہ ادا کرنے دیں۔

حضور ﷺ کے اس پیغام کے ساتھ بُدَیل بن ورقہ مکہ پہنچے۔ وہاں ایک بڑی چوپال میں جا کر' جہاں قریش کے بڑے بڑے گھرانوں کے سردار جمع تھے' انہوں نے کہا کہ میں محمد (ﷺ) کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں' اگر آپ حضرات اجازت دیں تو عرض کروں! ـــــ انہوں نے یہ انداز شاید اس لیے اختیار کیا ہوگا کہ پہلے یہ اندازہ ہو جائے کہ قریش مکہ کا رجحان کیا ہے! چنانچہ ان میں Hawks (یعنی مشتعل مزاج اور جنگجو لوگوں) نے فوراً کہا کہ ہم نہ تو کوئی بات سننے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت اور حاجت ہے۔ مگر Doves (یعنی صلح پسند افراد) نے کہا کہ نہیں! ہمیں بات سننی چاہیے اور بدیل سے کہا سناؤ کہ محمد (ﷺ) کہتے کیا ہیں! انہوں نے حضور ﷺ کا پیغام من وعن سنا دیا۔

اب قریش نے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے عروہ بن مسعود ثقفی کو اُن کی اپنی تجویز پر حدیبیہ بھیجا۔ عروہ حضور نبی کریم ﷺ سے ملا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کیفیات کا جائزہ لیا' واپس مکہ جا کر اُس نے قریشی سرداروں کے سامنے جو رپورٹ پیش کی اُس میں مسلمانوں کے نظم وضبط' جوش وخروش اور جان سپاری کا ذکر کیا' اُس نے کہا:

> ''اے قریش کے لوگو! دیکھو' میں قیصر وکسریٰ کے ایوانوں میں گیا ہوں' میں نے ان کے دربار دیکھے ہیں' ان کا ٹھاٹھ باٹھ دیکھا ہے' لیکن خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو اس کی اپنی قوم میں ایسا محترم نہیں دیکھا جیسا کہ محمد (ﷺ) کو اپنے اصحاب میں دیکھا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جو لوگ محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں ان کو جتنی محبت محمد (ﷺ) سے ہے اور جتنی عقیدت وتوقیر اور عزت محمد (ﷺ) کی ان کے

دلوں میں ہے' اور اپنے دین کی جو حمیت اور فدایانہ جذبہ ان کے دلوں میں ہے' وہ مجھے پوری زندگی میں کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ جب محمد (ﷺ) وضو کرتے ہیں تو لوگ اُنؐ کے وضو کا پانی تبرک کے طور پر لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اگر وہ تھوکتے ہیں یا ان کے دہن سے بلغم نکلتا ہے تو لوگ اسے جھپٹ لیتے ہیں اور اس کو اپنے ہاتھوں اور چہروں پر مل لیتے ہیں۔ یہ محبت میں نے کسی قوم میں اپنے سردار اور قائد حتیٰ کہ کسی بادشاہ تک کے لیے نہیں دیکھی۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم ان سے مت بھڑو' ان سے جنگ کا ارادہ ترک کر دو اور مصالحت کر لو۔''

عروہ کے اس اظہارِ خیال پر وہاں بڑا شور و غوغا ہوا کہ ہم مصالحت کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہم محمد (ﷺ) کو کسی صورت بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ محمد (ﷺ) کو واپس جانا پڑے گا ورنہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ اس کے بعد قریش کے چند مشتعل مزاج (hawks) لوگ آپؐ کے پاس آئے' لیکن ان کا رویہ مصالحانہ نہیں تھا' بلکہ جارحانہ اور رعب ڈالنے والا تھا۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے خود سلسلۂ جنبانی شروع کرنے اور اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو مکہ والوں کے پاس افہام و تفہیم کے لیے بھیجنے کا ارادہ فرمایا۔ سب سے پہلے آپؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرا خیال ہے آپ مکہ جائیں اور قریش سے مصالحت کی کوشش کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور اب مکہ میں میرا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں ہے جس کی امان و حمایت میں میں مکہ میں داخل ہو سکوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی بغیر بات چیت کے قتل کر دیں۔ لہٰذا میں تجویز کرتا ہوں کہ میری بجائے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بھیجئے۔ ان کا قبیلہ بنو امیہ بہت مضبوط ہے۔ ان کے بہت سے قریبی رشتہ دار بھی وہاں موجود ہیں' جن میں سے کسی کی بھی امان و حمایت میں وہ مکہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مکہ جانے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ وہ تعمیل حکم میں مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ابھی مکہ میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ باہر ہی ان کو اپنے چچا زاد بھائی ابان بن سعید بن عاص مل گئے۔ انہوں نے آنجناب کو اپنی پناہ اور حمایت میں لے لیا اور اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قریش کے پاس پہنچ گئے۔ گفت و شنید کا سلسلہ دو تین روز تک چلتا رہا' اگرچہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ قریش کسی صورت مصالحت پر آمادہ نہیں ہوئے۔ تاہم انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب جب تم مکہ میں آ ہی گئے ہو تو ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں

کہ تم کعبہ کا طواف کر لو' لیکن آپؓ نے نبی اکرم ﷺ کی معیت کے بغیر طواف کی یہ پیشکش قبول نہیں فرمائی۔ گفت وشنید میں جو دیر لگی تو اس طرح گویا وہ کیفیت پیدا ہو گئی جسے آج کل کی سیاسی اصطلاح میں ''نظر بندی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اندریں حالات یہ خبر اڑ گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔

بیعت رضوان: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جب نبی اکرم ﷺ کو پہنچی تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے وہ بیعت لی جو کتب سیر میں ''بیعت رضوان'' کے نام سے مشہور و معروف ہے اور جس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۸ میں ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا﴿۱۸﴾﴾

''(اے نبیؐ) بے شک اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے اور اسے ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ لہٰذا اس نے ان پر قلبی اطمینان وسکون نازل فرمایا اور انعام میں ان کو فتح قریب بخشی۔''

حدیبیہ کے مقام پر کوئی چھوٹا سا درخت تھا' جس کے سایہ میں نبی اکرم ﷺ تشریف فرما ہو گئے اور وہاں آپ نے فرمایا کہ اب ہر مسلمان مجھ سے بیعت کر کے ایک عہد کرے--- اس بیعت کے بارے میں دو روایات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ بیعت علی الموت تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر مسلمان میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرے کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں لیکن عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لیے بغیر ہرگز یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔ دوسری روایت ہے کہ اس بات پر بیعت لی گئی کہ ہم یہاں سے پیٹھ نہیں موڑیں گے اور راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔ بہر حال اس بیعت کا مقصد یہ سامنے آتا ہے کہ کسی حالت پر پیٹھ نہیں دکھانی اور میدانِ جنگ سے جان بچا کر نہیں جانا۔ گویا یہ بیعت علی الموت تھی کہ ہر شخص میدان میں ڈٹا رہے گا' صرف موت ہی اسے اس جنگ سے رستگاری دے سکے گی۔

جب قریش نے ایک طرف یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کسی دھمکی سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں' دوسری طرف ان کے حلیم الطبع اشخاص نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا اور قریش کے سامنے خون ریزی کے ہولناک نتائج رکھے تو بالآخر ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اگر کوئی مصالحت ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ قریش کو بیعت رضوان کی خبر بھی پہنچ چکی تھی' جس پر ان میں کافی

سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اسی لیے انہوں نے سہیل بن عمرو کو اپنی طرف سے نمائندہ بنا کر بھیجا' تاکہ وہ ایسی شرائط پر مصالحت کرلیں جو قریش کے لیے آبرومندانہ ہوں' سبکی کا باعث نہ ہوں۔ سہیل بن عمرو کا شمار ان کے بڑے متحمل اور مدبر سرداروں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو خبر ملی کہ اس مرتبہ سہیل بن عمرو گفتگو کے لیے آئے ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ قریش مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔

## معاہدہ صلح حدیبیہ

سہیل حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مصالحت کا عندیہ ظاہر کیا۔ اسی مقام پر نبی اکرم ﷺ اور مشرکین قریش کے مابین وہ صلح ہوئی جو تاریخ میں ''صلح حدیبیہ'' کے نام سے موسوم ہے اور جسے قرآن حکیم نے سورۃ الفتح میں ''فتح مبین'' قرار دیا ہے۔

گفت و شنید کے بعد جب طے ہوا کہ صلح نامہ تحریر کرلیا جائے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے صلح نامہ تحریر (dictate) کرانا شروع کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کاتب کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سہیل بن عمرو نے فوراً ٹوک دیا کہ نہیں! ہم ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے واقف نہیں ہیں' ہم تو ہمیشہ "باسمك اللّٰھم" استعمال کرتے رہے ہیں' لہٰذا یہی الفاظ لکھے جائیں گے' ہم آپ کے الفاظ 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں --- حضور ﷺ نے فرمایا ''ٹھیک ہے' لکھ دو بِاسْمِكَ اللّٰھُمَّ کوئی فرق واقع نہیں ہوتا''۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ لکھو کہ ''یہ وہ صلح ہے جو محمدؐ رسول اللہ (ﷺ) اور قریش کے مابین منعقد ہوئی۔'' سہیل بن عمرو نے فوراً دوسرا اعتراض جڑ دیا کہ ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ نہیں لکھے جاسکتے۔ اس لیے کہ اسی بناء پر تو ہمارا سارا تنازع ہے۔ ظاہر ہے' صلح نامہ کے نیچے فریقین کے دستخط ہوں گے تو یہ پوری عبارت گویا دونوں کے مابین متفق علیہ ہوگی' اور اس میں اگر آپؐ کا نام رسول اللہ ﷺ لکھا ہوا ہے تو گویا ہم نے آپ کو اللہ کا رسول مان لیا۔ پھر تو ہمارے اور آپ کے مابین کوئی جھگڑا اور کوئی تنازعہ ہی باقی نہ رہا۔ پھر صلح کا کیا سوال! پس آپؐ کے نام کے لیے ''رسول اللہ'' نہیں لکھا جائے گا۔'' سہیل بن عمرو کے اس اعتراض سے اندازہ ہوتا ہے وہ کتنے ذہین اور مدبر شخص تھے —— نبی اکرم ﷺ نے اس اعتراض پر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم مانو یا نہ مانو' میں اللہ کا رسول ہوں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''علی! محمدؐ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھ دو۔'' (ﷺ)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں عرض کیا کہ ''حضور ﷺ! یہ کام میں نہیں کر سکتا''۔ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کی حکم عدولی کر رہے ہیں۔ حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا دو اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نہیں مٹا سکتا۔ مگر ایسا ہرگز نہیں' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو حضور ﷺ کا نام لکھنے کے بعد اسے مٹانا سوءِ ادب خیال کرتے تھے۔ بہر حال حضور ﷺ نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کہاں ہیں وہ الفاظ؟ کیونکہ آپؐ تو اُمّی تھے۔ دنیوی طور پر لکھنا پڑھنا آپؐ نے نہیں سیکھا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ مقام بتایا اور حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک سے وہ الفاظ مٹا دیئے۔ پھر وہاں لکھا گیا کہ یہ معاہدہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب اور قریش کے مابین طے پایا۔

**صلح حدیبیہ کی شرائط اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اضطراب:** اس معاہدہ کی بعض شرائط نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بظاہر نہایت سبکی کا باعث اور توہین آمیز تھیں۔ سہیل نے سب سے پہلے تو یہ شرط پیش کی کہ ہم یہ برداشت کر ہی نہیں سکتے کہ اس سال مسلمان عمرہ کریں۔ اس سال عمرہ کرنے کی اجازت دینے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ پورے عالم عرب میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ محمد (ﷺ) کی بات پوری ہو گئی اور قریش کو جھکنا پڑا اور ہتھیار ڈالنے پڑے۔ لہٰذا اس سال تو آپؐ کو یہیں سے واپس جانا ہوگا۔ البتہ اگلے سال آپؐ تشریف لے آیئے' ہم تین دن کے لیے مکہ کو خالی کر دیں گے' ہم پہاڑوں پر چلے جائیں گے اور مکہ آپؐ کی disposal پر ہوگا۔ آپؐ وہاں رہیے اور عمرہ کیجیے' مکہ والے وہاں رہیں گے ہی نہیں' تاکہ کوئی شخص جذبات سے مشتعل ہو کر کوئی اقدام نہ کر بیٹھے۔ اس تصادم کے امکان کو بھی روک دیا جائے گا۔ البتہ آپؐ کے ساتھ تلواریں اگر ہوں گی تو وہ نیام میں ہوں گی اور نیام بھی تھیلوں میں بند ہوں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ تلواریں نیام میں ساتھ لٹکی ہوئی ہوں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ دس سال تک ہمارے اور آپؐ کے مابین بالکل امن رہے گا' کوئی جنگ نہیں ہوگی۔ تیسری شرط یہ طے ہوئی کہ عرب کے دوسرے قبائل میں سے جو چاہے ہمارا حلیف بن جائے اور جو چاہے آپؐ کا حلیف بن جائے۔ فریقین کے حلیف بھی امن و امان سے رہیں گے اور ان کے مابین بھی جنگ و جدال بالکل نہیں ہوگی۔۔۔۔ بنوخزاعہ کے سردار بدیل بن ورقہ نے وہیں پر اعلان کیا کہ ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں۔ ایک دوسرا قبیلہ بنوبکر' جس کو بنوخزاعہ سے پرانی دشمنی تھی' اس نے فوراً دوسرا رخ اختیار کر لیا کہ ہم اس معاہدہ کی رو سے قریش کے

حلیف ہیں --- معاہدہ کی چوتھی شرط مسلمانوں کے لیے بظاہر بہت توہین آمیز اور دل آزاری کا باعث تھی۔ وہ یہ کہ اگر مکہ کا کوئی شخص اپنے والی یا سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا تو مسلمانوں کو اِسے واپس لوٹانا ہوگا' لیکن مدینہ سے اگر کوئی شخص مکہ آ جائے گا تو اسے ہم واپس نہیں کریں گے۔ یہ بڑی غیر منصفانہ (un-equal) شرط تھی جس پر سہیل بن عمرو کا اصرار تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر بڑے جز بز ہوئے اور ان کے جذبات میں جوش و ہیجان پیدا ہوا کہ ہم یہ صورت کیوں گوارا کر رہے ہیں؟ ہم دب کر اور گر کر کیوں صلح کریں؟ ہم اِس وقت چودہ سو کی تعداد میں موجود ہیں اور ہمیں تو شہادت کی موت مطلوب ہے' ہم بیعت علی الموت کر چکے ہیں اور ہم سب کے سب کلمۂ حق کے لیے اپنی گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہی نہیں' بے تاب ہیں۔ لہٰذا ہم ان شرائط پر صلح کیوں کریں جو سہیل منوانا چاہتے ہیں؟ یہ بظاہر احوال گر کر اور دب کر صلح کرنے کے مترادف معاملہ تھا--- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے یہ جذبات تھے لیکن سب کے سب مہر بلب تھے۔

یہ معاہدہ ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ اِس دوران سہیل ابن عمرو کے بیٹے ابو جندل جو ایمان لے آئے تھے اور اِس کی پاداش میں گھر میں لوہے کی زنجیروں میں باندھے ہوئے تھے' انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قریب آئے ہوئے ہیں' اور چند میل کے فاصلے پر حدیبیہ میں ہیں' تو انہوں نے جیسے تیسے اپنی زنجیریں تڑوائی' اور بیڑیوں سمیت حدیبیہ آ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں گر پڑے۔ سہیل نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاہدہ ہو چکا ہے' لہٰذا اسے واپس کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ابو جندل تم جاؤ۔ وہ رو پڑے۔ فریاد کی' مسلمانو' مجھے پھر بھیڑیوں کے حوالے کر رہے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا' دیکھو بیٹا' ہم معاہدہ کر چکے ہیں۔ ہمارے ہاتھ بندھ چکے ہیں۔

یہ وہ لمحات ہیں جن کے متعلق ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبات کا کیا عالم ہوگا! یہ وہ وقت ہے کہ دینی حمیت و غیرت کے باعث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب اتنا بڑھا کہ ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ مکالمہ کیا جو سیرت کی تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قدرت کی طرف سے جلالی طبیعت ودیعت ہوئی تھی۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد آپؓ کی اس کیفیت میں کافی اعتدال آ گیا تھا لیکن کبھی کبھار دین کی حمیت کے باعث اس جلالی طبیعت کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ دراصل یہی سبب تھا کہ انہوں نے ذرا تیکھے انداز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقع پر گفتگو کی' جس کا ان کو ساری عمر تاسف رہا اور انہوں نے اپنے اس انداز گفتگو کے کفارہ

کے طور پر نہ معلوم کتنی نفلی عبادات کی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا ''حضور ﷺ کیا آپؐ حق پر نہیں ہیں اور کیا آپؐ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟'' نبی اکرم ﷺ نے مسکراتے ہوئے جواب میں ارشاد فرمایا: ''یقیناً میں حق پر ہوں اور میں اللہ کا نبی ہوں۔'' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ''حضور ﷺ! پھر ہم اس طرح کا معاملہ کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اللہ ہمارے ساتھ نہیں ہے؟؟'' حضور ﷺ نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا ''اللہ میرے ساتھ ہے اور میں اس کا نبی ہوں اور میں وہی کچھ کر رہا ہوں جس کا مجھے حکم ہے''۔ نبی اکرم ﷺ کا تبسم کے ساتھ جوابات کا انداز بتا رہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس انداز تخاطب سے آپؐ قطعاً ناراض نہیں ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے جوابات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ سے تو مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی، لیکن طبیعت میں جو ایک تلاطم، ایک طوفان اور ایک ہیجانی کیفیت تھی وہ کسی قدر برقرار رہی۔ چنانچہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے جو اس وقت اس خیمہ میں موجود نہیں تھے۔ انؓ سے بھی اسی نوع کا مکالمہ ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ''کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اور کیا محمد ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟'' انہوں نے فرمایا کہ ''کیوں نہیں، یقیناً ہم حق پر ہیں اور حضور اللہ کے رسول ہیں''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر وہی بات کہی جو حضور ﷺ سے عرض کر چکے تھے کہ ''پھر یہ کیا ہو رہا ہے اور ہم کیوں دب کر صلح کر رہے ہیں؟'' اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں بعینہٖ وہی الفاظ کہے کہ ''بے شک ہم حق پر ہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپؐ وہی کرتے ہیں جس کا آپؐ کو حکم ہوتا ہے''۔ یہ ہے مقام صدیقیت —— اور یہ کہ نبی اور صدیق کے مزاج میں بہت قرب ہوتا ہے۔

صلح ہو جانے کے بعد نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ''اب اُٹھو، قربانی کے لیے جو جانور ساتھ لائے ہو ان کی یہیں پر قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو۔'' اس وقت مسلمانوں کے جذبات کا جو عالم تھا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا —— یہ سیرت کا عجیب مقام ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک شخص بھی نہیں اُٹھا۔ جذبات کی یہ کیفیت تھی کہ گویا ان کے اعصاب و اعضاء بالکل شل ہو گئے اور ان میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی، ان کے دل اس درجہ بجھے ہوئے تھے۔ ان کا جوش و خروش تو یہ تھا کہ وہ جاں نثاری اور سرفروشی دکھائیں اور اللہ کے دین کی راہ میں گردنیں کٹوا کر سرخرو ہو جائیں۔ روایات میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کچھ ملول ہو کر اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے، اور حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کیا کہ میں نے مسلمانوں سے تین مرتبہ کہا کہ ''اُٹھو، قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو۔ لیکن کوئی ایک شخص

بھی نہیں اُٹھا'' --- اس پر انہوں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ آپ زبان سے کچھ نہ فرمائیے' آپ خیمہ سے باہر تشریف لے جائیے' قربانی دیجئے' اور حلق کرا کے احرام کھول دیجئے ---- نبی اکرم ﷺ نے اس مشورہ پر عمل کیا' باہر تشریف لائے' قربانی دی' سر کے بال منڈوائے اور اِس کے بعد احرام کھول دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو اب سب کے سب کھڑے ہو گئے' اور جو ہدی کے جانور ساتھ لائے تھے انہوں نے قربانیاں دیں اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حلق یا قصر کرایا اور احرام کھول دیئے۔

اس صورت حال کی تاویل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ابھی تک ایک حالتِ منتظرہ طاری تھی۔ وہ اس خیال میں تھے کہ شاید صورت حال بدل جائے۔ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئی وحی آ جائے!! --- جب تک یہ صورت سامنے نہیں آئی کہ نبی اکرم ﷺ نے خود قربانی دینے اور حلق کرانے کے بعد احرام کھول دیا تو اُس وقت تک ان کے ذہنوں میں صورت حال کی تبدیلی کا ایک امکان برقرار تھا کہ جس کے وہ شاید انتظار میں تھے۔ لیکن جب نبی ﷺ نے احرام کھول دیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جان گئے کہ یہی آخری فیصلہ ہے۔ چنانچہ حالت منتظرہ ختم ہو گئی اور سب نے احرام کھول دیئے۔ عمرہ کی جو نیت کی ہوئی تھی اسے اگلے سال کے لیے مؤخر کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ سے مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔

<u>صلح حدیبیہ کے اثرات ونتائج</u>: معاہدہ حدیبیہ کے اہم واقعہ کو قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا۔ چنانچہ حدیبیہ سے واپسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۝۱﴾ (الفتح) ''بے شک ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کے لیے تابناک اور کھلی فتح کا فیصلہ فرمایا''۔ صلح حدیبیہ کو رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے ضمن میں ایک نہایت اہم موڑ (turning point) کی حیثیت حاصل ہے۔ درحقیقت اس معاہدۂ صلح کا مطلب یہ تھا کہ قریش نے نبی اکرم ﷺ کو ایک ''طاقت'' کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ سیاسیات اور بین الاقوامی معاملات میں دراصل یہی بات فیصلہ کن ہوتی ہے کہ کسی فریق کی قانونی و آئینی حیثیت تسلیم کر لی جائے۔ یہ اس کے لیے ایک بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے اُس فریق کو بہت سے حقوق و تحفظات حاصل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر عربوں نے طویل عرصے تک یہود کے ساتھ ایک میز پر بیٹھنا تو کجا ایک کمرے میں بیٹھنا بھی قبول نہ کیا تھا' لیکن اب وہ ایک ایک کر کے اسرائیل کو تسلیم کر رہے ہیں۔ بہرکیف قریش کی طرف سے مصالحت پر آمادہ ہو جانے اور نبی اکرم ﷺ کے

ساتھ تحریری شکل میں صلح کا معاہدہ کر لینے کا مطلب تھا کہ گویا قریش نے یہ تسلیم کر لیا کہ محمد (ﷺ) عرب کی ایک سیاسی اور عسکری طاقت ہیں' جن سے انہوں نے صلح کا معاہدہ کیا ہے۔ یعنی قریش کو تسلیم کرنا پڑا کہ محمد (ﷺ) اب ایک ایسی طاقت ہیں جنہیں تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ اس صورت حال کے پس منظر میں مدینہ منورہ کی واپسی کے سفر کے دوران سورۃ الفتح کی درج ذیل آیات نازل ہوئیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ﴾ (آیت:۱۰)

''بے شک جو لوگ (اے محمد ﷺ) آپؐ سے بیعت کرتے ہیں وہ (درحقیقت) اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ کے اوپر......''

اور

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾﴾

''(اے نبیؐ) تحقیق اللہ راضی ہو گیا ایمان والوں سے جب وہ بیعت کرنے لگے آپؐ سے درخت کے نیچے۔ اور جو (صدق وخلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا۔ تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی۔''

آیت ۲۷ میں فرمایا:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ﴾

''بے شک اللہ نے سچ کر دکھایا اپنے رسول کو خواب حق کے ساتھ۔ تم لازماً داخل ہو کر رہو گے مسجد حرام میں اگر اللہ نے چاہا آرام سے اپنے سروں کے بال مونڈتے اور کترتے ہوئے' بے کھٹکے......''

جب یہ آیات نازل ہوئیں اور اہل ایمان کے سامنے ان کی تلاوت کی گئی تو ان آیات نے گویا ان کے زخمی دلوں پر مرہم کے پھاہے کا کام کیا۔ اہل ایمان جس چیز کو اپنے خیال میں شکست سمجھتے تھے' اللہ تعالیٰ نے اس کو فتح مبین قرار دیا۔ اس سے مسلمانوں کے دل مسرت وشادمانی سے باغ باغ ہو گئے۔

اس صلح کے بعد نبی اکرم ﷺ کو یکسو ہو کر اپنی دعوتی سرگرمیوں پر پوری توجہ دینے کا موقع مل گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ اصحاب صُفّہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی' حضور ﷺ نے ان

کے وفود بنا بنا کر مختلف قبائل کی طرف بھیجنے شروع فرمائے۔ مزید برآں اب تک مسلمانوں اور مشرکین کا آپس میں کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس صلح کے بعد یہ روک ٹوک اُٹھ گئی تو آمد ورفت شروع ہوئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات و روابط کی وجہ سے کفار مکہ مدینہ منورہ آتے' وہاں طویل عرصہ تک قیام کرتے۔ اس طرح مسلمانوں سے میل جول رہتا اور باتوں باتوں میں اسلام کی دعوتِ توحید اور دیگر عقائد و مسائل کا تذکرہ ہوتا اور ان پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ ہر مسلمان اخلاص اور حسن عمل کا پیکر' نیکوکاری' حسن معاملات اور پاکیزہ اخلاق کی زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکہ جاتے تھے' ان کی صورتیں' ان کے اعمال' ان کے اخلاق اور ان کے معاملات یہی مناظر پیش کرتے۔ ان اوصاف کی وجہ سے مشرکین مکہ کے دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچے چلے آتے۔ الغرض' اس صلح کے نتیجہ میں اسلام جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما جیسے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ مؤرخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ اس صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ اس سے قبل نہیں لائے تھے۔

صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے ''فتح مبین'' قرار دیا ہے' لیکن یہ اجسام کی نہیں قلوب کی فتح و تسخیر تھی۔ اس مرحلہ پر اسلام کو اپنی دعوت کی اشاعت کے لیے امن درکار تھا جو اس صلح سے حاصل ہو گیا۔ دعوتِ توحید کی وسعت کو دیکھ کر خود قریش یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ ہماری شکست اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی فتح ہے۔ اس صلح کے ثمرات و فوائد بہت سے ہیں' مختصراً یہ کہ درحقیقت صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ کی تمہید بنی۔ نبی اکرم ﷺ کو ٦ھ سے ٨ھ تک امن و سکون کے جو دو سال ملے' اِن میں توحید کی انقلابی دعوت نے نہایت سرعت کے ساتھ وسعت اختیار کی اور مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت فراہم ہو گئی۔

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر متعدد سلاطین کو اپنے دعوتی مکتوبات ارسال فرمائے۔ اس سے پہلے آپؐ نے بیرون عرب نہ کوئی نامہ مبارک لکھا اور نہ ہی کوئی ایلچی بھیجا۔ حضور ﷺ کی تمام دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں جزیرۂ نمائے عرب کے اندر اندر تھیں' لیکن صلح حدیبیہ کے بعد حضور ﷺ نے دعوتی سرگرمیاں عرب کی حدود سے باہر بھی شروع فرمائیں اور آپؐ نے مختلف صحابہؓ کو ایلچی بنا کر عرب کے اطراف و جوانب میں تمام سربراہانِ سلطنت کی جانب بھیجا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔ دوسرے لفظوں میں صلح حدیبیہ کے بعد حضور ﷺ کی دعوتی سرگرمیاں دو شاخوں میں بٹ گئیں۔ ایک

اندرونِ ملک عرب اور دوسری بیرونِ ملک عرب—— آخر الذکر مرحلہ انقلاب محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا تیسرا مرحلہ ہے۔

## یہودِ خیبر کی طاقت کا قلع قمع

جب قریش سے حدیبیہ کے مقام پر دس سال کے لیے صلح ہوگئی اور رسول اللہ ﷺ کو اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو ۶ ھ کے اواخر میں آپؐ نے جزیرہ نمائے عرب میں یہود کی اس طاقت کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ فرمایا جو خیبر کے مقام پر مجتمع ہوگئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے کوشش فرمائی کہ یہودِ خیبر سے کوئی معاہدہ ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ نے صلح حدیبیہ سے پہلے اور بعد میں کئی سفارتی وفود اُن کے پاس بھیجے لیکن وہ اپنے ارادوں سے باز نہیں آئے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے چھاپہ مار دستے مدینہ کے باہر متفرق چھوٹی چھوٹی آبادیوں پر حملے کرتے اور غارت گری کے بعد بھاگ جاتے۔ بالآخر نبی اکرم ﷺ نے ان کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے غرض سے ذوالحجہ ۶ ھ میں مسلمانوں کے ایک لشکر کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ فرمایا۔ لیکن خیبر کا معرکہ ۷ ھ کے اوائل میں پیش آیا' کیونکہ اس غزوہ نے کافی طول کھینچا۔ خیبر میں یہود کی بڑی قوت مجتمع تھی' جہاں یکے بعد دیگرے ان کے بڑے مضبوط قلعے تھے۔ چنانچہ ہر قلعہ پر زبردست جنگ ہوئی۔ آخری مضبوط ترین قلعہ (قموص) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ یہود کے بڑے بڑے سردار اِن معرکوں میں مارے جا چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کامل شکست تسلیم کر لی۔ اہل اسلام نے فتح کے بعد مفتوحہ علاقہ پر قبضہ کر لیا' البتہ یہود کی درخواست پر زمین ان کے قبضہ میں اس شرط کے ساتھ رہنے دی گئی کہ وہ پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کیا کریں گے۔ چنانچہ جب بٹائی کا وقت آتا' نبی اکرم ﷺ اپنے کسی صحابیؓ کو بھیجتے' جو آکر غلہ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہا کرتے تھے کہ انتخاب کا حق تمہیں حاصل ہے' جو حصہ چاہو تم لے لو۔ یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ ''زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہیں۔''

غزوۂ خیبر پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلموں کو رعایا بنایا گیا۔ گویا صلح حدیبیہ اور یہود کا رعیت کی حیثیت قبول کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اسلامی طرزِ حکومت کی بنیاد بھی قائم ہوگئی اور اس کا عملی ظہور بھی شروع ہوگیا——حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت کے آغاز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نبی اکرم ﷺ مرضِ وفات میں وصیت فرما گئے تھے کہ یہود جزیرہ نمائے عرب میں رہنے نہ پائیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مدعیانِ نبوت' مانعینِ زکوٰۃ اور فتنۂ ارتداد سے کامل طور

پر نمٹنے میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے اس معاملہ کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ اگر چہ خلافت صدیقیؓ کے دَور ہی میں یہ تمام فتنے ختم ہو چکے تھے' لیکن ساتھ ہی توحید کی اس انقلابی دعوت کی توسیع کے عمل کا بیرونِ عرب آغاز ہو چکا تھا اور قیصر و کسریٰ سے باقاعدہ لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جزیرہ نمائے عرب سے یہود کے مکمل اخراج کا معاملہ دورِ خلافت صدیقیؓ کی بجائے دَورِ خلافت فاروقیؓ کے آغاز میں شروع ہوا اور ایک قلیل عرصہ میں تمام یہود جزیرہ نمائے عرب سے جلاوطن کر دیئے گئے۔ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوئی اور ان کو کامل آزادی دی گئی کہ وہ اپنا جملہ منقولہ ساز و سامان ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب یہود جیسی سازشی قوم کے وجود سے پاک ہو گیا۔

## عمرۂ قضا کی ادائی

ذیقعدہ ۷ھ میں نبی اکرم ﷺ نے عمرۂ قضا ادا فرمایا۔ آپؐ نے اعلان کرادیا کہ جو اصحاب پچھلے سال حدیبیہ میں موجود تھے ان میں سے کوئی رہ نہ جائے' سب کے سب چلیں۔ چنانچہ اس دوران جو لوگ فوت ہو گئے تھے ان کے سوا سب نے آپؐ کی پکار پر لبیک کہا اور عمرے کی سعادت حاصل کی۔ صلح حدیبیہ میں طے شدہ شرائط کے مطابق نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جلو میں حالتِ احرام میں مکہ تشریف لائے۔ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بآوازِ بلند تلبیہ کہتے ہوئے حرم شریف کی طرف بڑھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے اونٹ کی مہار پکڑے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔ ان اشعار کو امام ترمذیؒ نے شمائل میں نقل کیا ہے:

خلّوا بنی الکفّار عن سبیله
الیوم نضربکم علیٰ تنزیله
ضرباً یزیل الهام عن مقیله
ویذهل الخلیل عن خلیله

''کافرو! آج سامنے سے ہٹ جاؤ۔ آج تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے۔ وہ وار جو سر کو خوابگاہِ سر سے الگ کر دے اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جم غفیر تھا اور وہ کعبہ شریف کی دید سے شاد کام ہو رہے تھے اور عمرہ ادا

کرنے کی تمنا و آرزو کو پورے جوش و خروش اور چشم تر سے بجالا رہے تھے۔ شرط کے مطابق حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم تین دن تک مکہ میں مقیم رہے۔ قریش کے تمام بڑے بڑے لوگ مکہ سے نکل گئے کہ نہ ہم اہل ایمان کو دیکھیں نہ ہمارا خون کھولے اور نہ اس کے نتیجے میں کوئی تصادم اور حادثہ وقوع پذیر ہو۔ لہٰذا وہ سب کے سب پہاڑوں پر چلے گئے۔

حقیقی نہیں تو معنوی طور پر یہ قریش کی زبردست شکست تھی اور حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ادائے عمرہ سے ان کی ساکھ کو بڑا شدید نقصان پہنچا تھا۔ کیونکہ اُس وقت صورت حال یہ تھی کہ اگرچہ عرب میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی لیکن پورے عرب کی سیاسی' مذہبی اور معاشی سیادت و قیادت قریش کے ہاتھ میں تھی۔ گویا باقاعدہ اور تسلیم شدہ نہ سہی لیکن بظاہر احوال درحقیقت (de facto) قریش کو پورے عرب پر ایک نوع کی حکمرانی حاصل تھی۔ اگرچہ کوئی باضابطہ اعلان شدہ (declared) حکومت نہیں تھی اور کوئی تحریری معاہدہ یا دستور و آئین موجود نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہاں قبائلی نظام تھا' لیکن قدیم روایات موجود تھیں جس کے مطابق معاملہ چل رہا تھا۔

## فتح مکہ اور اُس کا پس منظر

صلح حدیبیہ کے موقع پر ہی بنوخزاعہ نبی اکرم ﷺ کے حلیف بن گئے تھے اور ان کے حریف بنوبکر قریش کے حلیف ہو گئے تھے۔ بنوبکر نے صلح حدیبیہ کے قریباً دو سال بعد بنوخزاعہ پر رات کی تاریکی میں اچانک حملہ کر دیا۔ قریش کے چند بڑے بڑے سرداروں نے بھی بھیس بدل کر بنوبکر کا ساتھ دیا اور اس طرح اس حملے کے نتیجے میں بنوخزاعہ کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ بنوخزاعہ نے حرم میں پناہ لی' لیکن بنوبکر کے رئیس نوفل کے اکسانے پر وہاں بھی انہیں نہیں چھوڑا گیا اور عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔ اس پر بنوخزاعہ کے چالیس افراد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ مسجد نبویؐ میں رونق افروز تھے۔ انہوں نے دہائی دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے' اب صلح حدیبیہ کی رُو سے اے محمد (ﷺ) آپؐ اس کے پابند ہیں کہ ہمارا بدلہ بنوبکر اور قریش سے لیں۔

نبی اکرم ﷺ کو یہ واقعات سن کر سخت رنج ہوا۔ تاہم حضور ﷺ نے قریش پر حجت قائم کرنے کے لیے ان کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرائط پیش کیں: (۱) مقتولوں کا خون بہا ادا کر دو۔ (۲) اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو بنوبکر کی حمایت سے الگ ہو جاؤ تاکہ ہم بنوخزاعہ

کے ساتھ مل کر بنو بکر سے بدلہ لے لیں۔ (۳) اگر یہ بھی منظور نہیں ہے تو اعلان کر دو کہ صلح حدیبیہ ختم ہوگئی۔ قریش کے مشتعل مزاج اور جنگ پسند لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کے قاصد کی زبانی آپؐ کی شرائط سنتے ہی فوراً کہا کہ ہمیں تو صرف تیسری شرط منظور ہے۔ بس آج سے صلح حدیبیہ ختم!! حضور ﷺ کے ایلچی یہ جواب سن کر مدینہ واپس چلے گئے۔

جوشیلے لوگوں نے صلح حدیبیہ کے خاتمہ کا اعلان تو کر دیا‘ مگر قریش کے مدبر اور صلح پسند لوگوں کو غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اب محمد ﷺ کی طاقت کتنی ہے اور قریش کا حال کیا ہے! ان کی پختہ رائے یہ تھی کہ قریش کسی صورت میں بھی اب اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا مقابلہ کر سکیں۔ ابوسفیان نے‘ جسے قریش کے سردار کی حیثیت حاصل تھی جلد ہی محسوس کر لیا کہ چند جوشیلے لوگوں سے جذبات میں آ کر بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے‘ اگر ہم نے صلح حدیبیہ کی تجدید نہ کرائی تو پھر قریش کے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔ چنانچہ وہ خود چل کر تجدید صلح کی درخواست لے کر مدینہ گیا‘ لیکن بارگاہِ رسالت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اِس پر مسجد نبویؐ میں جا کر اُس نے خود ہی تجدید صلح کا یک طرفہ اعلان کر دیا کہ میں قریش کا سردار ابوسفیان صلح حدیبیہ کی تجدید کرتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا‘ لیکن یہ اعلان کر کے وہ فوراً اپنے اونٹ پر سوار ہو کر واپس مکہ روانہ ہوگیا۔

اہل مکہ کے لیے اب عجیب صورتحال تھی۔ وہ شش و پنج میں تھے کہ ابوسفیان جو کچھ کر کے آئے ہیں اسے کیا سمجھا جائے! اِدھر نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں تیاریاں کرنے کا حکم دے دیا اور اپنے حلیف قبائل کے پاس قاصد بھیج دیئے کہ تیار ہو کر مدینہ آ جائیں۔ لیکن احتیاط یہ کی گئی کہ اعلان نہیں فرمایا کہ مکہ کا قصد ہے۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر حضور ﷺ کے ہمرکاب تھا۔ یہ رمضان ۸ ھ کا واقعہ ہے جبکہ واقعہ ہجرت کو دس برس اور مسلح تصادم (armed conflict) کے مرحلے کو شروع ہوئے صرف چھ سال بیتے تھے۔

سیرتِ مطہرہ میں بہت سے غزوات اور سرایا کا ذکر ملتا ہے لیکن ان تمام جنگوں میں جانی نقصان مجموعی طور پر چند سو سے زیادہ نہیں ہوا۔ کفار کی طرف سے جو لوگ قتل ہوئے اور مسلمانوں کی طرف سے جو شہید ہوئے ان کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اگرچہ کئی بار خوں ریزی ہوئی‘ لیکن اموات کی گنتی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک غیر خونیں (bloodless) انقلاب تھا۔ سب سے زیادہ خون ریزی اگر ہو سکتی تو فتح مکہ کے

وقت ہوتی۔ اس لیے کہ جو خون کے پیاسے تھے' جو جانی دشمن تھے' وہ سب کے سب مکہ میں موجود تھے۔ ان میں وہ وحشی بھی تھا جس کے دھوکہ سے پھینکے ہوئے برچھے پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تھے' ان میں وہ ہندہ زوجہ ابوسفیان بھی تھی کہ جس نے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کا مثلہ بھی کرایا تھا اور آپؓ کے کلیجہ چبانے کی کوشش بھی کی تھی۔ چنانچہ اُس وقت مکہ والوں کو یہ اندیشے لاحق تھے کہ اب کیا ہوگا! ان پر شدید خوف اور اضطراب طاری تھا۔

دس ہزار قدسیوں اور جان نثاروں کے جلو میں جب کوکبِ نبویؐ نہایت عظمت و شان کے ساتھ مکہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہوا تو تحقیق کے لیے قریش کی طرف سے ابوسفیان' حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقہ چھپ چھپا کر اہل ایمان کے لشکر تک پہنچے۔ ابوسفیان کو مسلمانوں نے پہچان لیا اور گرفتار کر کے دربارِ رسالت میں پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیمہ میں آ کر عرض کیا کہ حضور! اللہ اور اس کے رسول کے اس دشمن کے قتل کا حکم دیجیے' تاکہ کفر کے بالکل استیصال کا آغاز ہو جائے۔ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے جان بخشی کی درخواست کی — ابوسفیان کا سابقہ کردار اور ان کی اسلام دشمنی سب کے سامنے عیاں تھی۔ ان کا ایک ایک فعل انہیں قتل کے مستوجب ثابت کرتا تھا۔ لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز تھی اور وہ تھی حضور ﷺ کی رافت' رحمت اور عفو کا جوہر جو ابوسفیان کو دل ہی دل میں اطمینان دلا رہا تھا کہ خوف کا مقام نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے اخلاق حسنہ سے دل پہلے سے گھائل تھا۔ حق کا بول بالا اور اسلام کی فتح و سربلندی نگاہوں کے سامنے تھی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اُن کے جگری دوست تھے' ان کی ترغیب اور ان تمام چیزوں نے اس آہنی چٹان کو پگھلا دیا اور وہ بالآخر دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے اور مؤمن صادق ثابت ہوئے۔

علی الصبح جب لشکر اسلام مکہ کی طرف بڑھا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو تاکہ وہ افواجِ الٰہی کا جلال اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ نیز مکہ میں داخل ہوتے ہی اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر میں پناہ لے گا یا حرمِ کعبہ میں داخل ہو جائے گا تو اس کو امن دیا جائے گا۔ اہلِ ایمان کی فوجیں الگ الگ پرچموں تلے نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتی ہوئی مکہ کی طرف بڑھ رہی تھیں اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ان کو دیکھ دیکھ کر محو حیرت تھے۔ جب انصار کے قبیلہ خزرج کا لشکر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں گزرا جن کے ہاتھ میں علم تھا اور

انہوں نے ابوسفیان کو دیکھا تو بے اختیار پکار اُٹھے:

اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَةِ
اَلْیَوْمَ تَسْتَحِلُّ الْکَعْبَةُ

(آج خون بہانے کا دن ہے۔آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔)

مختلف لشکروں کے پیچھے کوکب نبویؐ نمودار ہوا۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی نظر جب جمال مبارک پر پڑی تو پکار اُٹھے کہ حضور ﷺ! آپؐ نے سنا کہ سعد یہ کہتے ہوئے گزرے ہیں کہ "الیوم یوم الملحمة ۔ الیوم تستحل الکعبة" نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں، سعد نے صحیح نہیں کہا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ

اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَرْحَمَةِ
اَلْیَوْمَ تُعْظَمُ فِیْهِ الْکَعْبَةُ (۱)

(آج کا دن رحمت کا دن ہے اور آج کا دن وہ دن ہے جس میں کعبہ کی تعظیم کی جائے گی۔)

اللہ کی شان دیکھئے، جس مکہ میں آٹھ سال قبل حضور ﷺ کے قتل کا فیصلہ ہو گیا تھا اور جہاں سے نبی اکرم ﷺ نے راتوں رات چھپ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی، پھر غارِ ثور میں تین دن پناہ لینی پڑی تھی جس کے دہانے تک کھوجی کفارِ مکہ کو لے آئے تھے اور جہاں سے اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر حضور ﷺ کو بچایا تھا اور آپؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اضطراب دیکھ کر ان سے وہ جملہ فرمایا تھا جو توکل علی اللہ کا شاہکار ہے کہ: ((لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا))(۲) اسی مکہ میں آٹھ سال بعد رمضان المبارک ۸ھ میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بحیثیت فاتح داخل ہو رہے تھے۔ فرطِ تواضع اور عجز وانکساری کا یہ عالم تھا کہ روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ کی پیشانی مبارک گھوڑے کے ایال کو مس کر رہی تھی۔ زبان مبارک پر ترانۂ حمد جاری تھا۔ دنیا نے اس سے قبل ایسا کوئی فاتح نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ قیامت تک دیکھ سکے گی۔

رسول اللہ ﷺ انصار ومہاجرین کے جلو میں مسجدِ حرام کے اندر تشریف لائے، اُس وقت آپؐ کے دستِ مبارک میں ایک کمان تھی۔ وہ حرمِ محترم جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جیسے بُت شکن نے اللہ وحدہ لاشریک کی پرستش کے لیے تعمیر کیا تھا، اس کے آغوش میں تین سو ساٹھ بُت موجود تھے۔ لیکن اب رسول اللہ ﷺ کے لیے موقع تھا کہ اپنے جدِّ امجد کی سُنت کی تجدید فرمائیں۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب رکز النبی ﷺ۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب فضائل صحابہؓ، باب مناقب المہاجرین وفضلهم۔

چنانچہ حضور ﷺ ایک ایک بُت کو اپنی کمان سے ٹہو کے دے کر گراتے جاتے اور زبان مبارک سے پڑھتے جاتے تھے:

﴿ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿٨١﴾ ﴾ (بنی اسرائیل)

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا' اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔''

چند دنوں بعد اُن تمام بتوں کو بھی پاش پاش کرا دیا گیا جن کے استھان اطرافِ مکہ میں مختلف مقامات پر قائم تھے۔ اس طرح عرب میں اسلام کی انقلابی دعوتِ توحید کی تکمیل ہوگئی۔ شرک اور بُت پرستی کا طلسم ٹوٹ گیا اور شرک کی بنیاد پر قائم استحصالی نظام کا قلع قمع ہو گیا۔

خانہ کعبہ کی بتوں سے تطہیر کے بعد آپؐ نے اس کے اندر نماز ادا کی' پھر دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے اور مسجد حرام میں کھچا کھچ بھرے ہوئے قریش سے خطاب فرمایا۔ مکہ میں داخلہ کے بعد عرب کے بے تاج بادشاہ' سرورِ عالم' رحمۃٌ لِلعالمین ﷺ نے خلافتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو پہلا خطاب فرمایا' اس کے مخاطب درحقیقت صرف اہل مکہ ہی نہیں بلکہ سارا عالم تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

((لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ اَلَا كُلُّ مَاثَرَةٍ اَوْدَمٍ اَوْ مَالٍ يُدْعٰى فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ اِلَّا سُدَانَةَ الْبَيْتِ وَسِقَايَةَ الْحَاجِّ يَامَعْشَرَ قُرَيْشٍ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْاٰبَاءِ' اَلنَّاسُ مِنْ آدَمَ و آدَمُ مِنْ تُرَابٍ))

''ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور اس نے تنہا تمام جتھوں کو توڑ دیا۔ آگاہ ہو جاؤ! (اب) تمام مفاخر' تمام انتقامات' خون بہائے قدیم سب میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہے۔ اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔''

پھر آپؐ نے سورۃ الحجرات کی یہ آیت پڑھی:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿١٣﴾ ﴾

''اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے' تاکہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ۔ تحقیق اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ (اللہ کا) تقویٰ رکھتا ہو۔ (یعنی اس کے فرامین کی خلاف ورزی سے سب سے زیادہ بچتا ہو۔) بے شک اللہ دانا اور واقف کار ہے۔''

آپؐ کا یہ خطبہ نہایت مختصر تھا' مگر اس میں اسلام کی انقلابی دعوت و پیغام کے چند اہم اصول بیان ہو گئے۔ دین اسلام کا اصل الاصول توحید ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' کوئی حاکم نہیں' کوئی مقنن نہیں' کوئی دستگیر نہیں' کوئی خالق و مالک نہیں — لفظ ''الٰہ'' میں یہ تمام مفاہیم موجود ہیں۔ ساتھ ہی شرک جیسے اکبر الکبائر کی تردید بھی آ گئی۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا بیان بھی آ گیا۔ پرانی عداوتوں اور انتقام کی پُرزور مذمت بھی آ گئی۔ مفاخر قومی و نسبی کی بیخ کنی بھی ہو گئی۔ اور آپؐ نے جاہلیت کی ان تمام جہالتوں کے متعلق فرمادیا کہ ''میں نے ان تمام چیزوں کو پاؤں تلے کچل دیا۔'' ظہورِ اسلام سے پہلے عرب ہی نہیں تمام دنیا میں نسل' قوم اور خاندان کی تمیز کی بنا پر فرق و تفاوت اور امتیازات و مراتب قائم تھے۔ اسلام کا یہ احسان ہے کہ اس نے دنیا کو کامل مساوات کے اصول سے روشناس کرایا اور نبی اکرم ﷺ اور خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم نے اس اصول پر اسلامی حکومت کو عملاً چلا کر دنیا کے سامنے حجت پیش کر دی کہ نسل' رنگ' زبان' وطن' پیشے اور جنس کی بنیاد پر کوئی اونچا ہے نہ نیچا ہے' وحدتِ خالق اور وحدتِ آدم کی بنیاد پر سب برابر ہیں۔

خطبہ کے بعد فاتحِ مکہ ﷺ نے مجمع کی طرف دیکھا۔ جبارانِ قریش سامنے تھے۔ فرمایا کہ تمہارا کیا گمان ہے کہ میں آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ یہ لوگ اگرچہ شقی القلب' بے رحم اور ظالم تھے' لیکن مزاج شناس بھی تھے۔ لہٰذا بے اختیار پکار اُٹھے: اَخٌ كَرِيْمٌ وَابْنُ اَخٍ كَرِيْمٍ ''آپؐ شریف اور بامروت بھائی ہیں اور ایک شریف اور بامروت بھائی کے بیٹے ہیں۔'' رحمۃ للعالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: لَاتَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ(۱) ''آج تم پر کوئی سرزنش نہیں ہے'' اور ((اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ)) ''جاؤ تم سب آزاد ہو۔'' لیکن

(۱) تخریج الاحیاء للعراقی' ج ۳' ص ۲۲۔ الراوی سھیل بن عمرو رضی اللہ عنہ۔

چندلوگ ایسے بھی تھے جن کو معافی نہ دی گئی۔ اُن کے جرائم اِس قدر سنگین تھے کہ اُن کے متعلق یہ حکم تھا کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں۔

مکہ کے فتح ہو جانے سے اندرونِ ملک عرب انقلاب محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل ہوگئی۔ اور سورۃ الصّف میں جو غزوۂ احزاب اور سورۃ الاحزاب سے متصلاً بعد نازل ہوئی' میں دی گئی یہ بشارت ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ پوری ہوگئی۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر پختہ ایمان رکھنے والوں اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں اور اللہ کی راہ میں صفیں باندھ کر اس طرح قتال کرنے والوں کو جیسے سیسہ پلائی دیوار ہوں' آخرت میں لغزشوں اور خطاؤں کی مغفرت' دخول جنت اور جناتِ عدن کے پاکیزہ گھروں میں خلود وسکونت کے وعدوں کے ساتھ ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں اصل کامیابی ہے' اس دنیا میں بھی نصرتِ الٰہی اور فتح قریب کی نوید جاں فزا سنائی گئی تھی جو فطری اعتبار سے انسان کو بڑی محبوب ہوتی ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کی صورت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نگاہوں کے سامنے اس بشارت کا ظہور ہو گیا۔

قریش مکہ سے آپؐ کی چھ سالہ طویل جنگ ۱۷ رمضان المبارک سن ۲ ہجری کو شروع ہوئی اور ۱۰ رمضان المبارک ۸ ہجری کو فتح مکہ پر اختتام پذیر ہوئی۔ اس دوران بہت سے اتار چڑھاؤ آئے۔ مختلف غزوات میں سینکڑوں صحابہ ؓ کو جانوں کی قربانی دینی پڑی۔ غزوۂ احد میں حضور ﷺ خود بھی مجروح ہوئے اور دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے۔ تلوار کا وار چہرہ مبارک پر پڑا تو جو خود آپؐ پہنے ہوئے تھے' اس کی دو کڑیاں رخسار مبارک کی ہڈی کے اندر گھس گئیں۔ ایک صحابیؓ نے دانتوں سے پکڑ کر کھینچ کر نکالنا چاہا تو ان کے دانت اکھڑ گئے مگر وہ نہیں نکلیں۔ کسی طریقے سے انہیں نکالا گیا تو خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ اتنا خون بہا کہ آپؐ بے ہوش ہو کر گر گئے اور مشہور ہو گیا کہ حضور ﷺ شہید ہو گئے۔ ستر صحابہ کرام ؓ شہید ہوئے' جن میں حضرت حمزہ ؓ بھی شامل تھے۔ ان کے حضور ﷺ کے ساتھ کئی رشتے تھے ـــــ وہ آپ ﷺ کے چچا بھی تھے' خالہ زاد بھائی بھی اور دودھ شریک بھائی بھی۔ پھر وہ آپؐ کے بچپن کے ہم جولی اور دوست تھے۔ اور ان کی لاش اس حالت میں آئی کہ ناک کٹی ہوئی ہے' کان کٹے ہوئے ہیں' پیٹ چاک کر کے کلیجہ چبایا گیا ہے۔ لہٰذا یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ انقلاب برپا کرنے کا یہ کام گھر بیٹھے نہیں ہوا۔ اس کے لئے بڑی قربانیاں دی گئی ہیں۔ بہرحال چونکہ یہ کام

بھرپور تیاری کے بعد کیا گیا تھا' لہٰذا چھ سال کے عرصے پر محیط اس مسلح تصادم کا نتیجہ فتح مکہ کی صورت میں نکلا اور انقلابِ نبویؐ کی تکمیل ہوگئی۔ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۸۱)﴾

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ حنین' غزوۂ طائف وغیرہ جو جنگیں لڑیں' ان کی حیثیت ملٹری کی اصطلاح میں mopping-up operation کی تھی' جس کے ذریعے مخالف قوتوں کا آخری قلع قمع مقصود ہوتا ہے۔ فتح مکہ پر اندرونِ عرب انقلاب کی تکمیل ہوگئی۔

## جزیرہ نمائے عرب میں

# شرک کے مکمل قلع قمع کا آخری اقدام

مکہ فتح ہوجانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کا تدبر ملاحظہ کیجیے۔ اگرچہ آپؐ کو یہ پہلے سے اندازہ تھا کہ قریش میں بالکل دم خم نہیں ہے کہ وہ اسلامی فوج کا مقابلہ کرسکیں' ان کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا کوئی امکان ہی نہیں تھا' اسی وجہ سے آپؐ نے صلح کی تجدید سے اعراض فرمایا تھا — لیکن فتح مکہ کے بعد آپؐ نے ایسا نہیں کیا کہ وہاں کے پورے نظام کو یکسر بدل دیا ہو۔ اس کے بالکل برعکس آپؐ نے ان مختلف ذمہ داریوں کو جو قریش کے مختلف خاندانوں کے سربراہوں کی تحویل میں تھیں انہی کے سپرد رہنے دیا' قطع نظر اس سے کہ وہ ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں۔ آپؐ نے وہاں کے انتظامی معاملات کو قطعاً نہیں چھیڑا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اپنا کوئی امیرِ حج تک مقرر نہیں کیا کہ اب اس کی سرکردگی میں حج ہوگا' حالانکہ دو ماہ بعد حج ہونے والا تھا۔ بلکہ آپؐ نے نہایت نرم روش اختیار کی اور فتح مکہ کے بعد ذوالحجہ ۸ھ میں جو پہلا حج آیا وہ حسبِ سابق مشرکین ہی کے زیرِ انتظام و انصرام ہوا — صرف اس فرق کے ساتھ کہ مشرکین اپنے طریق سے حج کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے اُمتی موحدین اسلامی طریق پر حج کر رہے تھے۔

فتح مکہ کے دوسرے سال ۹ھ میں جب حج کا موقع آیا تو اس میں رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کی شرکت کی اجازت تو برقرار رکھی کہ وہ بھی حج کریں اور مسلمان بھی حج کریں' لیکن حج کے جملہ انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ حضور ﷺ حج کے لیے خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ آپؐ

نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر ان کے ہمراہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک قافلۂ حج بھیج دیا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارت میں قافلۂ حج روانہ ہو چکا تھا کہ چند دنوں بعد ہی سورۃ التوبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں' جو اِس بات کے اعلان کی حیثیت رکھتی ہیں کہ دراصل اندرونِ عرب انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اب اہل عرب میں سے مشرکین کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے۔ فرمایا:

﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ① فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ② وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ③ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ④ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑤ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑥﴾

''اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے مشرکوں سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا (اعلانِ) بیزاری ہے۔ تو (مشرکو تم) زمین میں چار مہینے چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہ کر سکو گے۔ اور یہ بھی کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اور حج اکبر کے دن اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی (ان سے دست بردار ہے)۔ پس اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر نہ مانو (اور اللہ سے مقابلہ کرو) تو جان رکھو کہ تم اللہ کو ہرا نہیں سکو گے۔ اور (اے پیغمبرؐ) کافروں کو دکھ دینے والے عذاب کی خبر سنا دو۔ البتہ

جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا ہو اور انہوں نے تمہارا کسی طرح کا قصور نہ کیا ہو اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی ہو تو جس مدت تک ان کے ساتھ عہد کیا ہو اسے پورا کرو (کہ) اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔ جب عزت کے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔ اور پکڑ لو اور گھیر لو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھے رہو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ کلام اللہ سننے لگے۔ پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو۔ اس لیے کہ یہ بے خبر لوگ ہیں۔''

قابلِ غور بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کی دو بعثتیں ہیں۔ ایک بعثتِ خصوصی جو اہلِ عرب (یعنی بنی اسمٰعیل) کی طرف ہے، جن میں سے نبی اکرم ﷺ خود تھے، جن کی زبان میں حضور ﷺ پر اللہ کا کلام نازل ہوا۔ دوسری بعثتِ عمومی ہے ''اِلَی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ'' یعنی پوری نوعِ انسانی کی طرف۔ یہ اس وقت موضوعِ بحث نہیں ـــــ البتہ جن کی طرف رسول اللہ ﷺ کی بعثت خصوصی تھی تو ان پر دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت، انذار و تبشیر، تذکیر و موعظت کے ذریعہ حضور ﷺ رسالت کی تمام ذمہ داریاں بنفسِ نفیس ادا فرما چکے تھے۔ اس طرح ان پر اتمامِ حجت کیا جا چکا تھا، لہٰذا ان کے لیے اب رعایت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ان پر اللہ کا جو عذاب آیا اس کی پہلی قسط غزوۂ بدر کی صورت میں ظاہر ہوئی، جہاں ان کے بڑے بڑے سردار کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی مانند پڑے ہوئے تھے۔ جیسے ابو جہل، عقبہ بن ابی معیط، عتبہ بن ربیعہ اور اس کا بھائی وغیرہ۔ پھر انہی میں نضر بن حارث بھی تھا جو پکڑا گیا تھا اور بعد میں حضور ﷺ نے اسے قتل کرایا تھا۔ پھر مختلف غزوات میں بہت سے صنادید مشرکین بتدریج اس دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں مقتول ہو کر واصلِ جہنم ہوتے رہے۔ سورۃ التوبہ کی اِن ابتدائی چھ آیات میں درحقیقت عرب سے شرک کے مکمل خاتمہ اور قلع قمع (mopping up operation) کا اعلانِ عام ہے اور یہ بات کھول کر بتا دی گئی کہ اب اہلِ عرب میں سے مشرکین کے لیے کوئی رعایت نہیں ہو گی، اب ان سے کوئی نئی صلح نہیں ہو گی۔ صلح کے جو معاہدے پہلے ہو چکے ہیں، ان میں سے کسی کی بھی مدّت ختم ہو جانے کے بعد آئندہ تجدید نہیں ہو گی۔ کسی نے صلح توڑ دی، معاہدہ کی خلاف ورزی کی تو وہ اسی وقت ختم اور کالعدم ہو جائے گا۔ پھر یہ کہ چار مہینے گزرنے کے بعد پورے عرب میں مشرکین کا قتلِ عام شروع ہو جائے گا، کسی کی کوئی رُو رعایت نہیں کی جائے گی، کسی کی جاں بخشی نہیں کی

جائے گی، سوائے اس کے جو ایمان لے آئے۔ اسے اپنے ایمان کا اقرار و اعلان اور ارکان اسلام پہ عمل کرنا ہوگا۔ جو بھی ان شرائط کو پورا کر دے گا اس کا راستہ چھوڑ دیا جائے گا، اُس کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ رہا یہ معاملہ کہ ان کے دلوں میں ایمان داخل ہوا یا نہیں، اس کا فیصلہ اللہ کرے گا۔ کیونکہ دلوں کا حال وہی جانتا ہے کہ وہ ''عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ '' ہے۔ پس مشرکین مکہ کی جاں بخشی کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں تھی کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ چنانچہ اسی مضمون پر مشتمل رسول اللہ ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَیُقِیْمُوا الصَّلَاةَ وَیُؤْتُوا الزَّکَاةَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّی دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَا لَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ))

''مجھے (اللہ کی طرف سے) یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ پس جب وہ یہ (کام) کریں گے تو وہ مجھ سے اپنے خون اور اپنے اموال بچالیں گے، سوائے اس کے کہ کوئی اسلام کے قانون کی زد میں آ جائے (باقی رہا) ان کا حساب تو وہ اللہ کے ذمے ہے۔''

ان چار مہینوں کے اختتام پر مشرکین عرب میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اسلام نہ لے آیا ہو۔ گنتی کے چار افراد کے بارے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ آخر وقت تک کفر پر قائم رہے، لیکن ایسے لوگ معین وقت ختم ہونے سے پہلے ہی سرزمینِ عرب کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ چنانچہ کوئی حبشہ چلا گیا اور کسی نے شام یا مصر میں پناہ لی —— بہرحال خونریزی کا مرحلہ نہیں آیا۔ لیکن اصل میں اس اعلان کی حیثیت جزیرہ نمائے عرب سے کفر و شرک کے استیصال کی ہے کہ اگر اہلِ عرب بنی اسمٰعیل میں سے کوئی بھی انکار کرتا تو اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جاتی۔

یہ چھ آیات اور نبی اکرم ﷺ کی طرف تفویض کردہ ذمہ داری لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ روانہ ہوگئے اور راستہ ہی میں قافلۂ حج کو جالیا۔ جب وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے سلام و دعا کے بعد دریافت فرمایا: ''اَمِیْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ''، یعنی یہ بات واضح کر دیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو امیر بنا کر بھیجا ہے یا مامور بنا کر؟ —— کسی اسلامی

(۱) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فإنْتابوا واقاموا الصلوۃ......

جماعت میں کسی بھی فرد کے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں' یا تو وہ خود صاحب امر یعنی امیر ہوگا' یا پھر کسی امیر کے تابع (مامور) ہوگا --- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فوراً کہا: مَاْمُوْرٌ --- یعنی میں امیر بن کر نہیں آیا' میں مامور ہی ہوں' اس قافلۂ حج کے امیر آپ ہی ہیں۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ذمہ یہ کام سپرد کیا ہے کہ آپ کی روانگی کے بعد جو چھ آیات نازل ہوئی ہیں ان کا اعلانِ عام حج کے مجمع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندہ کی حیثیت سے کر دوں۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی بحیثیتِ امیر قافلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلان فرما سکتے تھے تو یہ ذمہ داری خصوصیت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیوں کی گئی؟ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں دستور تھا کہ کوئی اہم اور خاص اعلان کسی قبیلہ کے سردار کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی قریب ترین عزیز ہی کیا کرتا تھا جو اسی قبیلہ سے تعلق بھی رکھتا ہو۔ اِسی صورت میں اس اعلان کی اہمیت مسلّم ہوتی تھی۔ اگرچہ رشتہ داری کے اعتبار سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر تھے' لیکن آپ بنو ہاشم میں سے نہیں تھے جبکہ ابھی تک قبائلی نظام بڑی حد تک باقی (Intact) تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ آپ کے قریب ترین عزیز بھی تھے اور قبیلہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے' لہٰذا یہ ذمہ داری اُن کو سونپی گئی۔

انقلابِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے Mopping up Operation کے اِس مرحلے میں ہر نوع کی مزاحمت و رکاوٹ (Resistance) ختم کر کے اور آخری وارننگ دے کر جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل کر دی گئی۔ اس بات کا اشارہ سورۃ المائدہ میں بھی ملتا ہے' جہاں فرمایا گیا:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (المائدہ:۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے۔''

سورۃ المائدہ کی یہ آیت نہایت اہم' عظیم اور مہتم بالشان مطالب و مفاہیم کی حامل ہے۔ یہودی بڑی حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ اگر اس مفہوم کی کوئی آیت ہمیں عطا ہو جاتی تو ہم اس کے یومِ نزول کو اپنی سالانہ عید کے طور پر مناتے۔ اس آیت میں تکمیل دین کا اعلان ہے۔ یعنی نوعِ انسانی کو ایک ایسا مستقل اور بھرپور نظامِ زندگی عطا کر دیا گیا ہے کہ جس میں

قیامت تک کے لیے بنی نوعِ انسان کے جملہ انفرادی واجتماعی گوشوں سے متعلق نہایت معتدل تفصیلی یا اصولی ہدایات موجود ہیں۔ پھر اسی آیت میں اتمامِ نعمت کا اعلان بھی ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ دین مکمل ہوگیا بلکہ نعمت کی تکمیل بھی ہوگئی۔ اور نعمت سے یہاں مراد سلسلۂ وحی اور نبوت ورسالت ہے۔ نبوت ورسالت کا بنیادی مقصد لوگوں تک اللہ کے دین کو پہنچانا اور اپنے قول وفعل سے لوگوں پر حجت قائم کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس یہ کام کرکے دکھایا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دین کو بالفعل غالب فرما کر گویا اتمامِ حجت کا حق ادا کردیا۔ اور اس طرح سلسلۂ نبوت ورسالت بھی اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ اب چونکہ اللہ کا آخری اور مکمل پیغام بنی نوعِ انسان تک پہنچ گیا تھا اور اس آخری وحی کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ نے لے لیا تھا اور دوسری جانب حضور ﷺ کی ذات میں سلسلۂ رسالت بھی اپنے کمال کو پہنچ چکا تھا اور اس میں مزید کسی اضافے (improvement) کی گنجائش نہیں تھی' لہٰذا سلسلۂ وحی اور نبوت ورسالت کو اب ہمیشہ کے لیے منقطع کردیا گیا ——— اس پہلو سے یہ آیت اتمام واختتامِ نبوت ورسالت کی بھی دلیل ہے۔

## بیرونِ عرب دعوتِ اسلام اور سلاطین کا ردِعمل

۷ھ کے اوائل ہی میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز فرمایا۔ آپؐ اپنے دعوتی وتبلیغی نامہ ہائے مبارک دے کر چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قیصرِ روم' کسریٰ ایران' عزیزِ مصر' شاہِ حبشہ اور ان رؤسائے عرب کی طرف بھیجا جو جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں پر آباد تھے اور جنہوں نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ان میں سے بعض قبائل قیصرِ روم کے اور بعض کسریٰ ایران کے باج گزار تھے۔ سیرت کی تمام مستند کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے نامہ ہائے مبارک کی ترسیل سے قبل مسجد نبویؐ میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں حضور ﷺ نے اسی حقیقت کو بیان کیا کہ میری بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام جہان والوں کے لیے رحمت اور رسول بنا کر بھیجا ہے' بفحوائے آیتِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء) میں نے اب تک دعوت تمہیں پیش کی ہے۔ اب اے مسلمانو! تمہارے ذمہ ہے کہ تم اس دعوت اور پیغام کو لے کر تمام اطراف واکنافِ عالم میں پھیل جاؤ اور اللہ کی توحید کو عام کرو۔ گویا نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلہ کا افتتاح

اس خطبہ کے ذریعہ سے فرمایا۔

خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ملوک وسلاطین کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے خطوط تحریر کرائے اور یہ نامہ ہائے مبارک اپنے مختلف اصحاب کے ہاتھ آس پاس کے علاقوں کے حکمرانوں اور سرداروں کو ارسال فرمائے۔ قیصر روم کے دربار میں حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نامۂ مبارک دے کر بھیجے گئے۔ حضرت عبداللہ بن حذیفہ سہمی رضی اللہ عنہ کو خسرو پرویز کسریٰ ایران کی طرف بھیجا گیا۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ عزیز مصر کی طرف بھیجے گئے۔ حضرت عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کو شاہِ حبش نجاشی کی طرف بھیجا۔ حضرت سلیط بن عمر بن شمس رضی اللہ عنہ رؤسائے یمامہ کی طرف بھیجے گئے۔ یمامہ جزیرہ نمائے عرب ہی کا شمال مشرقی علاقہ ہے۔ آج کل یہ علاقہ نجد میں شامل ہے۔ حضرت شجاع بن وہب الاسدی رضی اللہ عنہ حدودِ شام میں حارث غسانی کے پاس بھیجے گئے۔ شام اُس وقت سلطنت روما کے زیرِ حکومت تھا اور وہاں قیصر کی طرف سے غسانی خاندان حکمران تھا۔ ان کے علاوہ بعض دیگر رؤساء وسرداران عرب کو بھی حضور ﷺ نے نامۂ ہائے مبارک ارسال فرمائے۔ اُن میں منذر بن ساوی (حاکم بحرین)، ہوذہ بن علی (حاکم یمامہ)، جیفر (شاہ عمان)، حارث بن ابی شمر غسانی (حاکم دمشق) وغیرہ شامل ہیں۔ ان نامہ ہائے مبارک کے نتیجہ میں سلاطین کی جانب سے مختلف ردعمل سامنے آئے۔ کوئی تو اِن کے جواب میں ایمان لے آیا تو کسی نے کفر کیا، لیکن اتنا ضرور ہوا ہے کہ کفر و انکار کی روش اپنانے والوں کی توجہ بھی اسلام کی طرف مبذول ہوگئی۔

فلسفۂ انقلاب کے حوالے سے یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ حضور ﷺ نے یہ خطوط پہلے ہی دن کیوں نہیں بھیجے؟ دراصل ایک انقلابی تحریک اور ایک تبلیغی تحریک میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تبلیغی تحریک پہلے دن سے ہی زمین پر پھیلتی ہے، بالکل اُسی طرح جیسے خربوزے کی بیل زمین پر پھیلتی چلی جاتی ہے، اوپر نہیں اُٹھتی۔ اُٹھنا اس کی فطرت میں شامل ہی نہیں ہے۔ اس کے برعکس انقلابی تحریک اوپر اُٹھتی ہے۔ یہ آم کے درخت کی طرح ہوتی ہے۔ آم کے درخت پر دو پتیاں لگیں گی تو اوپر کی طرف رُخ ہوگا۔ یہ درخت اپنے بل پر کھڑا ہوتا ہے اور اوپر جا کر پھیلتا ہے۔ یہ سایہ بھی دیتا ہے اور پھل بھی دیتا ہے۔ حضور ﷺ نے ۱۰ برس تک مکے سے باہر قدم نہیں نکالا۔ وہیں کام کیا۔ مبلغین کا کوئی وفد باہر نہیں بھیجا۔ کسی کو کوئی خط نہیں لکھا۔ مدینہ میں آنے کے بعد بھی آپؐ نے عرب کے اندر کوئی تبلیغی جماعت نہیں بھیجی۔ ہاں جب آپؐ کی بات پھیل

گئی اور یہ تقاضا آنے لگا کہ آپؐ اپنا کوئی آدمی بھیجیۓ جو ہمیں بتائے کہ آپؐ کا دین کیا ہے' تب آپؐ اصحاب صفہ میں سے کسی کو بھیجتے تھے۔ دیکھئے' ایک مشنری ورک ہے' جیسے عیسائی مشنری کام کرتے ہیں۔ یہ کام تبلیغی انداز میں ہوتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس انقلابی تحریک کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ یہ اوپر اُٹھتی ہے۔ یہ پہلے ایک خطے میں انقلاب برپا کرتی ہے اور پھر اس انقلاب کی تصدیر ہوتی ہے۔ جیسے کمیونسٹوں نے پہلے روس میں انقلاب برپا کیا۔ پھر یہ مشرقی یورپ میں آ گیا۔ لاطینی امریکہ چلا گیا۔ یہی چیز حضور ﷺ کے طریقہ انقلاب میں تھی۔ جب آپؐ نے عرب میں ایک طرح سے انقلاب کی تکمیل فرمادی تو اب آپؐ نے بیرون عرب دعوتی خطوط بھیجے۔

حضور ﷺ نے جن رؤساء عرب کے نام نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے تھے اور جو عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں آباد تھے' ان میں غسان کا قبیلہ تعداد میں بھی بڑا تھا اور کافی طاقتور بھی تھا۔ اس قبیلہ کے لوگ اگرچہ عرب تھے' لیکن ایک مدت سے عیسائی تھے۔ یہ قبیلہ قیصر روم کے ماتحت اور اس کا باج گزار تھا۔ اس وقت قبیلہ کا رئیس وحکمران شُرَحْبیل بن عمرو نامی شخص تھا۔ اس کے پاس حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ بطورِ قاصد حضور ﷺ کا نامہ مبارک لے کر گئے تھے۔ اس بدبخت نے حضور ﷺ کے قاصد کو شہید کر دیا۔ حضور ﷺ نے انؓ کے خون کے قصاص کے لیے تین ہزار کا لشکر تیار کر کے جمادی الاولیٰ ۸ ھ میں شام کی طرف بھیجا۔ اس لشکر کا سپہ سالار حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا اور پہلے ہی سے معین کر دیا کہ اگر وہ شہید ہو جائیں تو حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سپہ سالار ہوں گے۔ اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو پھر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار ہوں گے۔

اِدھر مدینہ میں مسلمانوں کا لشکر ترتیب پا رہا تھا اور اُدھر جاسوسوں نے شُرَحبیل کو خبر کر دی۔ چنانچہ شُرَحبیل نے اس لشکر کا مقابلہ کے لیے قریباً ایک لاکھ کی فوج تیار کی' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ معاملہ قصاص اور انتقام کا ہے' لہٰذا جنگ ضرور ہوگی۔ پھر خود قیصر روم (ہرقل) ایک بہت بڑی فوج لے کر غسانیوں کے دارالحکومت بصرہ سے چند میل کے فاصلہ پر آ کر بیٹھ گیا' تاکہ اگر غسانی شکست کھائیں تو وہ ان کی مدد کے لیے اپنی فوج لے کر پہنچ جائے۔ اہل ایمان کے لشکر کو جب غسانیوں کی تیاری اور اس کی پشت پر ہرقل کی فوج کی موجودگی کا علم ہوا تو مشورہ ہوا کہ ان حالات میں کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ کہاں صرف تین ہزار اور کہاں ایک لاکھ! یہ

ایک اور تینتیس کی نسبت تھی۔ مشورہ ہوا کہ آیا اندریں حالات مقابلہ کا خطرہ (risk) مول لینا چاہیے یا حضورﷺ کو اطلاع دی جائے اور توقف کر کے آپؐ کے حکم کا انتظار کیا جائے۔ امیر لشکر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہی تھی کہ ہمیں سردست مقابلہ نہیں کرنا چاہیے اور حضورﷺ کے حکم کا انتظار کرنا چاہیے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ اُٹھے اور انہوں نے تقریر کی کہ مسلمانو! ہم دنیا کے طالب ہو کر نہیں نکلے، فتح اور شکست سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، ہم تو شہادت کے متمنی ہیں، اللہ نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا ہے تو ہم تاخیر کیوں کریں؟ اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ فیصلہ ہو گیا کہ مقابلہ کیا جائے گا — چنانچہ تصادم ہو گیا۔ اب کہاں تین ہزار کہاں ایک لاکھ! لیکن جوشِ ایمانی اور شوقِ شہادت سے سرشار یہ مختصر سا لشکر ایک لاکھ کی فوج پر حملہ آور ہوا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو ان کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے علَم سنبھالا اور لشکر ان کی قیادت میں آیا تو گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کی ٹانگوں پر تلوار ماری اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں، تاکہ گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہونے کا خیال بھی دل میں نہ آئے۔ پھر نہایت بے جگری سے دشمنوں کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ ایک ہاتھ قلم ہوا تو دوسرے ہاتھ میں علَم تھام لیا۔ وہ بھی قلم ہوا تو باقی ماندہ بازوؤں سے جھنڈا آغوش میں لے لیا، تاکہ علَم ان کے جیتے جی زمین پر گرنے نہ پائے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ زخموں سے چور چور ہو کر زمین پر گرے اور جامِ شہادت نوش کر گئے۔

اُدھر رسول اللہﷺ نے خواب دیکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا کہ جعفر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے کٹے ہوئے دو بازوؤں کی جگہ دو پر عطا فرما دیے ہیں، جن سے وہ جنت میں اُڑتے پھر رہے ہیں۔ اسی وقت سے آپ کا لقب ''طیار'' قرار پایا اور وہ جعفر طیار کے نام سے موسوم ہوئے۔ ان کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ جناب رسول اللہﷺ نے ان تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو یکے بعد دیگرے سپہ سالار نامزد کیا تھا، لیکن مزید کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ چنانچہ جب وہ تینوں شہید ہو گئے تو اب مسلمانوں کے لشکر میں سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر کمان سنبھالی اور نہایت بہادری اور بے جگری سے لڑے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اس جنگ میں ان کے ہاتھ سے آٹھ تلواریں ٹوٹ ٹوٹ کر گریں۔ لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا مقابلہ تھا۔ اس نازک صورت حال سے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے

حکمت عملی تبدیل کی کہ ایک جنگی چال کے ذریعے رومیوں کو مرعوب کر کے اتنی کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کو پیچھے ہٹا لیا کہ رومیوں کو تعاقب کی ہمت نہ ہوئی۔

# غزوۂ تبوک: اہل ایمان کا سخت ترین امتحان

جنگ موتہ کے معرکے نے غسانیوں اور رومیوں کو ہلا کر رکھ دیا اور ان کو خوف لاحق ہو گیا کہ مسلمان چین سے بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ وہ یقیناً دوبارہ حملہ کریں گے۔ چنانچہ ایک طرف غسانیوں نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں' دوسری طرف انہوں نے قیصر روم کو لکھا کہ اس اُبھرتی ہوئی طاقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے' امسال پورا عرب قحط میں مبتلا ہے' لہٰذا یہ بہترین موقع ہے کہ مسلمانوں کو کچل دیا جائے۔

نبی اکرم ﷺ کو بھی یہ خبریں برابر مل رہی تھیں۔ چنانچہ آپؐ نے بھی فوج کی تیاری کا حکم دے دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حضور ﷺ کی طرف سے نفیر عام ہوئی۔ یعنی ہر مسلمان جس کو کوئی عذر شرعی لاحق نہ ہو' اس کا اس غزوہ کے لیے نکلنا اور فوج میں شامل ہونا لازم قرار دے دیا گیا۔ اس سے قبل یہ ہوتا تھا کہ جب بھی کہیں کوئی مہم بھیجنی ہوتی تھی' نبی اکرم ﷺ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرماتے اور مہم کے لیے مطلوبہ تعداد کے مطابق یا خود انتخاب فرماتے یا اُن اصحاب کو شامل فرما لیتے جو خود کو اس مہم کے لیے پیش کرتے۔ لیکن اس مرتبہ صورت حال مختلف تھی۔ لہٰذا نفیر عام ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں تیس ہزار کی فوج تیار ہو گئی اور آپؐ اس لشکر کو لے کر تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔

غزوۂ تبوک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے نہایت سخت امتحان کا موقع تھا۔ اس لیے کہ اب ٹکراؤ وقت کی دو عظیم ترین طاقتوں میں سے ایک طاقت یعنی سلطنت روما سے درپیش تھا۔ اب بات عربوں کی باہمی جنگ کی نہیں تھی جہاں ایک اور تین چار یا ایک اور دس یا بیس کی نسبت ہو۔ سلطنتِ روما کے پاس لاکھوں کی تعداد میں ہر وقت باقاعدہ فوجیں تیار رہتی تھیں' جو اُس دور کے اعتبار سے اعلیٰ ترین ہتھیاروں سے لیس تھیں۔ غسانیوں نے لاکھوں کا لشکر تیار کر رکھا تھا' جس کی پشت پر خود ہرقل قیصر روم اپنی کثیر فوج کے ساتھ شام میں موجود تھا اور وہ کسی طرح بھی اپنے ان مقبوضات سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک طرف یہ صورت حال تھی' دوسری طرف عالم یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتنا سخت امتحان لیا کہ ہر

مسلمان کا جنگ کے لیے نکلنا لازم قرار دیا' اِلاّ یہ کہ وہ ضعیف یا بیمار ہو۔ اس پر مستزاد قحط کا عالم اور شدید گرمی کا موسم تھا جس کی بنا پر لوگوں پر ویسے بھی گھر سے نکلنا شاق گزرتا تھا۔ ان حالات میں طویل سفر گویا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر منافقین کا پردہ چاک ہو گیا۔ وہ خود بھی جنگ کے لیے نکلنے سے جی چراتے تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ ﴿لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ﴾ ''گرمی میں نہ نکلو''۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ کھجوروں کی فصل تیار تھی اور یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اگر اب چلے گئے تو یہ کھجوریں درختوں ہی پر گل سڑ کر ختم ہو جائیں گی۔ انہیں کون اتارے گا۔ پہلے ہی کھانے کے لالے پڑے ہیں' یہ فصل بھی اگر برباد ہوگئی تو پھر کیا ہوگا؟ اِن سب پر مستزاد یہ کہ طویل ترین سفر اور سلطنت روما سے ٹکراؤ کا مرحلہ درپیش تھا' لہٰذا ساز و سامان بھی کافی درکار تھا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ترغیب دے رہے تھے کہ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ مالی انفاق بھی کرو۔

نبی اکرم ﷺ کی اس ترغیب کے نتیجہ میں پرستارانِ حق نے ساز و سامان کی فراہمی میں اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آسودہ حال تھے اُنہوں نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ یہی وہ موقع ہے جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا نصف ساز و سامان اور اثاثہ جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا سارے کا سارا اثاثہ نذر کر دیا اور گھر میں جھاڑو پھیر دی۔ غریب صحابہ رضی اللہ عنہم نے محنت مزدوری کر کے جو کچھ کمایا' لا کر حاضر کر دیا۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے رات بھر ایک باغ میں پانی سینچا اور اس کے معاوضہ میں انہیں جو کھجوریں ملیں وہ لا کر خدمتِ اقدس میں پیش کر دیں۔ عورتوں نے اپنے زیور اُتار کر دے دیئے۔ الغرض تمام اہل ایمان میں جوش جہاد کی لہر دوڑ گئی۔

یہ نفیر عام اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب منافقوں کے لیے کسوٹی بن گئی۔ اس موقع پر پیچھے رہ جانے اور انفاق سے ہاتھ روکنے کے معنی یہ تھے کہ ایسے شخص کا اسلام کے ساتھ تعلق مشتبہ ہو جاتا۔ چنانچہ منافقین کے لیے یہ موقع ان کے نفاق کا پردہ چاک کرنے کا سبب بن گیا۔ دوسری طرف بعض ایسے اہل ایمان بھی تھے جو سواریوں کی کمی اور سامان کی قلت کی وجہ سے باوجود شدید خواہش کے تبوک کے سفر پر جانے سے معذور تھے۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں رو رو کر کہتے کہ اگر آپ ہمیں بھی لے چلیں تو ہماری جانیں قربان ہونے کے لیے حاضر ہیں۔ ان مخلصین کی بے تابیوں کو دیکھ کر حضور ﷺ کا دل بھر آتا تھا۔

رجب ۹ ہجری میں نبی اکرم ﷺ نے تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے شام کی طرف کوچ فرمایا اور تبوک کے مقام پر قیام فرمایا' جو شام اور جزیرہ نمائے عرب کا سرحدی مقام ہے۔ اس سفر میں دس ہزار گھڑ سوار آپ کے ہمراہ تھے۔ اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ دوسری جانب غسانیوں نے لاکھوں کی فوج تیار کر رکھی تھی اور قیصر نے چالیس ہزار رومی سپاہ ان کی مدد کے لیے بھیج رکھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک لشکر جرار کے ساتھ غسانیوں کی مدد کے لیے حمص میں موجود تھا۔

جب قیصر کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا جو لشکر مدینہ سے آ رہا ہے اور اس کی قیادت خود جناب محمد رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں تو اس نے غسانیوں اور رومی فوجوں کو حکم بھیجا کہ سرحد سے تمام فوجیں واپس چلی آئیں۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ حضور ﷺ اللہ کے رسولؐ ہیں اور یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ سے مقابلے کا نتیجہ شرمناک شکست کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا۔ پھر جنگ موتہ میں ایک جانب تین ہزار اور دوسری جانب ایک لاکھ فوج کے مقابلہ کی جو کیفیت اس کے علم میں تھی' اس کے بعد اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ تیس ہزار فدائین کے اس لشکر سے مقابلہ کرے جس کی کمان خود نبی اکرم ﷺ فرما رہے تھے۔ حالانکہ اُس وقت اس کے پاس غسانیوں اور رومیوں کی دو لاکھ سے بھی زیادہ فوج موجود تھی۔ چنانچہ وہ طرح دے گیا اور اس نے سرحد سے تمام فوجیں واپس ہٹا کر مسلح تصادم کا ہر امکان روک دیا۔

نبی اکرم ﷺ نے اس مرحلہ پر قیصر کے اعراض اور پسپائی کو کافی سمجھا اور از خود تبوک سے آگے بڑھ کر شام کی سرحد میں داخل ہونے کی بجائے اس بات کو ترجیح دی کہ اس طرح لشکر اسلام کو جو اخلاقی اور نفسیاتی فتح حاصل ہوئی تھی' اس سے زیادہ سے زیادہ سیاسی اور جنگی فوائد حاصل کیے جائیں۔ حضور ﷺ وہاں بیس دن تک مقیم رہے' تاکہ اگر قیصر مقابلہ میں آتا ہے تو آئے — اس عرصہ کے دوران آپؐ نے سرحدی قبائل کے رئیسوں اور سرداروں سے معاہدے کیے اور اس طرح اس علاقے میں اپنی پوزیشن مضبوط بنالی۔ گویا ہجرت کے بعد غزوۂ بدر سے قبل حضور ﷺ نے قریش کے خلاف جو راست اقدام (active resistance) کیا اور قریش کی سیاسی ناکہ بندی (political isolation) کی' وہی کام حضور ﷺ نے تبوک کے بیس روزہ قیام کے دوران انجام دیا۔ اس کے بعد آپؐ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

۱۰ ہجری میں نبی اکرم ﷺ نے فریضہ حج ادا فرمایا۔ اس موقع پر آپؐ نے سوا لاکھ صحابہؓ کے

مجمع میں یہ گواہی لے لی کہ میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچا دیا یا نہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تین مرتبہ یہ اقرار و اعلان کیا کہ آپؐ نے حق تبلیغ، حق نصیحت اور حق امانت ادا کر دیا۔ اِسی موقع پر آپؐ نے اپنا مشن اُمت کے حوالے کیا اور فرمایا ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الغَائِبَ)) ''جو یہاں موجود ہیں وہ (اِس دین کو) اُن لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔'' آپؐ کے اِس ارشادِ گرامی میں یہ بات از خود مضمر ہے کہ میں نے جزیرۂ نمائے عرب کی حد تک اسلام کو غالب کر دیا۔ اب اسلامی انقلاب کی عالمی سطح پر تکمیل تمہاری ذمہ داری ہے۔[1]

الغرض یہ ہیں سیرت کے وہ اہم واقعات (یعنی سلاطین و رؤساء کو نامہ ہائے مبارکہ کی ترسیل، جنگ موتہ اور غزوۂ تبوک) جن سے انقلابِ محمدیؐ کی بین الاقوامی تصدیر (export) کے کام کا آغاز ہوا۔

# قیامِ خلافت کے ضمن میں غور طلب سوال!

جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر اب اطراف و اکنافِ عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی دعوت پہنچانے اور توحید کا علَم کرۂ ارضی پر بلند کرنے کا جو کام اُمت کے سپرد تھا، اُس کا راستہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس کھول دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپؐ کا انتقال ہو گیا اس وقت جیشِ اسامہ تیار کھڑا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ خلافت راشدہ کا دور آیا، تو اللہ کا یہ دین اس قدر پھیلا کہ دریائے جیحوں سے لے کر atlantic ocean تک پہنچ گیا۔ مگر پھر عبداللہ بن سبا یہودی نے ایک بڑا فتنہ برپا کیا تھا، جس کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سارا دورِ خلافت خانہ جنگی میں گزر گیا۔ ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں اور تیروں سے ختم ہو گئے۔ اِس خوفناک فتنہ کے نتیجے میں فتوحات کا وہ سلسلہ ٹوٹ گیا اور زوال کا آغاز ہو گیا۔ اگرچہ مسلمانوں کا عروج تو باقی رہا، مگر خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد سے اسلام کا بتدریج زوال شروع ہو گیا۔ یہ زوال اپنی انتہا کو اب پہنچا ہے، جبکہ پوری دنیا میں زمین کے ایک انچ پر بھی اللہ کا دین قائم نہیں ہے۔ اس وقت دنیا میں مسلمان ۵۶ء۱ بلین یعنی ایک ارب ۵۶ کروڑ ہیں۔ اور وہ ''مذہب'' اسلام کے ساتھ وابستہ بھی ہیں۔ چنانچہ ہر سال تیس تیس لاکھ مسلمان حج کرتے ہیں۔ رمضان میں تیس تیس لاکھ عمرے ہوتے ہیں۔ مگر دین نام کی شے کہیں

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منیٰ۔

موجود نہیں۔ایک انچ زمین پر بھی ہم نے اسلام قائم نہیں کیا۔ یہ کیا ہے؟ یہ اسلام کا زوال ہے۔

تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو اس سے پہلے مسلمانوں پر دو عروج اور دو ہی زوال کے ادوار آئے ہیں۔ مسلمانوں پر پہلا دورِ عروج عربوں کے زیر قیادت آیا' جب سلطنت عباسیہ قائم ہوئی۔ یہ دنیا کی عظیم ترین سلطنت تھی' لیکن یہ خلافت نہیں تھی' ملوکیت تھی۔ پھر ان کا زوال ہوا ہے۔ مسلمانوں کی پٹائی پہلے صلیبیوں کے ہاتھوں' اور پھر تاتاریوں کے ہاتھوں ہوئی۔ ۸۵ لاکھ مسلمان تاتاریوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ پورا خراسان' پورا ایران اور آدھا عراق تہس نہس کر دیا گیا۔

مسلمانوں پر دوسرا دورِ عروج ترکوں کی قیادت میں آیا۔ ہندوستان میں جنہیں ہم مغل کہتے ہیں' یہ ترک ہیں' اور ترکان تیموری کہلاتے ہیں۔ اسی طرح ایران میں ترکان صفوی' مڈل ایسٹ میں ترکان سلجوقی اور ترکی میں ترکان عثمانی حکمران رہے۔ اس دور میں مغربی ایشیا' پورا شمالی افریقہ اور مشرقی یورپ کا بڑا رقبہ عظیم سلطنت عثمانیہ کے زیر نگین آ گیا تھا۔ خلافت چار سو (۴۰۰) سال ان ترکوں کے پاس رہی۔ پھر ان پر بھی زوال آیا۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں خلافت ختم اور سلطنت عثمانیہ تحلیل ہوگئی۔ اس کے تحت تمام ممالک بکھر گئے' بلکہ بلقنائزیشن ہوگئی۔ بالٹک ریاستیں ساری کی ساری ترکوں کے پاس تھیں۔ کوسوو' چیچنیا' بوسنیا اور البانیہ یہ سب علاقے ترکوں کے پاس تھے۔ یہاں ترکوں کی حکومت تھی۔ جب زوال آیا تو یہ علاقے بتدریج ترکوں کے ہاتھوں سے نکلتے چلے گئے۔

اب ایک مرتبہ پھر تاریخ مسلمانوں کے ایک اور دورِ عروج کی منتظر ہے۔ اب مسلمانوں اور اسلام دونوں کی اُٹھان ہونے والی ہے۔ اُمت پر ایک دفعہ زوال کے بعد عروج آیا اور پھر دوسری مرتبہ زوال کے بعد عروج آیا۔ پھر زوال آیا۔ اب ایک مرتبہ پھر اُس پر عروج آنے والا ہے۔ گویا اب جو اُٹھان ہوگی وہ اُمت کی نشاۃِ ثالثہ اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہوگی۔ دین زوال کے بعد آج تک جہاں پہنچا ہے' ایک مرتبہ پھر دنیا میں غالب ہوگا۔

خلافت کا دوبارہ اُبھرنا یقینی ہے۔ اِس کی خبریں صادق المصدوق ﷺ نے دی ہیں۔ مگر ہمارے لیے غور طلب سوال یہ ہے کہ خلافت کیسے آئے گی۔ ہمیں اِس امر سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ خلافت محنت و مشقت سے آئے گی' جدوجہد اور کوشش سے آئے گی' جان و مال کی قربانیوں سے آئے گی۔ یہ کام نہ محض دُعائیں کرنے سے ہوجائے گا' نہ محض تبلیغ کرنے سے

ہوگا' اور نہ ہی محض علمی کام کرنے سے ہوگا۔ خلافت کے اس طریق سے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح نظام خلافت الیکشن کے ذریعے بھی نہیں آئے گا۔ اگر ہم اسلامی خلافت کے قیام میں سنجیدہ ہیں تو اس کے لیے ہمیں اُس طریق کار کو اپنانا ہوگا جو نبی اکرم ﷺ چھوڑ گئے۔ ہمیں طریق انقلاب سیرت نبویؐ سے لینا ہوگا۔ نبویؐ طریق انقلاب کیا ہے' اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اسی کو میں نے اپنی کتاب ''منہج انقلاب نبویؐ'' میں اور بھی تفصیل سے واضح کیا ہے' اس کا مطالعہ کیجیے' تاکہ معلوم ہو سکے وہ فلسفہ کیا تھا؟ آپؐ نے جنگوں کا آغاز کیوں کیا؟ اِس سے آپؐ کے پیش نظر کیا بات تھی۔ ہمارے ہاں اسلام کے غلبہ کے لیے جذبے کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ذہنوں میں طریق کار واضح ہو اور اُس کو اختیار کیا جائے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ کفر عالم اسلام پر یلغار کر رہا ہے۔ وہ اسلام کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آ گیا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

ہمارا کام یہ ہے کہ اسلام کے غلبہ و اقامت کے لیے کمر کسیں' اس مشن کو لے کر آگے سے آگے بڑھیں' اور اس کے لیے سیرت محمد ﷺ سے طریق کار اخذ کریں۔ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اسلام اُس راستے سے بھی نہیں آئے گا جو اِس وقت مجاہدین نے اپنا رکھا ہے کہ جماعت بنی نہیں' تربیت ہوئی نہیں' اور فوج کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ یہ انقلاب کا صحیح راستہ نہیں۔ ہاں یہ کہا جائے گا کہ یہ اُس ظلم کا ردعمل ہے جو امریکہ ڈھا رہا ہے۔ امریکی بے قصور لوگوں کو مارتے ہیں۔ اُن کے ڈرون حملوں میں آئے روز بے گناہ لوگ مرتے ہیں۔ امریکہ نے باجوڑ میں ایک مدرسے پر میزائل مارا جس سے ۸۰ بچے شہید ہو گئے تھے۔ آخر اُن معصوم اور بے گناہ بچوں کے کوئی چچا' بھائی' باپ' رشتہ دار ہیں یا نہیں۔ اور کیا ان لوگوں میں غصہ اور انتقام کے شعلے نہیں بھڑکیں گے' اور وہ پاکستانی فوج کے خلاف نہیں لڑیں گے۔ ظاہر ہے' انہوں نے تو فوج کے خلاف لڑنا ہے اور یہی کہنا ہے کہ تم تو امریکہ کے کرائے کے فوجی ہو' تم نے امریکہ کی جنگ کو افغانستان سے اُٹھا کر پاکستان میں داخل کر لیا۔ اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نام نہاد

دہشت گردی کے خلاف جنگ امریکہ کی جنگ ہے' یہ ہماری جنگ ہرگز نہیں ہے۔ اگر یہ ہماری جنگ ہوتی تو اِس میں ہم دوسروں سے مدد مانگتے' جبکہ یہاں صورت یہ ہے کہ مدد ہم نے نہیں' امریکہ نے ہم سے مانگی۔ اگر یہ اُن کی جنگ نہ ہوتی تو بُش اور پاول ہم سے کبھی مدد نہ مانگتے۔ وہ ہمیں کبھی یہ دھمکی نہ دیتے کہ "You are with us or against us." بہرحال یہ حالات خطرناک اور بہت ہی خطرناک ہیں۔ لیکن جب تک سانس تب تک آس۔ ہمیں تو بہرصورت امید کا دامن تھامے رکھنا ہے۔ ہمیں غلبۂ اسلام کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دینی ہے اور یہ طے کرنا ہے کہ ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانعام) ''بے شک میری نماز' میری قربانی' میرا جینا مرنا اللہ کے (دین کے) لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

اسلام کے غلبہ واقامت کا یہ عظیم کام اکیلا فرد انجام نہیں دے سکتا' یہ کام جماعت سے ہوگا۔ اس مقصد کے لیے مختلف دینی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ ہم نے بھی اسی غرض سے تنظیم اسلامی قائم کی ہے۔ آپ سے اپیل ہے کہ اس کام میں ہمارے دست و بازو بنئے' ہمارے ساتھی بنئے۔ ہمارے ساتھ مل کر کام کیجئے۔ یہ تنظیم ہمارا base ہے۔ اگر یہ وسیع ہوگا تو پھر ہم اقدام کے مرحلے میں داخل ہوں گے ان شاء اللہ۔ تنظیم اسلامی غلبۂ دین یا بالفاظ دیگر اسلامی انقلاب کے لیے اُسی منہج پر عمل پیرا ہے جو سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ہمارے سامنے آتا ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو سیرت طیبہ کی کرنوں سے منور فرمائے اور دین حق کے غلبہ کی راہ میں اپنا تن من دھن لگانے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ (آمین)

بارك الله لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

مرکزی **انجمن خدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

**منبعِ ایمان** ــــ اور ــــ **سرچشمۂ یقین**

# قرآنِ حکیم

کے **علم و حِکمت** کی

وسیع پیمانے ــــ اور ــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

**اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ــ اور ــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

**وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ**